کوئی شہر ایسا بساؤں میں

نگہت سیما

کوئی شہر ایسا بساؤں میں

نکہت سیما

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون:37232336-37352332

انتساب!

کارگل کے شہیدوں

کے نام!

کوئی شہر ایسا بساؤں میں

سیمل نے نظروں سے اوجھل ہوتے پوائنٹ کو دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے اِردگرد نظر دوڑائی۔ وہ اسٹاپ پر تنہا کھڑی تھی۔ چادر کے پلو سے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پھر اپنے اطراف نظر دوڑائی۔ سڑک دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ اسٹاپ خالی تھا لیکن دائیں طرف درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑے دو لڑکے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تنگ جینز اور دھاری دار شرٹس میں ملبوس یہ لڑکے اسٹوڈنٹ تو ہرگز نہیں لگ رہے تھے۔ ایک لڑکا بڑے لوفرانہ انداز میں سگریٹ پیتے ہوئے دھویں کے مرغولے بنا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر فوراً نظریں ان پر سے ہٹالیں اور سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں خوف اُتر آیا تھا۔

ایک تو آج حمنہ بھی نہیں آئی تھی، دوسرے لائبریری میں ناول پڑھتے ہوئے اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا اور آخری پوائنٹ بھی نکل گیا تھا اور اب خوف سے اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی، ہر وقت ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی رہنے والی۔ یونیورسٹی میں پڑھنے کے باوجود اس میں خود اعتمادی کی بے حد کمی تھی، اگر جو حمنہ کے اس کے ساتھ نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی بھی یونیورسٹی میں پڑھنے کی ہمت نہ کر پاتی بلکہ اس نے تو گریجوایشن کے بعد تعلیم کو اپنی طرف سے خیر باد کہہ دیا تھا۔ یہ تو حمنہ تھی جو اسے گھسیٹ کر یونیورسٹی لے آئی تھی۔

دور سڑک سے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی جو اسٹاپ کے قریب آ کر آہستہ ہوئی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔

''کدھر جانا ہے؟''

اس کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔

"ٹیکسی میں اکیلے کبھی نہ بیٹھنا، کبھی تنہا آنا پڑے تو بس اور ویگن سے ہی آنا بلکہ رکشے میں بھی اکیلے مت بیٹھنا"۔ اماں نے سیکڑوں بار ہی تو اسے منع کیا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دائیں طرف دیکھا۔ سگریٹ پینے والے لڑکے نے سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے تلے مسلا اور دونوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اب وہ شاید اسی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ بالکل ناک کی سیدھ میں سامنے دیکھ رہی تھی لیکن پسینہ ایک بار پھر اس کے مساموں سے پھوٹ پڑا تھا اور اس نے اپنی ٹانگوں میں واضح لرزش محسوس کی تھی۔ ایک رکشا شور مچاتا ہوا سڑک پر سے گزر گیا۔ رکشے کے پیچھے کہیں سے ایک تانگا بھی آ رہا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اس کے کانوں میں بہت زور سے آ رہی تھی۔ تانگا اسٹاپ پر رُکے بغیر گزر گیا۔ اس میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ افراد بھرے ہوئے تھے۔ تانگا جا چکا تھا اور روڈ کراس کر کے دو لڑکیاں اسی طرف آ رہی تھیں۔ لڑکیوں کو دیکھ کر اس کی ہمت تھوڑی بحال ہوئی تھی۔ دوپٹے گلے میں ڈالے کندھوں پر شولڈر بیگ لٹکائے بڑے اعتماد سے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے وہ سڑک کراس کر کے اس کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔ وہ اس سے بے نیاز ایک دوسرے سے باتوں میں مگن تھیں۔ ان کا موضوعِ گفتگو ان کا باس تھا جو کسی فلمی ہیرو کی طرح تھا لیکن وہ اپنی ورکر لڑکیوں کو ذرا بھی لفٹ نہیں کرواتا تھا اور ذرا سی غلطی پر بے عزتی کر کے رکھ دیتا تھا۔

"کاش زندگی کوئی افسانہ یا ڈراما ہوتی"۔ ایک لڑکی نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"اور اس افسانے میں باس آپ پر دل و جان سے فدا ہو جاتے"۔ دوسری لڑکی نے تبصرہ کیا۔

اس سے پہلے کہ پہلی لڑکی کوئی جواب دیتی، پھٹ پھٹ کرتا ہوا رکشا آیا اور دونوں لڑکیاں اس میں سوار ہو کر چل دیں۔ لڑکیوں کی باتوں میں کھو کر کچھ دیر کے لیے وہ اِرد گرد کے ماحول سے غافل ہو گئی تھی۔ لڑکے پھر درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں انہیں دیکھا، ایک بار پھر وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کی طرف آ رہے تھے۔ قلفی بیچنے والا ایک لڑکا کہیں سے آ کر بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنا تھرموس اپنے پاؤں کے پاس رکھا تھا اور اب کندھے پر پڑے رومال سے اپنا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کی نظریں لڑکے کے پاؤں پر تھیں۔ مٹی اور دھول سے اَٹے پاؤں میں ایک ہوائی چپل تھی جس کے دائیں پیر میں ایک طرف چمڑے کا ننھا سا ٹکڑا تھا۔ گویا چپل کو موچی سے مرمت کروایا گیا تھا۔ لڑکے کے

آنے سے شاید اسے ڈھارس ملی تھی کہ ایک بار پھر وہ اِرد گرد سے بے خبر ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں کبھی لڑکے کے تھکے ہوئے چہرے کی طرف اُٹھتیں اور کبھی اس کے ہوائی چپل میں قید پاؤں کی طرف اور اماں کی آواز ایک بار پھر اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

"سیمل چندا ناشکری نہ کیا کر...... ناراض مت ہوا کر اللہ سے۔ وہ تو بڑا مہربان ہے۔ میری جان جس نے تمہیں چھت دی ہے، باپ اور بھائی کا سائبان دیا ہے، یہ محفوظ چار دیواری دی ہے۔ تمہیں سب کچھ بن مانگے مل جاتا ہے، کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑتا۔ مشقت نہیں کرنا پڑتی۔ وہ بھی تو ہیں میری جان جنہیں دو وقت پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہوتی"۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے"۔ پتا نہیں کتنے سالوں بعد یہاں اس سڑک پر کھڑے کھڑے اس نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا ورنہ اسے تو اللہ سے بے حد بے حساب شکوے تھے۔

اور یہ لڑکا بے چارہ کتنی عمر ہو گی اس کی، حد سے حد گیارہ سال اور اس تپتی دوپہر میں یہ قلفیاں بیچ کر پیٹ کے رزق کا بندوبست کر رہا ہے اور پتا نہیں یہ اتنا کما بھی لیتا ہو گا کہ اس کا اور اس کے خاندان والوں کا پیٹ بھر سکے اور دوسری ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

"تمہاری قلفیاں بک گئیں ساری......؟"

"نہیں، آپ لیں گی"۔ اس کی آنکھوں میں یک دم چمک پیدا ہوئی تھی۔

"نہیں"۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ لڑکا یک دم اس سے بے نیاز ہو کر اپنے رومال سے اپنا تھرماس صاف کرنے لگا تو اسے افسوس ہوا کہ کم از کم وہ اس سے ایک قلفی تو خرید ہی لیتی بھلے نہ کھاتی۔ وہ اتنا مایوس نہ ہوتا لیکن اس کا ارادہ تو محض اس سے باتیں کرنے کا تھا۔ وہ اس سے اس کی اس محنت مشقت کے متعلق اور اس کی فیملی کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی۔ لڑکا جیسے اس کے قلفی نہ خریدنے پر ناراض سا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے دائیں کندھے پر لٹکا شولڈر بیگ کندھے سے اُتارا اور اس کی زپ کھول کر کاغذات کے انبار سے دس روپے کا نوٹ تلاش کر کے سر اونچا کیا تو لڑکا تھرماس اُٹھائے سڑک کراس کر رہا تھا اور درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑے لڑکے اب اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خباثت تھی اور ہونٹوں پر بڑی لوفرانہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور اب بالکل بینچ کے ساتھ جڑی کھڑی تھی اور دل ہی دل میں آیت الکرسی اور جتنی بھی قرآنی آیات یاد تھیں، پڑھ رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، بلکہ اس کی نظریں زمین پر تھیں اور وہ دعا کر رہی تھی۔

"یا اللہ کوئی ویگن، کوئی بس آ جائے یا پھر کوئی مسافر ہی آ جائے"۔ اسے ان دونوں

لڑکوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا تھا اور پھر ایک لڑکا پیچھے ہٹ کر بالکل اس کے ساتھ جڑ کر یوں کھڑا ہوا تھا کہ اس کا بازو اس کے شولڈر بیگ سے ٹکرایا تھا۔ اس نے بے اختیار سر اُٹھا کر لڑکے کو گھورا۔

"پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو"۔ لیکن اپنی آواز کی لرزش خود اس سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔

"کیوں جی، یہ جگہ آپ کے ابا جان نے الاٹ کرا رکھی ہے"۔ لڑکے کی آنکھوں میں خباثت تھی اور سیمل کو اس کے سوا اور کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ یہاں سے دوسرے اسٹاپ پر جا کر بس یا ویگن کا انتظار کر لے۔

"یہ خیال مجھے پہلے ہی آ جانا چاہیے تھا"۔ خود کو ڈانٹتے ہوئے اس نے بائیں طرف رُخ موڑا اور تیزی سے چلنے لگی لیکن ابھی چند ہی قدم چلی تھی کہ ایک لڑکے نے تیزی سے اس کے پیچھے آ کر اس کی چادر کھینچی۔

"اے کبوتری کہاں چلی ہو، کیا کسی اور کا انتظار تھا"۔

"شٹ اَپ"۔ غصے سے اس کا رنگ سرخ ہوا لیکن اس کی آواز حلق سے باہر نہیں نکلی تھی۔

"جب تم اکیلی گھر سے نکلو گی تو راہ میں کئی آوازے کسنے والے ملیں گے۔ تم انہیں جواب دینے کے لیے مت رُک جانا۔ کتوں کو تو بھونکنے کی عادت ہوتی ہے گڑیا"۔ اماں نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔

"میرا پلو چھوڑو"۔ اس نے لہجہ مضبوط بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس میں بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔

"اور اگر نہ چھوڑوں تو"۔ اب دوسرا لڑکا بھی قریب آ گیا تھا اور بڑے بے ہودہ انداز میں ہنس رہا تھا۔

"تو......!" اس نے ہراساں نظروں سے سامنے سڑک کی طرف دیکھا، تب ہی کسی بائیک کے بریک سڑک پر چرچرائے تھے اور کوئی بائیک سے اُتر کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

"ہے سیم، یہاں کیوں کھڑی ہو"۔ اس نے قدرے فاصلے سے ہی چلا کر پوچھا تھا اور اس نے بے حد گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ دراز قد تھا، رنگت سانولی تھی، بال فوجی کٹ تھے اور آنکھیں...... ہاں آنکھیں بہت خواب ناک تھیں اور ان خواب ناک آنکھوں پر پہرا دیتی بے حد گھنی اور مڑی ہوئی پلکیں۔ وہ تھوڑے سے ہونٹ وا کیے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی یادداشت میں کہیں بھی اس جیسے حلیے اور شکل صورت والا کوئی شخص نہیں تھا بلکہ اس کی یادداشت

کے خانے میں کوئی اجنبی مرد تھا ہی نہیں پھر یہ کون تھا اور اسے اتنی بے تکلفی سے کیوں بلا رہا تھا لیکن نہیں اس نے سیم کہا تھا...... اور میرا نام تو سیمل ہے، یقیناً اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن یہ ان کا ساتھی بھی تو ہو سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ پھر گھبرا کر سہمی ہوئی سی سڑک کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اتنے میں وہ قریب آ چکا تھا۔ اسے قریب آتے دیکھ کر لڑکے نے اس کی چادر کا پلو چھوڑ دیا تھا لیکن اس نے شاید دیکھ لیا تھا، اس لیے اس نے ڈپٹ کر لڑکے سے پوچھا۔

"اے یہاں کیا کر رہے ہو تم؟"

"وہ سر...... اپنی ویگن کا انتظار کر رہے ہیں"۔

"بکواس مت کرو"۔ اس نے ایک اُلٹا ہاتھ لڑکے کے چہرے پر مارا۔

"دیکھ چکا ہوں میں تمہاری حرکت...... جی تو یہی چاہتا ہے کہ ابھی پکڑ کر تھانے میں بند کروا دوں لیکن...... بھاگو یہاں سے"۔ وہ دونوں لمحوں میں غائب ہو گئے تھے۔ اب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"آپ نے غالباً گھر جانا ہے"۔

"جی......" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اب یہ پتا نہیں کون تھا اور کیوں......

"آئیں، میں آپ کو گھر پہنچا دیتا ہوں"۔

"نہیں"۔ وہ یک دم سہم کر پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کی کشادہ آنکھیں کچھ اور کشادہ ہو گئی تھیں اور ان سیاہ پتلیوں میں تیرتا خوف صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ یوں جیسے شکاریوں کے خوف سے بھاگی ہوئی ہرنی...... اس کی غزال آنکھوں میں ٹھہرا سہم ایسا ہی تھا۔

"آپ نے غالباً مجھے پہچانا نہیں"۔ اس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلایا۔

"میں نوشیرواں ہوں"۔

سیمل کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ وہ تو اس نام کے کسی بندے کو نہیں جانتی تھی۔

"نوشیرواں عادل......" اس نے دُہرایا۔

وہ تو صرف ایک ہی نوشیرواں کو جانتی تھی جو اپنے عدل کی وجہ سے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو گیا تھا اور یہ کہاں تاریخ کے صفحوں سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کا پڑدی...... میراں اماں کا نواسا"۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

سیمل کو لگا جیسے اس کی ٹانگوں نے لرزنا بند کر دیا ہو...... تو یہ میراں اماں کا نواسا تھا۔

میراں اماں کو ان کے پڑوس میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، یہی کچھ چھ سات ماہ ہوئے تھے لیکن ان چھ سات ماہ میں وہ محلے کی ہر دل عزیز شخصیت بن چکی تھیں۔ ہر ایک سے محبت سے پیش آتی تھیں۔ ہر ایک کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتی تھیں۔ ہر ایک کی ہمدرد تھیں اور یہ ان کا نواسا...... اس نے نظر اُٹھا کر اسے دیکھا، وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ اس نے ایک دو بار گلی میں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور اسے صرف اس کا دراز قد یاد تھا بس......

''پہچانا......؟''

اس نے سر ہلا دیا۔

''تو پھر چلیں؟''

''نہیں''۔ اسی تیزی کے ساتھ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''کیوں، آپ کو اعتماد نہیں ہے مجھ پر؟''

اس نے پہلے نفی میں سر ہلایا، پھر فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ یک دم ہنس دیا اور سیمل نے دیکھا کہ اس کے دانت بہت خوب صورت تھے۔ ایک دم ہموار ذرا ذرا سے وقفے پر۔

اور اماں کہتی تھیں جس شخص کے دانتوں میں یہ ذرا ذرا سا خلا ہو، وہ بڑا خوش نصیب ہوتا ہے۔ اب پتا نہیں وہ خوش قسمت تھا یا نہیں لیکن ان دانتوں نے اس کی مسکراہٹ کو بہت خوب صورت بنا دیا تھا۔

''ایک بات کہیں نا سیم ہاں یا نہیں''۔

''میرا نام سیم نہیں ہے''۔ وہ اب قدرے اعتماد سے کھڑی تھی۔

''اچھا، میں سمجھا سیم ہے، اس روز میراں اماں آپ کو دیوار سے آواز دے رہی تھیں اور میں اندر کمرے میں ایف ایم ہنڈرڈ سے پرانے گانے سن رہا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے آپ کو سیم کہہ کر بلایا ہو، کیونکہ کچھ دیر بعد آپ ہی دیوار پر نمودار ہوئی تھیں''۔

''یہ شخص کس قدر باتونی ہے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ کمرے میں بیٹھا اِدھر ہی دیکھ رہا تھا''۔

''میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟'' اسے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''نہیں......لیکن میرا نام آپ نے غلط سنا تھا۔ میرا نام سیمل ہے''۔

''سیمل''۔ اس نے دُہرایا...... ''کتنا خوب صورت نام ہے لیکن اگر میں آپ کو سیم کہہ کر بلایا کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا''۔

''لیکن کیا ضروری ہے کہ میری اور آپ کی پھر کبھی ملاقات ہو''۔ بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''امکانات تو ہو سکتے ہیں سیم......ایک محلے میں رہتے ہیں، بلکہ دیوار سے دیوار ملی ہے اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کسی روز پھر آپ کا پوائنٹ چھوٹ جائے''۔

ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر اس وقت کوئی بس یا وین آ جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس نے سڑک پر نظر دوڑائی۔ اب رکشے، کاریں اور بائیک تو گزر رہے تھے لیکن کسی بس یا وین کا نشان تک نہیں تھا۔

''تو پھر کیا خیال ہے''۔ اس نے اسے سڑک پر نظر دوڑاتے دیکھ کر پوچھا تو وہ چونکی۔

''کیسا خیال؟''

''میرے ساتھ چلنے کا''۔

''میں اسے مناسب نہیں سمجھتی''۔ اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔

''یوں تو میں گھر ہی جا رہا تھا لیکن خیر آپ نہیں جانا چاہتیں تو''۔ وہ اس سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اس اثنا میں ایک بوڑھا بھی آ کر بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے دو تین بار اس کی طرف دیکھا، وہ اس سے بے نیاز سا کھڑا سامنے سڑک پر دیکھ رہا تھا اور اگر اس نے اس بات پر برا مان لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر گھر نہیں گئی تو مانتا رہے بُرا۔ وہ تو زندگی بھر کبھی بائیک پر نہیں بیٹھی تھی۔ مروان اور ابا کے ساتھ بھی نہیں، حالانکہ جب مروان نے نئی نئی بائیک لی تھی تو اس نے کتنا کہا تھا اس سے کہ وہ اسے بائیک کی سیر کروا لائے لیکن اس نے تو صاف منع کر دیا تھا اور یہ تو اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ غیر اور نامحرم۔ ابا دیکھ لیتے تو اسے زمانہ جاہلیت کی طرح زندہ گاڑ دیتے۔ اس نے ایک جھرجھری سی لے کر اس کی طرف دیکھا اور عین اس لمحے اس نے بھی اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

''سیم تمہاری وین آ رہی ہے''۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک پر دیکھا لیکن کوئی وین نہیں آئی تھی۔

''کیا اسے الہام ہوا ہے''۔ وہ جھنجلائی اور اس نے سوچا۔ ''اب کوئی بھی خالی رکشہ نظر آیا تو میں اس میں بیٹھ جاؤں گی۔ اب ضروری تو نہیں کہ وہ مجھے بھگا کر لے جائے۔ آخر یہ روز سیکڑوں لڑکیاں اور عورتیں رکشے میں تنہا سفر کرتی ہیں۔ یہ اماں نے بھی مجھے ڈرا ڈرا کر بالکل ہی بزدل بنا دیا ہے'' اور جونہی اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، دور سے اسے وین آتی نظر آئی۔ وہ

بے اختیار روڈ کی طرف لپکی۔ چند لمحوں میں وین وہاں کھڑی تھی اور یہ اس کی مطلوبہ وین تھی، آٹھ نمبر جو سیدھی اس کے گھر کے نزدیک ترین اسٹاپ پر رُکتی تھی۔ وین کے پائدان پر قدم رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر اسے دیکھا، وہ اپنی بائیک کی طرف جارہا تھا جو ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اس کی طرف دیکھتی، وہ بائیک پر بیٹھ چکا تھا اور پائدان پر کھڑا کنڈیکٹر کہہ رہا تھا۔

''اندر جاؤ باجی...... سیٹ آگے خالی ہے''۔ وہ جلدی سے خالی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کھڑکی میں سے اس نے دیکھا۔ وہ بائیک پر بیٹھا شاید وین کے چلنے کا انتظار کررہا تھا جو بوڑھے کے لیے رُکی ہوئی تھی اور وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا وین کی طرف آرہا تھا۔ بوڑھے کے وین میں بیٹھتے ہی وین چل پڑی اور اس نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے شولڈر بیگ کندھے سے اُتار کر گود میں رکھا اور کرایہ نکالنے لگی۔

☆☆☆

وہ لاؤنج سے اوپر جاتی سیڑھیوں کے نیچے بنی الماری کے ساتھ چپکی کھڑی تھی۔ سیڑھیوں کے نیچے موجود خلا کے تقریباً ایک تہائی حصے پر یہ الماری بنی ہوئی تھی جس میں بستر کی چادریں اور کمبل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی سی خالی جگہ پر وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہورہے تھے جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ اس کی خوب صورت سیاہ آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ یکایک کوئی چیز اُڑتی ہوئی الماری سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتی ہوئی اس کے پاؤں کے پاس گری۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے پاؤں پیچھے کیے اور سہمی سہمی نظروں سے نیچے گرنے والی چیز کو دیکھا۔ یہ اسٹیل کی وہ پلیٹ تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے لاؤنج میں سینٹر ٹیبل پر رکھی تھی۔ اماں صوفے پر بیٹھی آلو کاٹ رہی تھیں اور آلوؤں کے چھلکے اس میں ڈال رہی تھیں۔ وہ پاس بیٹھی انہیں آلو کاٹتے دیکھ رہی تھی کیونکہ اماں اس کی فرمائش پر ہی آلو کاٹ رہی تھیں۔ فرنچ فرائز اسے پسند تھے۔ اس نے کبھی ضد نہیں کی تھی۔ اسے ضد کرنا نہیں آتا تھا۔ آج پتا نہیں کیوں وہ اماں سے کہہ بیٹھی کہ وہ فرنچ فرائز کھائے گی اور اماں جو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں، انہوں نے وہیں اس سے آلو منگوا لیے اور آلو کاٹتے ہوئے وہ اس سے باتیں کررہی تھیں۔ اس کے اسکول کی باتیں، اس کی سہیلیوں کی باتیں اور وہ خوش خوش ان سے باتیں کررہی تھی اور انہیں آلو کاٹتے دیکھ رہی تھی کہ ابا آگئے۔ وہ سہم کر چپ ہوگئی تھی۔ اسے ابا سے بہت ڈر لگتا تھا حالانکہ وہ کوئی بدصورت اور بدشکل آدمی نہیں تھے بلکہ بہت وجیہہ، بہت خوب صورت اور بہت پڑھے لکھے تھے۔ کئی بار

جب وہ اپنے آپ میں مگن کچھ پڑھ رہے ہوتے تھے تو وہ چپکے چپکے انہیں دیکھا کرتی تھی اور سوچتی تھی ابا کتنے خوب صورت ہیں، بالکل شہزادوں جیسے...... اور انہوں نے کبھی اسے ڈانٹا بھی نہیں تھا پھر بھی وہ ان سے ڈرتی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہوجاتی تھی۔ ابا نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر اس پر اور اماں پر ڈالی اور پھر دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگے۔ اماں نے اسے کٹے ہوئے آلوؤں والا باؤل دیا۔

''گڑیا یہ کچن میں نازو کو دے دو، وہ تمہیں فرائی کردے گی''۔ وہ باؤل نازو کو دے کر لاؤنج میں آئی تو ابا دھاڑ رہے تھے اور اماں سہمی ہوئی صوفے پر بیٹھی اپنی اُنگلیاں مروڑ رہی تھیں۔ وہ ڈر کر سیڑھیوں کے نیچے موجود خلا میں چھپ گئی۔ یہاں سے وہ ابا اور اماں کو نہیں دیکھ رہی تھی لیکن ابا کی آواز اسے آرہی تھی۔ پتا نہیں کیا بات ہوئی تھی جو ابا کو غصہ آگیا تھا اور اسے کبھی بھی یہ پتا نہیں چلا تھا کہ ابا کو غصہ کیوں آجاتا ہے۔

''جاہل عورت...... اَن پڑھ...... ھکی......'' ابا دہاڑے تھے۔

اب پتا نہیں جاہل کون تھا اب جو ڈھیروں ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود اس وقت لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑے پوری آواز سے چلّا رہے تھے یا اماں جو صوفے پر ساکت بیٹھی تھیں اور جن کے لبوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ پھر کسی چیز کے دھپ سے کارپٹ پر گرنے کی آواز آئی تھی۔ وہ مزید سکڑ گئی۔ ابا جب بھی غصے میں ہوتے تھے یونہی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر پھینکا کرتے تھے۔ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے کھڑے وہ تھک گئی تو آہستہ آہستہ نیچے بیٹھتی گئی۔ اس نے دونوں گھٹنے جوڑے ہوئے تھے اور سمٹ کر بیٹھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ابا کی آواز پھر اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

''اب یہاں بیٹھی کیا میرا منہ دیکھ رہی ہو۔ دفع ہو جاؤ احمق عورت...... میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ''۔ اب شاید اماں اُٹھ کر لاؤنج سے باہر چلی گئی ہوں گی۔ اس نے گھٹنوں سے اونچے اپنے فراک کو نیچے کھینچتے ہوئے سوچا۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ اماں نے ابا کی بات نہ مانی ہو۔ اس نے چاہا کہ وہ لاؤنج میں جا کر دیکھے کہ اماں جا چکی ہیں یا نہیں...... لیکن اسے لگا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہیں ہے۔ وہ اب شاید کبھی کھڑی نہیں ہوسکے گی۔ پتا نہیں کیوں اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔ ایک ہی زاویے میں چھوٹی سی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں سُن ہوگئی تھیں۔ وہ اماں کے پاس جانا چاہتی تھی جو لاؤنج سے یقیناً جا چکی تھیں کیونکہ لاؤنج میں خاموشی تھی لیکن وہ اُٹھ ہی نہیں سکی اور

گھٹنوں پر چہرہ رکھے وہ ہولے ہولے رونے لگی، گھٹ گھٹ کر۔ لاؤنج سے ٹی وی کی آواز آرہی تھی۔ شاید ابا نے ٹی وی لگا لیا تھا۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں ہی تھے۔ اُٹھ کر اماں کے پاس جانے کی خواہش خود ہی دم توڑ گئی تھی۔ اس میں ابا کے سامنے سے گزر کر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ کٹی ہوئی بیٹھی روتی رہی اور پھر پتا نہیں کب وہاں روتے روتے سوگئی۔ پھر نازو کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

''بی بی جی......رومی بھیا......گڑیا یہاں ہے''۔ وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔
نازو کے ہاتھ میں وہی اسٹیل کی پلیٹ تھی۔ غالباً وہ پلیٹ اُٹھانے آئی تھی کہ اس کی نظر گڑیا پر پڑی تھی۔ پہلے رومی اور ان کے پیچھے اماں آئی تھیں۔ رومی نے یک دم ہی اسے گود میں اُٹھا لیا تھا۔
''گڑیا تم یہاں چھپی بیٹھی ہو اور ہم نے پورا گھر ڈھونڈ ڈالا''۔ اس کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔

''گڑیا تم روتی رہی ہو۔ کیا ہوا تھا تمہیں''۔ رومی اسے گود میں لیے صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور اس کی پیشانی چوم رہا تھا۔ اماں مجرم سی بنی اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کے پاس ہی صوفے پر آکر بیٹھ گئی تھیں۔

''ابا......ابا کدھر ہیں؟'' اس نے لاؤنج میں چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔

''گھر پر نہیں ہیں''۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا تھا۔ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں، ستا ہوا چہرہ......وہ شاید بہت روئی تھیں اور ہمیشہ ہی ابا کے چیخنے چلانے کے بعد وہ بہت روتی تھیں۔ چھپ چھپ کر اپنے کمرے میں۔ کچن میں کام کرتے ہوئے کہیں بھی۔

''اماں......'' اس نے رومی کی گود میں بیٹھے بیٹھے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے تھے اماں تو جیسے منتظر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے یک دم ہی اسے اپنی گود میں لے لیا تھا اور اب دونوں بازوؤں میں بھینچے اسے چوم رہی تھیں۔ اس کے رخساروں کو، اس کے ماتھے کو، اس کے سر کو۔ رومی سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔ اسے چومتے ہوئے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور پھر یہ آنسو ان کے رُخساروں پر لڑھک آئے تھے۔

''اماں نہ روئیں''۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُن کے آنسو پونچھنے لگی۔ اماں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ان پر اپنے لب رکھ دیے۔ اب وہ اس کے ہاتھوں کو چوم رہی تھیں۔

''اماں، گڑیا ڈر کر وہاں چھپی تھی......کیا ابا......'' رومی کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

اماں نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

''آپ ابا کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں۔ کم از کم گڑیا کے سامنے تو وہ...... یہ ابھی بہت چھوٹی ہے، صرف پانچ سال کی۔ یہ ہر وقت خوف زدہ رہتی ہے''۔ اماں نے بے بسی سے رومی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ آنسو ان کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

''اماں......'' رومی اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے سامنے کارپٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ اُن کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ ''ابا ایسے کیوں ہیں، اماں وہ اس طرح کیوں بی ہیو کرتے ہیں۔ فیصل ہے، سنی ہے، عالم ہے سب کے گھروں میں کتنا سکون ہے۔ فیصل اور سنی کے ابا تو ان کے ساتھ دوستوں کی طرح ہر بات شیئر کرتے ہیں''۔ اماں کیا کہتیں۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ انہیں تو خود پتا نہیں تھا کہ وہ ایسے کیوں ہیں اور کبھی کبھی تو انہیں اپنا قصور بھی پتا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس بات پر چلا رہے ہیں۔ وہ تو جب سے اس گھر میں بیاہ کر آئی تھیں، یونہی ذرا ذرا سی بات پر انہیں چلاتے برتن پھینکتے اور توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ یونہی آنسو بہاتی رہیں۔

''اماں......!'' رومی نے بے چین ہو کر ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے، تب ہی گیٹ کھلنے اور پورچ میں گاڑی رُکنے کی آواز آئی تھی۔

''ابا آگئے ہیں شاید''۔ رومی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میں آج ابا سے بات کرتا ہوں''۔

''نہیں''۔ انہوں نے لرز کر اپنے سترہ سالہ بیٹے کو دیکھا، جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں لیکن وہ اس عمر میں بھی بے حد سنجیدہ اور ذمے دار لگتا تھا۔

''تم کچھ مت کہنا''۔ پھر کسی فساد سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے جلدی سے اپنے رُخسار صاف کیے تھے۔

''میں بات کرلوں گی''۔ رومی نے ایسی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ بات نہیں کریں گی۔ پھر گڑیا کو ان کی گود سے لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''اس نے اسکول سے آکر کچھ نہیں کھایا تھا۔ فرنچ فرائز مانگ رہی تھی اور......'' ان کی آواز رندھ گئی۔ سیڑھی پر کھڑے کھڑے اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

''نازو کے ساتھ بھجوا دیں''۔ اور پھر وہ اسے گود میں اُٹھائے اپنے کمرے میں آگیا۔
اوپر تین بیڈروم تھے۔ ایک اس کا دوسرا اماں اور گڑیا کا اور تیسرا ابا کا، لیکن وہ کم ہی اوپر آتے تھے، ان کا مستقل ٹھکانا گیسٹ روم تھا جو گراؤنڈ فلور پر تھا۔ گڑیا کو بیڈ پر بٹھا کر وہ اس کے سامنے کرسی پر

بیٹھ گیا۔

''تو ہماری گڑیا کیا کھائے گی؟''

''کچھ نہیں''۔اس نے نفی میں سر ہلایا۔فرنچ فرائز کھانے کی خواہش دم توڑ چکی تھی۔

''آئس کریم کھانے چلیں''۔

''نہیں، کہانی سنائیں''۔

''کون سی''۔

''مرچو والی''۔

اسے ''مرچو'' والی کہانی بہت پسند تھی۔وہ سب سے چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے لیکن ہر مشکل وقت میں وہی سب کی مدد کرتا ہے۔اسے کہانیاں سننا اچھا لگتا تھا۔حالانکہ وہ صرف پانچ سال کی تھی لیکن رومی اسے تب سے کہانیاں سنا رہا تھا جب وہ ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے کسی کہانی کی سمجھ آتی تھی لیکن رومی کی گود میں لیٹ کر اس سے کہانی سننا اس کی عادت بن گئی تھی۔وہ یونہی کہانی سنتے سنتے سو جاتی تھی۔

نازو فرنچ فرائز لے آئی تھی۔وہ اسے کہانی سناتے سناتے چپس بھی کھلاتا جا رہا تھا اور وہ اتنے اشتیاق سے مرچو والی کہانی سن رہی تھی جیسے پہلی بار سن رہی ہو۔مرچو کی عقل مندی پر اس کی آنکھیں چمکنے لگتی تھی۔کہانی سنتے سنتے وہ ایک بار پھر سو گئی تھی۔رومی نے اس کو ٹھیک طرح سے بیڈ پر لٹا دیا اور پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔وہ آج ابا سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

سیمل صحن میں کرسی پر بیٹھی کوئی میگزین پڑھ رہی تھی۔وہ کچھ دیر پہلے ہی صحن میں آئی تھی۔اندر کمروں میں بے حد گھٹن اور حبس ہو گیا تھا۔دوپہر میں ذرا سی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے باہر کا موسم اچھا تھا۔ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔وہ عصر کی نماز پڑھ کر چائے بنانے اُٹھی لیکن اماں سو رہی تھیں تو اس نے سوچا، ان کے جاگنے پر ہی چائے بنائے گی، چنانچہ چائے بنانے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ اندر سے میگزین اُٹھا لائی اور اب صحن میں کیاریوں کے پاس کرسی بچھائے میگزین پڑھنے میں مگن تھی۔موتیے کی خوشبو اسے پسند تھی اور موتیے کی بیل پھولوں سے بھری پڑی تھی۔

''سیمل......سیمل''۔میگزین پڑھتے پڑھتے اس کے کانوں میں آواز آئی تو اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا۔میراں اماں دیوار سے جھانک رہی تھیں۔اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ مسکرائیں۔ان کے سرخ و سپید چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگتی تھی۔مہربان اور شفیق سی۔

''جی''۔وہ میگزین کرسی پر رکھ کر دیوار کے پاس آئی۔دیوار کے پاس لوہے کی کرسی پڑی تھی۔لوہے کی یہ کرسی ان کے اس گھر میں آنے سے پہلے کی تھی جو غالباً رابطے کا ذریعہ تھی جبکہ دوسری طرف چار سیڑھیوں والی ایلومونیم کی چھوٹی سی سیڑھی ہمہ وقت دیوار سے لگی رہتی تھی۔یہ دونوں گھر دو سگے بھائیوں کے تھے، جو خود تو ڈیفنس چلے گئے تھے اور یہ گھر کرائے پر دے رکھے تھے۔لوہے کی کرسی پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے میراں اماں کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹا! کیسی ہو؟''

''جی بالکل ٹھیک، آپ کیسی ہو؟''

''اللہ کا شکر ہے، تمہاری اماں کیسی ہیں؟''

''رات کچھ بے چین تھیں لیکن اب سو رہی ہیں''۔وہ افسردہ ہو گئی۔اماں کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ یونہی افسردہ ہو جاتی تھی۔

''اللہ انہیں صحت و زندگی دے...... یہ میں نے پکوڑے بنائے تھے شیری کے لیے''۔ انہوں نے منڈیر پر رکھی پلیٹ اس کی طرف کھسکائی۔

''ذرا سی بارش ہو تو پکوڑوں کی فرمائشیں کرنے لگتا ہے''۔شیری غالباً نوشیرواں کا نک نیم ہوگا۔اس نے سوچا اور پلیٹ اُٹھالی۔

شکریہ......اماں جان۔

''ارے''۔وہ ہنسیں......''یہ کیا غیروں کی طرح شکریہ ادا کر رہی ہو''۔

''اماں جان......اماں جان''۔اندر کسی کمرے سے نوشیرواں کی آواز آئی تھی۔میراں اماں سیڑھی سے اُتر گئیں۔

''اب چائے کی طلب ہو رہی ہو گی''۔وہ پھر ہولے سے ہنسی اور پلیٹ اُٹھا کر کرسی سے اُترتے ہوئے اس نے نوشیرواں کو کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا دراز قد بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔پتا نہیں اس کا قد کتنا ہوگا......مروان کے قد سے بڑا ہی ہوگا کچھ......مروان کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا اور نوشرواں عادل یقیناً چھ فٹ سے بھی زیادہ ہوگا۔

پلیٹ اُٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ نوشیرواں کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ پلیٹ کاؤنٹر پر رکھ کر اس نے ایک گرما گرم پکوڑا منہ میں ڈالا اور چائے کا پانی رکھ کر وہ اماں کے کمرے میں آئی۔وہ ابھی تک سو رہی تھیں۔لائٹ چلی گئی تھی۔پنکھا بند تھا اور کمرے میں بے حد حبس تھا۔کمرے کی کھڑکیاں کھول کر وہ اماں کے بیڈ کے قریب آئی۔ان کا پورا چہرہ پسینے میں بھیگا

ہوا تھا، کچھ بال پیشانی پر چپکے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کے چہرے سے پسینہ پونچھا۔ ماتھے پر آئے بال پیچھے کیے تو انہوں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں اور یسمل کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی اجنبیت اور بیگانگی تھی جو پچھلے کئی سالوں سے وہ دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ہمیشہ کی طرح دکھی ہو گیا۔ ''وہ دن کب آئے گا میری زندگی میں، جب اماں مجھے اسی شفقت و محبت سے دیکھیں گی جیسے پہلے دیکھا کرتی تھیں۔ جب ان کی آنکھوں میں میرے لیے پہچان کے رنگ ہوں گے، جب وہ محبت سے مجھے بلائیں گی''۔

''اماں جی باہر چل کر بیٹھیں۔ باہر موسم اچھا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بارش ہوئی تھی نا...... میراں اماں نے پکوڑے بھیجے ہیں اور میں نے چائے کا پانی رکھ دیا ہے۔ باہر ہی چائے پیتے ہیں''۔

انہوں نے حسب معمول کچھ نہیں کہا تھا اور یونہی خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی انہوں نے کچھ نہیں کہنا۔ وہ کبھی کچھ نہیں کہتی تھیں، بس ٹکر ٹکر دیکھا کرتی تھیں لیکن پھر بھی جب وہ ان کے پاس بیٹھتی تو ہر بات اُن سے کرتی...... بھلے وہ سنتی سمجھتی ہوں یا نہیں، یسمل کو تو ہر بات اُن سے شیئر کرنا ہوتی تھی۔ کیا پتا اماں کسی روز اس کی کسی بات پر چونک جائیں...... کبھی کوئی لفظ ان کی زبان سے نکلے۔ اس نے سہارا دے کر انہیں اُٹھایا۔ بیڈ کے پاس ان کے چپل رکھے اور جھک کر ان کے پاؤں میں پہنائے، تکیے کے پاس پڑا دوپٹہ انہیں اوڑھایا۔

''چلیں اماں''۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں لے کر باہر آئی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ برآمدے میں پڑے تخت پر انہیں بٹھا کر وہ تیزی سے صحن کی طرف لپکی۔ کرسی پر اوندھا پڑا میگزین تھوڑا بھیگ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے میگزین اُٹھا کر دوپٹے سے پونچھا پھر کرسی اُٹھا کر برآمدے میں رکھی اور تخت پر پڑا گول تکیہ اُٹھا کر اماں کے پیچھے رکھا۔

''اماں آرام سے بیٹھ جائیں ٹیک لگا کر، میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں''۔ اماں اب اِدھر اُدھر کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ تین سال پہلے ان میں یہ تبدیلی آئی تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ کسے کھوجتی ہیں لیکن وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ہر بار کی طرح اس نے آج بھی ان سے پوچھا تھا۔ ''اماں جی آپ کسے کھوجتی ہیں، کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟'' وہ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''مروان کو نا...... مروان نہیں ہے اماں...... وہ......'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے اس کا دل کٹ کر گر جائے گا۔ اماں کی ساکت نظروں سے گھبرا کر وہ جلدی سے کچن میں چلی گئی۔ کبھی کبھی اماں کی ان ساکت نظروں سے بہت خوف آتا تھا اسے۔

''میں ایسا کیا کروں کہ اماں ہوش و حواس کی طرف لوٹ آئیں''۔ اس نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو پونچھے اور چائے بنانے لگی۔ چائے بنا کر اس نے ٹرے میں رکھی اور پھر پکوڑوں کی پلیٹ اُٹھائی۔ وہ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اس کی نظریں مائیکرو کی طرف اُٹھیں لیکن پھر مایوس ہو کر اس نے ٹھنڈے پکوڑے ہی پلیٹ میں رکھے اور کچن سے نکل آئی۔

اماں سامنے کیاریوں کے پاس پھدکتی ہوئی چڑیا کو دیکھ رہی تھیں جو اپنی چونچ سے کیاری کے پاس جمع ہونے والے پانی کے چھینٹے اُڑا رہی تھی۔ اس نے ٹرے تخت پر رکھی اور اماں کی نظروں کے تعاقب میں پانی کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی چڑیا کو دیکھا اور پھر کپ اُٹھا کر اماں کو دیا۔

''اماں چائے لے لیں''۔ انہوں نے چائے پکڑ لی تو یسمل نے پکوڑوں کی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔

''اماں لیں نا...... بہت مزے کے بنے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈے ہو چکے ہیں پھر بھی اچھے لگ رہے ہیں''۔ اماں نے پکوڑا اُٹھا لیا تھا۔

''میراں اماں ہیں نا، یہ انہوں نے بنائے ہیں۔ یہ ادھر ساتھ والے گھر میں رہتی ہیں۔ یہ لوگ کچھ عرصے پہلے ہی آئے ہیں لیکن میراں اماں بہت اچھی ہیں بالکل آپ جیسی...... پتا ہے ان کا بیٹا ہے نا وہ نوشیرواں عادل۔ پتا نہیں اصل والا نوشیرواں عادل کیسا ہوگا لیکن یہ تو خوب لمبا تڑنگا ہے اور شکل سے فوجی لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ کوئی فوجی ہے...... ہو سکتا ہے نہ ہو، کچھ لوگ تو ویسے بھی فوجی کٹ بالوں کو پسند کرتے ہیں''۔ وہ چائے پیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اُن سے باتیں کیے جا رہی تھی۔

''اور یہ جو نوشیرواں ہے نا اماں، یہ بھی اپنی اماں جان کی طرح ہے۔ مہربان اور ہمدرد۔ پتا ہے اس روز میں اسٹاپ پر اکیلی تھی تو وہ صرف میرے لیے دھوپ میں کھڑا رہا اور جب میری وین آ گئی، تب گیا۔ اس روز حمنہ نے چھٹی کی تھی اور پوائنٹ بھی نکل گیا تھا۔ وہاں اکیلے مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ وہاں سے گزرا تو پتا نہیں کیسے اس نے مجھے پہچان لیا، ورنہ میں تو اسے بھی دیکھ کر ڈر گئی تھی''۔ اس نے خالی کپ ٹرے میں رکھ کر اُن کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں کپ تھا اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ پتا نہیں انہیں کیا یاد آیا تھا۔ وہ ماضی کا کون سا منظر دیکھ رہی تھیں، حالانکہ ان کی زندگی میں خوش کن منظر تو تھے ہی نہیں یا بہت کم لیکن وہ بھی اُداسی میں لپٹے ہوئے۔

''اماں''۔ اس نے بہت ہولے سے اُن کا ہاتھ چھوا۔ ''کیا سوچ رہی ہیں؟'' انہوں نے نظریں گھما کر اسے دیکھا۔ لبوں پر بکھری مسکراہٹ معدوم ہو گئی اور انہوں نے چائے کا کپ

ہونٹوں سے لگالیا اور چند گھونٹوں میں ٹھنڈی چائے حلق سے نیچے اُتار لی۔

سیمل کو پچھتاوے نے گھیر لیا۔ اماں اس طرح تو کبھی ہفتوں، مہینوں بعد مسکراتی تھیں اور اس نے انہیں ٹوک دیا۔ کچھ دیر تو وہ یونہی پچھتاوے میں گھری اماں کو محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی پھر ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ کر رسالہ پڑھنے لگی۔ اماں کی نظریں پھر اِدھر اُدھر کسی کو کھوج رہی تھیں لیکن اب اس کا دھیان کہانی کی طرف تھا۔ کہانی ہمیشہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتی تھی اور وہ اس میں کھو کر ارد گرد سے بے نیاز ہو جاتی تھی۔ کہانیاں پڑھنے کا چسکا اسے مروان نے لگایا تھا۔ وہ اس کے لیے ڈھیروں کتابیں خرید کر لاتا تھا اور کبھی جب ان کے پاس پیسوں کی کمی ہوتی تھی تو وہ دونوں انار کلی اور اُردو بازار میں پرانی کتابیں کھوجتے پھرتے تھے۔ کتنی ہی شان دار کتابیں انہوں نے فٹ پاتھ پر بیٹھے حامو چاچا سے خریدی تھیں۔

حامو چاچا چھ دن گلی گلی پھر کر پرانی کتابیں خریدتا پھر ان میں سے اچھی اور پڑھنے کے قابل کتابیں چھانٹ کر الگ کرتا۔ پھٹی پرانی اور بے کار کتابیں ردی میں فروخت ہو جاتیں۔ ہر اتوار کو کتابیں سجا کر فروخت کرتا تھا۔ مروان اور سیمل کو تو وہ اتنا جاننے لگا تھا کہ کئی بار وہ کوئی اچھی کتاب ان کے لیے الگ سے رکھ دیتا۔ تب مروان اس کا بے حد ممنون ہوتا۔

''چاچا آپ نے ہم غریبوں کا خیال کیا، ورنہ یہ اتنی قیمتی کتاب ہم کبھی بھی نئی نہیں خرید پاتے.....'' اور حامو چاچا مسکرا دیتا۔ وہ بہت زیادہ گفتگو نہیں کرتا تھا، نہ ہی کوئی مول تول۔ اچھی حالت والی کتابیں ہاف قیمت پر مل جاتی تھیں اور ذرا کم بہتر ایک چوتھائی قیمت پر۔

اب کتنے دن ہو گئے تھے کہ وہ اتوار کو انار کلی نہیں گئی تھی بلکہ دن کہاں سال ہی گزر گئے تھے، شاید آخری بار وہ تقریباً چھ سال پہلے مروان کے ساتھ گئی تھی۔ جب مروان سیاچن سے آیا تھا، اس کی پوسٹنگ وہاں ہوگئی تھی اور وہ ہفتہ بھر رہنے کے لیے آیا تھا، اس ایک ہفتے میں اس نے کتنا انجوائے کیا تھا۔ مروان نے اسے ڈھیروں کتابیں خرید کر دی تھیں۔ فیروز سنز سے واپسی پر وہ انار کلی ہی گئے تھے، حامو چاچا نے ان کے لیے دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کتابیں لے کر اس روز مروان نے ان سے بہت ساری باتیں کی تھیں اور اس روز پہلی بار حامو چاچا نے بتایا تھا کہ ان کا ایک بیٹا ہے ایم اے پاس لیکن نوکری نہیں ملتی۔

''اس نے ڈھونڈی نہیں ہوگی، آپ جو اس عمر میں کما رہے ہیں''۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا، تب اس پر ایک سرزنش بھری نظر ڈال کر مروان اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ حامو چاچا ہمیشہ صاف ستھرے دھلے ہوئے لباس میں ہوتا۔ اس کے سر پر صاف ستھری پگڑی

بندھی ہوتی اور آنکھوں میں سرمہ لگا ہوتا۔ ایک بار اس نے مروان سے کہا تھا۔

''مجھے حامو چاچا اشفاق احمد کا کوئی بابا لگتا ہے، کیا آپ کو بھی ایسا لگتا ہے؟'' تب مروان بہت ہنسا تھا۔

''ہر وقت کتابوں کی دنیا میں نہ رہا کرو۔ کوئی بابا وابا نہیں ہے، بس رزق حلال کمانے والا اللہ کا بندہ ہے''۔

''اور رزق حلال کمانے والے اللہ کے بندے ہی تو اللہ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں''۔ یہ اس کا خیال تھا اور اس کے دل میں حامو چاچا کے لیے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ کبھی وہ ضرور اکیلی جا کر حامو چاچا سے کچھ ایسی باتیں ضرور کرے گی کہ اشفاق احمد کی طرح اسے کھوج سکے کہ وہ تصوف کے کس مقام پر ہے۔

لیکن مروان نہیں تھا تو وہ اکیلی کیسے جاتی۔ وہ تو کبھی کہیں اکیلی گئی ہی نہیں تھی۔

''مروان آجائے تو پھر ہی جاؤں گی''۔ اس نے بے خیالی میں سوچا اور ہاتھ پلیٹ کی طرف بڑھایا لیکن پلیٹ خالی ہو چکی تھی۔ کہانی پڑھتے پڑھتے اسے پتا ہی نہیں چلا اور اس نے سارے پکوڑے ختم کر دیئے تھے۔

اس نے پلیٹ کی طرف دیکھا اور پھر اماں کی طرف، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں اس کے ہاتھ میں پکڑے میگزین پر تھیں۔ بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کو تھا اور اماں کی نظریں رسالے پر تھیں۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ سمجھ گئی تھی کہ اماں چاہتی ہیں، وہ پڑھنا چھوڑ دے۔ انہوں نے ہمیشہ ہی اسے مغرب کے وقت پڑھنے سے منع کیا تھا۔ کبھی جو وہ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ مغرب کے وقت دیکھتیں تو فوراً ٹوکتی تھیں۔

''سیمی بیٹا بند کرو پڑھنا۔ دونوں وقت مل رہے ہوتے ہیں، ایسے میں تو بہتے دریا بھی رُک جاتے ہیں.....'' اور اس نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ دور کہیں کسی مسجد میں اذان شروع ہوئی تھی اور اماں مضطرب سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اب وہ پڑھ نہیں رہی تھی، صرف ورق گردانی کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اماں اسے زبان سے منع کریں۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے اسے اماں کی آواز سنے، حالانکہ وہ ان کی ہر بات بن کہے ہی سمجھ جاتی تھی لیکن کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ اماں بولیں تو وہ یونہی انجان بن جاتی تھی۔ بے چینی سی پہلو بدلتے ہوئے انہوں نے اس کے ہاتھ سے رسالہ پکڑ لیا تھا۔

"کیا ہے اماں پڑھنے دیں نا!" اس نے مصنوعی جھنجلاہٹ سے کہا اور رسالہ ان کے ہاتھ سے لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ انہوں نے ہاتھ پیچھے کرلیا۔

"نہیں...... مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے"۔ اس کا جی چاہا، وہ خوشی سے ناچنے لگے۔ کتنے دنوں بعد اماں نے یوں پورا ایک جملہ بولا تھا۔ اس کے کانوں میں جیسے اب بھی ان کی آواز گونج رہی تھی۔ بے اختیار اس نے ان کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے ان کی پیشانی چوم لی۔

"سوسوئیٹ مام، میں وضو کرنے جارہی ہوں، آپ نماز پڑھیں گی؟"

"میں"۔ ان کے لب ہلے تھے اور انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا تھا۔ "میں کیسے پڑھوں؟" انہوں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"جیسے میں پڑھوں گی، میں بتاؤں گی آپ کو...... آئیں میں آپ کو وضو کے لیے لے جاؤں"۔ وہ تخت سے اُتری اور پاؤں میں چپل پہن کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر پہلی کیفیت میں ساکت سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھیں۔ یہاں وہاں کچھ دیر پہلے چڑیا پھدک رہی تھی لیکن اب وہ جگہ خالی تھی۔ اس نے چڑیا کی تلاش میں نظر دوڑائی، وہ اب جامن کے درخت پر بیٹھی تھی۔ ان کے چہرے پر خوف تھا اور کبھی کبھی وہ یوں ہی خوف زدہ ہو جاتی تھیں۔

"اور یہ اچھی بات ہے اماں کا اس طرح ری ایکٹ کرنا۔ کل ڈاکٹر عرفان کو بتاؤں گی اور مردان کو بھی۔ کتنا خوش ہوگا مردان جب اسے پتا چلے گا کہ آج اماں نے مجھ سے بات کی، مجھے ٹوکا...... رسالہ پڑھنے سے منع کیا"۔ وہ خوشی خوشی سوچتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

رومی ان کے سامنے بیٹھا تھا اور انہیں بغور دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ ٹی وی سے نظریں ہٹا کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ان جیسا تھا، شاید جب وہ اس کی عمر کے ہوں گے تو وہ بھی ایسے ہی ہوں گے دبلے پتلے اسمارٹ...... ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"شکر ہے اس عورت نے اپنے جیسے بچے پیدا نہیں کیے ورنہ"۔

"کیا بات ہے، کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی"۔ رومی نے اضطراب سے اُنگلیاں مروڑیں۔ "ابا جی مجھے یہ کہنا تھا کہ گڑیا اب بڑی ہو رہی ہے، وہ آپ دونوں کی لڑائی سے بہت ڈسٹرب ہوتی ہے، ڈر جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں نا وہ بہت حساس ہے۔ آج بھی......" وہ انہیں تفصیل بتانے لگا۔

"یعنی دو گھنٹے تک وہ وہاں سیڑھیوں کے نیچے خوف زدہ ہو کر چھپی رہی اور اس جاہل عورت کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے"۔ وہ یک دم ہی لال سرخ ہو کر دھاڑے تھے۔ "کل کلاں کو کوئی اسے اُٹھا کر لے جائے تو اس احمق، بے وقوف عورت کو پتا ہی نہیں چلے گا"۔

"ابا جی پلیز......" رومی نے پریشان ہو کر التجا کی۔ "وہ آپ کے اس طرح چیخنے چلانے سے ڈر جاتی ہے۔ آپ کو اگر کوئی بات اماں سے کرنی ہے تو آہستہ آواز میں بھی کر سکتے ہیں، جو بھی آپ کے اختلافات ہیں، ان سے پلیز انہیں ختم کرلیں۔ میرے لیے، گڑیا کے لیے"۔

"اختلافات"۔ ان کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ اُبھری۔ "مجھے بھلا اس عورت سے کیا اختلافات ہو سکتے ہیں"۔ رومی نے اپنے دل میں بے حد تکلیف محسوس کی۔ ابا نے کبھی اماں کو ان کا نام لے کر نہیں بلایا تھا بلکہ وہ ہمیشہ انہیں عورت کہہ کر بلاتے تھے۔

"اختلافات تو برابر کے لوگوں میں ہوتے ہیں اور وہ عورت میرے برابر ہو سکتی ہے"۔

رومی کو لگا جیسے اُن کی گردن اکڑ گئی ہو، انہوں نے بڑے فخر سے رومی کو دیکھا۔

"کیا وہ عورت اس قابل تھی کہ میری بیوی بنتی۔ چودھری حبیب خان کی، بتلاؤ؟"

رومی کا دل جیسے پھٹ جانے کو ہوا۔ بھلا اماں میں کیا کمی تھی۔ ان کے سانولے رنگ میں کتنی ملاحت تھی۔ ان کا دل کش سراپا، ان کے خوب صورت تیکھے نقوش اور ان کی ہرنی جیسی آنکھیں، جن میں ہر وقت ایک ہراس چھایا رہتا...... گڑیا کی آنکھیں بالکل ان جیسی تھیں۔

"چپ کیوں ہو گئے ہو، بتاؤ نا، ہے وہ عورت اس قابل؟" رومی نے دُکھ سے انہیں دیکھا۔

"کون کہہ سکتا ہے کہ اس شخص نے آکسفورڈ اور ایڈنبرا سے تعلیم حاصل کی ہے"۔

"وہ عورت میرے قابل نہیں ہے۔ جاہل، بے وقوف عورت......" اسے خاموش دیکھ کر وہ بڑبڑائے تھے۔

"یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا، شادی سے پہلے، آپ پر جبر تو نہیں کیا گیا ہوگا"۔ بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"براہ راست جبر نہیں تھا میاں لیکن بالواسطہ جبر ہی تھا۔ میں نے اپنی ماں کو خود اپنے لیے دُلہن کے چناؤ کا اختیار دیا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ میرے لیے ایسی لڑکی پسند کریں گی جسے ساتھ لے کر چلتے ہوئے مجھے شرم آئے گی۔ اَن پڑھ جاہل"۔

"اماں دس جماعت پاس تھیں اور شاید دادی کے نزدیک ان کی اتنی تعلیم کافی تھی"۔ رومی نے تاسف سے انہیں دیکھا اور بے حد تحمل سے بولا۔

''اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ گھر کو کیوں جہنم بنا رکھا ہے آپ نے۔ انہیں اس قصور کی سزا کیوں دے رہے ہیں جو انہوں نے نہیں کیا۔

''میں نے''۔ انہوں نے اُنگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گھر کو جہنم بنا رکھا ہے یا اس عورت نے جسے نہ پہننے کا سلیقہ ہے، نہ اوڑھنے کا، نہ اس بڑے گھر میں رہنے کا۔ کبھی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی بھنڈیاں کاٹ رہی ہوتی ہے تو کبھی آلو اور کبھی......''

''ابا جی پلیز......'' رومی نے ایک بار پھر التجا کی۔ ''آپ اماں سے جھگڑا مت کیا کریں۔ ملازم بھی ہنستے ہیں اور ہم...... میں اور گڑیا مینٹلی بہت ڈسٹرب ہو جاتے ہیں''۔

''کس کی جرأت ہے جو مجھ پر ہنسے''۔ انہوں نے غصے سے ریموٹ اُٹھا کر ٹی وی بند کر دیا۔ ''اور تم......'' اب وہ اسے گھور رہے تھے۔ ''میں جانتا ہوں تم کس کے کہنے پر یوں میرے سامنے کھڑے مجھ سے باز پرس کر رہے ہو...... جوان ہو گئے ہو تم، کالج میں پہنچ گئے ہو تو میرے باپ بن گئے ہو۔ فرسٹ ایئر فول......'' وہ کھڑے ہو گئے۔

''اور اس سے تو میں پوچھتا ہوں ابھی...... اس عورت سے کہ میری اولاد کو میرے خلاف کرتی ہے''۔

''ایسا نہیں ہے ابا جی۔ اماں نے تو کچھ نہیں کہا، میں تو گڑیا کی وجہ سے خود ہی......''

رومی نے دوڑ کر ان کا ہاتھ پکڑا لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر تیزی سے باہر نکل گئے۔ رومی ان کے پیچھے بھاگا لیکن انہوں نے گیسٹ روم میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا جہاں اماں ان کے بیڈ کی چادر تبدیل کر رہی تھیں اور اب ایک نیا محاذ کھل گیا تھا۔ اندر سے ان کے چیخنے چلانے اور چیزیں پھینکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رومی ننگے پاؤں پریشان سا کھڑا بے بسی سے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی ماں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی شاید اپنی ماں کی طرح بے بس تھا۔ وہ اس شخص جو اس کا باپ بھی تھا، کی باتوں سے اپنی ماں کو نہیں بچا سکتا تھا۔ ان باتوں سے جو نہ صرف اس کی ماں کی بلکہ اس کی عزتِ نفس کو بھی مجروح کرتی تھیں۔ وہ بے بسی سے پلٹا۔ کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھے نازو کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ چڑاتی ہوئی غصہ دلاتی ہوئی۔

''شٹ......'' اس نے غصیلی نظر نازو پر ڈالی اور تقریباً دوڑتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں سے ہوتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا گیا اور اپنے بیڈ روم میں بیڈ پر اوندھا گر کر رونے لگا۔ وہ سترہ سال کا بھیگتی مسوں والا لڑکا آنسوؤں سے رو رہا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد اس کے آنسو آپ ہی آپ تھم گئے تھے لیکن وہ یونہی لیٹا رہا...... پتا نہیں

کتنی دیر گزر گئی تھی۔ وہ یونہی چپ چاپ لیٹا سوچتا رہا کہ وہ کسی قابل ہوا تو وہ اماں اور گڑیا کو لے کر نکل جائے گا۔ بلا سے کوئی چھوٹا سا گھر ہو گا لیکن وہاں سکون تو ہو گا۔ وہ دل ہی دل میں عہد کرتا رہا اور پلان بناتا رہا، جب کمرے میں سوئچ آن کرنے کی آواز آئی۔ اس نے تکیے سے سر اُٹھا کر دیکھا۔ سوئچ بورڈ کے پاس اماں کھڑی تھیں۔

''اماں جی''۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا رومی......'' انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔ پھر اس کی بھیگی پلکوں کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔

''تم روئے ہو رومی...... تم تو کبھی نہیں روتے تھے''۔ وہ ایسا ہی تو تھا، کتنی ہی سخت چوٹ لگتی، وہ ذرا نہیں روتا تھا۔ اس لیے کہ اسے فوجی بننا تھا اور فوجی تو بہادر ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں روتے۔ یہ دادا جان نے اس سے کہا تھا، جب وہ گاؤں میں چھت سے گر گیا تھا اور اس کے سر پر بہت گہرا زخم آیا تھا۔ پھر وہ اسٹیچز لگتے ہوئے بھی نہیں رویا تھا۔

لیکن فوجی بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی تو ہوتے ہیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا اور کبھی کبھی ایسے زاویے سے چوٹ لگتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں لیکن وہ کوئی چوٹ لگنے پر تو نہیں رویا تھا بلکہ اپنی بے بسی پر رویا تھا۔ یکایک اس کی نگاہ اماں کے رخسار پر پڑی تھی۔ پانچوں اُنگلیوں کے نشان اس پر ثبت تھے۔

''انہوں نے آپ کو مارا ہے؟'' یک دم ان کے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھڑا کر اس نے ان کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا۔ اماں نے نگاہیں جھکا لیں جیسے یہ بھی ان کا جرم تھا۔

''اماں...... یہ...... یہ میری وجہ سے ہوا''۔ وہ ان سے پلٹ کر بلک پڑا۔ وہ ہولے ہولے اسے تھپک رہی تھیں اور وہ ان سے لپٹا رو رہا تھا۔

''بس کر رومی مت رو...... میرا دل پھٹ جائے گا بیٹا...... تیری بہن جاگ جائے گی''۔ ہولے ہولے وہ سنبھل گیا۔ اماں اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

''اماں جی......'' وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا اور اپنے ہاتھ اُن کے رخسار پر پھیر رہا تھا۔

''یہ ابا ایسے کیوں کرتے ہیں؟'' کتنی بار پوچھا ہوا سوال اس نے پھر پوچھا تھا۔

''پتا نہیں بیٹا...... میں تو خود بھی سمجھ نہیں پائی کہ وہ ایسے کیوں ہیں۔ کتنی کوشش کرتی

ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو انہیں غصہ دلائے لیکن پھر بھی...... مجھے معاف کر دو بیٹا"۔

"اماں جی......" وہ تڑپ کر اٹھا بیٹھا۔ "آپ ایسا کہہ کر مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔ انہیں غصہ دلانے کے لیے کسی بات کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ تو ہمہ وقت ہی غصے میں رہتے ہیں"۔ اور بات کرتے کرتے اس کی نظر گڑیا پر پڑی جو اُٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ارے، میری گڑیا جاگ گئی"۔ رومی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اماں پر تھیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے اماں کی طرف کھسکی تھی۔

"اماں درد ہو رہا ہے؟" اس نے ہاتھ سے رخسار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ رومی اور اماں کی آنکھوں میں بیک وقت حیرت اُتری تھی۔

"ناں...... نہیں تو بیٹا"۔ وہ مسکرائی تھیں لیکن گڑیا کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

"اماں بہت درد ہو رہا ہے آپ کو، مجھے پتا ہے"۔ پھر وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اُتری اور بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھینچ کر پونسٹان کا پتا نکالا۔

"یہ کھا لیں، درد ٹھیک ہو جائے گا۔ ہیں نا رومی بھائی"۔ رومی مسکرایا تھا۔

"اماں جی، ہماری گڑیا بہت عقل مند ہے"۔

"لیکن بیٹا یہ دوائیاں اس طرح نہیں رکھا کرو، بچی ہے کسی دن کھا نہ بیٹھے"۔

"جی، آئندہ احتیاط کروں گا"۔ رومی نے گڑیا کے ہاتھ سے ٹیبلیٹ لے کر اماں کو دیں۔

"بیٹا، تمہارے لیے کھانا لے آؤں"۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"نہیں، نہیں اماں جی"۔ اماں کی تکلیف کے خیال سے رومی تڑپ اُٹھا۔ "ہم خود نیچے آ کر کھا لیں گے، آپ تکلیف نہیں کریں...... ابا کھا چکے......؟"

"ہاں، وہ سونے کے لیے چلے گئے ہیں"۔ اور ان کے پیچھے پیچھے گڑیا کی اُنگلی تھامے چلتے ہوئے وہ خود سے عہد کر رہا تھا کہ پہلی اور آخری بار تھی جو اس نے ابا سے بات کی تھی۔ اب اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ کیا کوئی بھی ایسا نہیں جو ابا کو سمجھا سکے۔ نرمی سے، سختی سے۔ اس گھر میں کوئی بزرگ بھی تو نہیں ہے۔ دادا جان، دادی جان کوئی تو ہوتا جس کا لحاظ وہ کرتے۔ اس نے ہوش اسی گھر میں سنبھالا تھا اور اپنی ساری زندگی میں اس نے دادا جان اور دادی جان کو یہاں آتے کم ہی دیکھا تھا۔ بس دو یا تین بار ہی وہ آئے ہوں گے۔ گڑیا کی پیدائش پر، اس کے اور گڑیا کے عقیقے پر یا پھر ایک بار جب دادی جان بیمار تھیں اور یہاں اسپتال میں داخل تھیں۔

اماں، دادی جان کے پاس اسپتال میں رہتی تھیں اور وہ دادا جان کے ساتھ شام کو انہیں ملنے اسپتال جاتا تھا۔ دادا جان کتنے مزے کی باتیں کرتے تھے، وہ ان کے ساتھ بہت خوش تھا، پھر دادی جان ٹھیک ہو کر گاؤں چلی گئیں اور پھر اس کے بعد وہ کبھی یہاں نہیں آئی تھیں، نہ ہی دادا جان۔ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ یہاں ان کے پاس رہیں۔ جب بھی ان کا فون آتا، وہ انہیں اپنے ہاں آ کے رہنے کی دعوت ضرور دیتا تھا اور وہ ہنس کر ٹال دیتے۔

ان دنوں وہ عید پر گاؤں جایا کرتے تھے اور یہ دن بھی اس کے لیے یادگار دن ہوتے تھے۔ وہ دادا جان کے ساتھ پورے گاؤں میں گھومتا، پھرتا، کھیتوں میں جاتا، گنے توڑ کر کھاتا...... مکئی کے بھٹے ماسی ہاجراں سے آگ پر بھنوا کر ان پر لیموں اور نمک مرچ چھڑک کر کھاتا۔ یہ سب اسے بہت فیسی نیٹ کرتا تھا پھر دادی جان فوت ہو گئیں۔ وہ بہت رویا تھا، اسے یاد تھا جب وہ لوگ واپس آ رہے تھے تو اماں نے ابا سے التجا کی تھی۔

"ابا اب اکیلے رہ گئے ہیں۔ ہم انہیں ساتھ نہ لے جائیں"۔

"ہم نے کوئی عمر بھر کی خدمتوں کا ٹھیکا نہیں لے رکھا احمق عورت، کبھی جو عقل کی بات کی ہو"۔ ان کا وہی طرزِ تخاطب تھا۔

"اولاد آخر کس دن کے لیے ہوتی ہے؟"

"ہوں، اولاد......" انہوں نے کتنی نفرت سے کہا تھا اور دادا ابا کی اُنگلی پکڑے اندر آتے ہوئے اس نے دادا ابا کی طرف دیکھا تھا جن کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ اندر جانے کے بجائے وہاں سے واپس مڑ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ صرف ایک بار گاؤں گئے تھے، دادی جان کی برسی پر، تین سال پہلے...... تب گڑیا صرف دو سال کی تھی۔

تین سال ہو گئے تھے اس نے دادا جان کو نہیں دیکھا تھا اور تین سال سے وہ گاؤں نہیں گئے تھے۔ اماں نے ایک دو بار کہا بھی تھا تو ابا نے منع کر دیا تھا۔

"تمہیں بہت شوق ہے دھول مٹی کھانے کا تو چلی جاؤ۔ میں بھی دو چار روز سکھ سے رہ لوں گا لیکن میرے بچوں کو مت لے کر جانا وہاں"۔ اور اماں نے تو کبھی اپنی مرضی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ابا کی مرضی پر سر جھکا دیتی تھیں لیکن وہ تو اپنی مرضی کر سکتا تھا نا...... اس نے آخری نوالہ منہ میں ڈال کر پلیٹ کھسکا دی۔

"ارے بیٹا، بس یہ فرائی چکن لے لو نا تمہیں تو بہت پسند ہے"۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی پلیٹ خالی تھی اور وہ گڑیا کو لقمے بنا بنا کر کھلا رہی تھیں۔ اپنے ہی

دھیان اور سوچوں میں گم اس نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ اماں نے اپنی پلیٹ میں کچھ ڈالا ہی نہیں تھا۔

"اماں جی......" وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا پھر اپنے ہاتھوں سے ان کی پلیٹ میں چکن ڈالا۔

"ارے ارے بیٹا، مجھے بالکل بھوک نہیں ہے"۔

"بھوک نہیں ہے تو پھر بھی تھوڑا سا کھا لیں"۔ اس نے نوالہ بنایا۔ "منہ کھولیں"۔

"رومی!" انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور ان کے رخساروں پر بہنے لگے۔

"اماں جی نہ روئیں......نہیں تو گڑیا بھی روئے گی"۔ گڑیا نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے۔

"میں نہیں روتی چندا......جس ماں کا رومی جیسا بیٹا اور گڑیا جیسی بیٹی ہو، وہ بھلا کیوں روئے گی، میری جان"۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا لیکن آنسو تھے کہ بہے چلے آ رہے تھے اور رومی ایک بار پھر عہد کر رہا تھا کہ وہ اماں کو ایک روز ضرور ایسی زندگی دے گا جس میں آنسو نہیں ہوں گے، صرف مسکراہٹیں ہوں گی۔

"اگلے روز وہ کالج جانے کے بجائے سیدھا بادامی باغ گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اکیلا گاؤں نہیں گیا تھا۔ ہمیشہ ابا اماں کے ساتھ گاڑی پر جاتا تھا۔ آج پہلی بار وہ اکیلا گاؤں جا رہا تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے گاؤں میں کون سی بس جاتی ہے اور کہاں سے جاتی ہے۔ دو چار لوگوں سے پوچھنے کے بعد وہ بالآخر مطلوبہ بس تک پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے اس کے گاؤں کا رستہ صرف گھنٹے بھر کا تھا۔ اس نے صبح کالج آتے ہوئے اماں کو بتا دیا تھا کہ اسے ایک دوست کے ساتھ کہیں جانا ہے، اس لیے دیر ہو جائے گی۔ اسے دادا جان سے ملنا تھا، وہی تھے جو ابا کو سمجھا سکتے تھے اور تین سال بعد وہ دادا کے سامنے کھڑا تھا۔ ان تین سالوں میں وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے اور پھر کتنی ہی دیر تک اسے اپنے کمزور بازوؤں میں لیے کھڑے رہے تھے۔

"تمہارے ابا سے کچھ دیر پہلے ہی بات ہوئی تھی لیکن انہوں نے تمہارے آنے کا نہیں بتایا"۔ دادا اسے یونہی بازو کے حلقے میں لیے اندر بڑے کمرے میں آئے تھے۔

"میں انہیں بتا کر نہیں آیا"۔

"ارے کیوں......؟" دادا پھر حیران ہوئے تھے۔

"مجھے آپ سے ملنا تھا"۔

"خیریت ہے نا بیٹا؟" وہ پریشان سے ہو گئے تھے۔

"دادا جان آپ میرے ساتھ چلیں، ہمارے ساتھ ہمارے گھر رہیں۔ ہمیں آپ کی سخت ضرورت ہے......آپ ہوں گے تو شاید ایسا نہ ہو جیسا تماشا ہر روز ہوتا ہے"۔

"کیسا تماشا بچے......؟" دادا جان ابھی تک حیران تھے۔

"آپ نہیں جانتے دادا جان، ابا ہر روز کس بُری طرح اماں کی بے عزتی کرتے ہیں"۔ وہ ہولے ہولے بتاتا چلا گیا۔ دادا جان نے بڑی خاموشی سے اس کی ساری بات سنی تھی اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"میرے جانے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا بیٹا، بلکہ شاید وہ مجھے سنانے کے لیے اور زیادہ ری ایکٹ کرے......میں اس لیے تو وہاں نہیں جاتا۔ نہیں دیکھ پاتا میں بینا کی یہ حالت...... مرتی ہوئی بہن سے وعدہ کیا تھا میں نے کہ بینا کا ہمیشہ خیال رکھوں گا لیکن وعدہ نہیں نبھا پایا۔ اس سے تو اچھا تھا وہ ددھیال میں ہی رہتی اور کسی چاچے تائے کے بیٹے سے اس کی شادی ہو جاتی۔ پر میں نے سوچا تھا کہ میرا حبیب اتنا پڑھا لکھا ہے، اتنا بڑا افسر ہے اور اس کے گھر میں آ کر کوئی غیر کیوں عیش کرے، میری بینا کیوں نہیں۔ پر مجھ سے بڑی بھول ہوئی پتر"۔

"ابا ایسے کیوں ہیں دادا جان؟" اس نے وہی سوال کیا جو وہ اماں سے کیا کرتا تھا۔

"ہماری غلطی ہے بیٹا، ہم نے اسے بہت لاڈ دیا، سر پر چڑھایا، ہمہ وقت اس کی تعریفیں کر کر کے اسے خود پسند بنا دیا۔ تمہاری دادی تو اس کے گرد پروانے کی طرح چکراتی تھی۔ ہماری اولاد نہیں تھی۔ ہم ترسے ہوئے تھے اولاد کی محبت کے لیے، اس لیے جب میں اسے لے کر آیا تو تمہاری دادی تو مانو پاگل ہو گئی تھی۔ میری گود میں تو مانو چاند کا ٹکڑا آ گیا ہے۔ وہ ہر ایک سے کہتی پھرتی تھی"۔

"کہاں سے لائے تھے انہیں آپ؟" رومی نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک یتیم خانے سے۔ وہ ہماری اولاد نہیں تھی لیکن ہم نے اسے اولاد سے بڑھ کر چاہا......ہم نے اپنی ساری توانائیاں اور دولت اس کی پرورش پر خرچ کر دی اور اپنی دانست میں اس کے لیے ایسی لڑکی کا انتخاب کیا جو لاکھوں میں ایک تھی لیکن اس نے کہا، ہم اس کے سگے ماں باپ نہیں تھے اس لیے ایسی لڑکی ڈھونڈی جو اس کے قابل نہیں تھی۔ اس نے ہماری برسوں کی ریاضت لمحوں میں ضائع کر دی"۔ رومی نے جو اس انکشاف سے حیرت زدہ سا بیٹھا تھا، چونک کر انہیں دیکھا۔

"آپ نے شادی سے پہلے ان سے پوچھ لیا تھا دادا جان؟"

"پوچھا تھا بیٹا لیکن اس نے انتخاب کا حق ہمیں دے دیا تھا۔ ہم تو اس کی فرمانبرداری پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ وہ مینا کو ناپسند کر دے گا۔ پتا نہیں کس نے اس کے دل میں یہ خناس پیدا کر دیا تھا کہ مینا کا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں ہے۔" "تمہاری ماں دُنیا کی بہترین عورتوں میں سے ہے رومی پتر"۔

"میں جانتا ہوں دادا جان لیکن ابا تو ہر لمحہ انہیں ڈی گریڈ کرتے رہتے ہیں اور ان کی عزتِ نفس مجروح کرتے ہیں جیسے وہ کوئی بہت حقیر مخلوق ہوں"۔

"میں سمجھاؤں گا، بات کروں حبیب سے۔ دو چار روز تک چکر لگاؤں گا میں"۔

انہوں نے وعدہ کیا تھا لیکن وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکے تھے۔ رومی کے گاؤں سے واپس آنے کے دو دن بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

"نہیں"۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اماں کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کتنے پلان بنا ڈالے تھے۔ دادا جان آئیں گے تو وہ انہیں کچھ دنوں کے لیے روک لے گا۔ جتنی دیر وہ وہاں رہا تھا کتنا تحفظ کا احساس ہوا تھا اسے جیسے وہ کسی گھنے درخت کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں تلے بیٹھا ہو اور کتنا بدنصیب تھا اس کا باپ جس نے خود کو اس چھاؤں سے محروم کر رکھا تھا۔ اس نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ اگر ابا نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو وہ اماں اور گڑیا کو لے کر گاؤں چلا جائے گا دادا جان کے پاس۔ آخر ابا نے بھی تو اسی گاؤں میں رہ کر اتنا زیادہ پڑھ لیا تھا، وہ بھی پڑھ لے گا۔

"احمق عورت خود بھی روئے چلی جا رہی ہے اور اسے بھی رُلا رہی ہے۔ بتاؤ اسے کہ کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا اس کا، اس سے کچھ نہیں لگتا تھا وہ اس کا"۔ تب اماں نے رومی کو الگ کرتے ہوئے ایک شکایتی نظر ان پر ڈالی تھی۔ وہ جو کبھی نہیں بولی تھیں، آج چپ نہیں رہ سکی تھیں۔

"آپ کے حوالے سے نہ سہی، میرے حوالے سے تو اس کا رشتہ ہے۔ دادا نہ سہی، نانا تو لگتے ہیں، سگے ماموں ہیں میرے"۔

"اوہ ہاں، بھول گیا تھا تمہیں ہی تو میرے سر منڈھنے کے لیے انہوں نے پالا تھا مجھے"۔ وہ تلخی سے کہتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئے تھے اور رومی اماں کو گلے لگا کر تسلی دینے لگا تھا۔

☆☆☆

"آپ کا بہت بہت شکریہ"۔ یسمل برآمدے میں تخت کے پاس کھڑی تھی اور نوشیرواں ذرا فاصلے پر کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برآمدے میں پیلی روشنی کا بلب جل رہا تھا اور اس کی

روشنی یسمل کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا سا سفید سادہ دوپٹہ نماز کے انداز میں لپیٹے ہوئے تھی اور نوشیرواں کو وہ اس وقت کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر وہ گھبرائی اور پیچھے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا تو نوشیرواں نے چونک کر اس سے نظریں ہٹا لیں اور اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"شکریہ کیسا یسمل...... میں نے ایسا کیا کیا ہے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا تھا کہ......اور ویسے بھی"۔ اس نے پھر اس پر ایک نظر ڈالی۔ "مجھے تو اماں جان نے ڈاکٹر کو لانے کے لیے کہا تھا، آپ نے نہیں......سو آپ اماں جان کا شکریہ ادا کریں"۔

"جی ان کا بھی شکریہ ادا کروں گی"۔ وہ دوپٹے کا کونا اُنگلی پر لپیٹتے ہوئے سادگی سے کہہ رہی تھی اور نوشیرواں عادل کا دل زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کے لیے یوں دھڑکا تھا کہ وہ خود حیران سا رہ گیا تھا۔

"لیکن آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی تو میرا فرض بنتا ہے سر"۔

"سر"۔ اس نے بُرا سا منہ بنایا۔ "آپ اتنی فارمل کیوں ہیں یسمل بی بی؟"

"اور آپ اتنے بے تکلف کیوں ہیں"۔ یسمل نے سوچا تھا لیکن کہا نہیں...... یہ دوسری بار تھا جب وہ اس سے مل رہی تھی اور دونوں بار ہی اس نے یسمل کی مدد کی تھی۔ اماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ یک دم ہی ان کی سانس رُکنے لگی تھی۔ وہ گہری گہری سانس لے رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر میراں اماں کو آواز دی تھی۔

"اماں جان......اماں جان پلیز آ جائیں۔ اماں کو کچھ ہو گیا ہے"۔ روتے ہوئے اس نے کرسی پر چڑھ کر انہیں آواز دی تھی اور پھر بھاگ کر اماں کے پاس آئی تھی جو تخت پر لیٹی یونہی منہ کھولے گھٹی گھٹی سانس لے رہی تھیں۔

"اماں......اماں......اماں، مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا۔ اماں میں آپ کے بغیر اکیلی کیسے زندہ رہوں گی، مر جاؤں گی"۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑے رو رہی تھی، جب میراں اماں نے صحن کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تھا اور ان کے پیچھے نوشیرواں بھی تھا۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے اس کے قریب آئی تھیں۔

"ناں رو بچے، ناں۔ اللہ خیر کرے گا"۔ اور اماں نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اماں کو دیکھ رہی تھی جب میراں اماں نے مڑ کر نوشیرواں سے کہا تھا۔

''شیری بچہ جلدی سے گاڑی نکالو۔ امینہ بٹی کو اسپتال لے کر جانا ہے، جلدی بیٹا''۔
نوشیرواں وہاں سے واپس مڑ گیا تھا اور پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔
''دعا کرو بچے، اللہ تمہاری ماں کو صحت اور زندگی دے گا''۔ وہ تو بس خالی خالی نظروں سے اماں کو دیکھ رہی تھی جو بند آنکھیں کیے ساکت پڑی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز آتی جیسے اندر کہیں سانس رُک رہی ہو۔ میراں اماں پتا نہیں کیا کہہ رہی تھیں۔ اسے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا، تب میراں اماں نے خود ہی دروازے لاک کیے تھے، اسے چادر دی تھی اور نوشیرواں عادل دبلی پتلی کمزور سی اماں کو اپنے دونوں بازوؤں میں اُٹھا کر گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ وہ اور میراں اماں اس کے ساتھ تھیں۔ اماں نے یک دم آنکھیں کھول دی تھیں لیکن ان کی سانس اسی طرح آرہی تھی، رُک رُک کر۔ اس نے بہت احتیاط سے اماں کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا تھا، ساتھ وہ بیٹھی تھی اماں کو سہارا دیے اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

اس وقت مروان اسے بے حد یاد آرہا تھا۔ میراں اماں آگے بیٹھی تھیں نوشیرواں کے ساتھ اور پھر اسپتال میں نوشیرواں ہی انہیں یونہی بازوؤں میں اُٹھائے تیز تیز ایمرجنسی کی طرف چلا تھا اور وہ اس کے پیچھے تقریباً بھاگ رہی تھی۔ اماں کو دورے کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا۔ دو تین گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ گھر آئے تھے۔

''اگر نوشیرواں اور میراں اماں نہ ہوتیں تو......'' اس نے جھرجھری لے کر نوشیرواں کو دیکھا۔

''میں سچ سچ آپ کی بہت شکرگزار ہوں۔ مرواں کو بتاؤں گی تو وہ بھی آپ کا ممنون ہوگا۔ اگر آپ نہ ہوتے تو پتا نہیں اماں کو کیا ہو جاتا''۔ اس کی آواز بھرا گئی اور پلکیں بھیگنے لگیں۔

''اوں ہوں...... اب مزید برسات نہیں ہوگی۔ میں نے آپ کا اور مروان کا شکریہ قبول کرلیا، خوش......'' یسمل نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''مروان کو اماں سے بہت محبت ہے، مجھ سے بھی زیادہ...... وہ تو آپ کا بہت احسان مند ہوگا''۔

''میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے''۔ نوشیرواں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں، بہت دیر ہوگئی ہے، آپ جائیں''۔ وہ جلدی سے بولی اور نوشیرواں نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہرے اور یہ بات اس نے اسی وقت محسوس کرلی تھی جب میراں اماں نے کہا تھا۔

''بچہ تم گھر جاؤ، آرام کرو۔ میں رات یسمل بچی کے پاس ہی رہوں گی۔ رات خدانخواستہ امینہ کی طبیعت خراب ہوئی تو اکیلے گھبرا جائے گی''۔ یسمل جو اماں کی چارپائی پر بیٹھی ان کے بازو دبا رہی تھی، یک دم کھڑی ہوگئی تھی۔

''آئیں میں دروازہ بند کرلیتی ہوں''۔

''اس منافقت بھری دنیا میں رہتی اس لڑکی میں رتی بھر منافقت نہیں ہے۔ کتنی خالص لڑکی ہے''۔ بیرونی گیٹ کی طرف جاتے ہوئے نوشیرواں نے سوچا تھا۔ ''کیا یہ لڑکی واقعی اسی دنیا کی باسی ہے''۔ اور مڑ کر اسے دیکھا تھا جو دیوار پر پڑتے اس کے سائے پر نظریں جمائے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ گیٹ لاک کر کے وہ کھوئی کھوئی سی واپس آئی۔ نوشیرواں عادل آج اسے کئی بار مروان کی طرح لگا تھا۔ اس میں کچھ ایسا تھا ضرور جو مروان کی طرح تھا۔ شاید اس کے بالوں کا کٹ...... اس کے چلنے کا انداز اور...... اور پتا نہیں کیا۔

وہ کمرے میں آئی تو اماں دوائیوں کے زیر اثر پُرسکون نیند سو رہی تھیں۔ ان کی سانس بھی اب ٹھیک آرہی تھی اور میراں اماں کرسی بیڈ کے نزدیک رکھے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے بیڈ جھاڑا، تکیہ درست کر کے رکھا۔

''اماں جان آپ اِدھر بیڈ پر آکر لیٹ جائیں...... میں اماں کے پاس بیٹھتی ہوں''۔

''تم نے کھانا کھالیا بیٹا؟''

''اوہ...... آپ کے لیے کھانا لاؤں؟''

''نہ بیٹا، میں نے تو مغرب کے بعد کھانا کھالیا تھا۔ اب تو عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی جب تم نے آواز دی۔ چلو تم اُٹھو شاباش، پہلے کھانا کھالو پھر آکر لیٹ جاؤ۔ تمہاری اماں سکون سے سو رہی ہیں''۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ سے اُٹھایا۔

''اچھا، آپ تو لیٹ جائیں، بہت دیر ہوگئی ہے۔ آپ تو بہت سویرے جاگتی ہیں''۔ وہ سر ہلا کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ یسمل ایک نظر اماں پر ڈال کر باہر چلی گئی، پھر کچن میں جا کر دودھ گرم کر کے دو کپ لے کر کمرے میں آئی۔

''اماں جان یہ دودھ لے لیں''۔

''ارے بیٹی، یہ تم نے کیوں تکلف کیا۔ شیری بھی ایسے ہی کرتا ہے۔ جی چاہے یا نہ چاہے، وہ رات کو سونے سے پہلے ضرور میرے لیے دودھ گرم کر کے لے آتا ہے''۔ وہ محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یسمل نے اسٹور سے میٹرس نکال کر اماں کے بیڈ کے پاس نیچے کارپٹ پر بچھایا

اور میٹرس پر بیڈ شیٹ بچھا کر تکیہ رکھ کر اماں کی طرف دیکھا۔ وہ اسی سکون سے سو رہی تھیں۔ تب میراں اماں کو چادر اوڑھا کر لیٹنے سے پہلے اس نے میراں اماں سے کہا۔

''آپ کو دبا دوں اماں جان''۔

''ارے نہیں بچہ سو جاؤ تم''۔ انہوں نے شفقت بھری نظر اس پر ڈالی اور مسکرائیں۔

''تم بالکل زینبیے کی طرح ہو۔ وہ بھی رات کو سونے سے پہلے ضرور میرے کمرے میں آتی تھی اور پوچھتی تھی۔ آپ کو دبا دوں بڑی اماں......''

''زینبیے کون تھی؟'' یسمل نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میری پوتی تھی۔ بہت پیاری، بہت خوب صورت...... شکل کی بھی، دل کی بھی۔ صرف سترہ سال کی عمر تھی اس کی تب......''

''کیا وہ بھی......؟'' یسمل کا دل کانپ گیا۔

''ہاں وہ بھی بچے...... پورے سترہ بندے تھے''۔

یسمل کا دل چاہا، وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ یہ میراں اماں کا دل تھا کہ بچھڑ کر چھوڑ کر جانے والوں کا نوحہ، غم اور ان کا حوصلہ۔ ان کا دل جیسے پانی ہو کر بہنے لگا۔ وہ یسمل تھی جسے کہانیوں کے دکھ رلاتے تھے اور یہ تو کہانی نہیں تھی۔ سامنے جیتی جاگتی میراں اماں تھیں جن کا سینہ چھلنی تھا لیکن جو اس کے لیے چھپر چھاؤں بنی ہوئی تھیں۔ سرخ و سپید رنگ اور سفید بالوں والی میراں اماں کا دل کیسا سمندر تھا۔ اس نے عقیدت سے انہیں دیکھا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔

''اماں جان......'' اور آنسو اس کی آنکھوں سے چشموں کی طرح پھوٹ نکلے۔

''ارے...... ارے میرا بچہ مت روؤ''۔ وہ اسے ہولے ہولے تھپکنے لگیں لیکن ایسا کرتے ہوئے خود ان کی آنکھیں برس پڑی تھیں اور کتنے سارے دنوں بعد وہ یوں روئی تھیں۔

''یا اللہ میرے شیری کو سلامت رکھنا۔ میرے گل کو صحت و زندگی دینا، وہ جہاں بھی ہو۔ میرے خاندان کے یہ نام لیوا زندہ رہیں، میرے خاندان کی نسل باقی رہے مولا''۔ دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے انہوں نے اپنے اور اس کے آنسو پونچھے۔

''بس میرا بچہ بس جا منہ ہاتھ دھو کر سو جا۔ کیسا سونے سے ترشا دل ہے تیرا...... بس تو جانے والوں کے لیے ان کے حق میں دعا کیا کر۔ اللہ انہیں جنت کی ہوائیں دے، ان کی قبریں کشادہ کرے''۔ اور منہ ہاتھ دھو کر جب وہ میٹرس پر آ کر لیٹی تو میراں اماں چہرے پر دوپٹا ڈالے کروٹ کے بل لیٹی تھیں۔

''شاید انہیں روشنی میں نیند نہیں آتی ہو گی''۔ اس نے سوچا اور اُٹھ کر لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلا دیا لیکن سونے سے پہلے اس نے اماں کو دیکھا تھا وہ اسی طرح گہری اور پُرسکون نیند سو رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ میٹرس پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ حالانکہ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ ابھی مردان کو بتائے کہ میراں اماں کتنی دُکھی ہیں۔ پہاڑ سے غم کا بوجھ سینے پر دھرے سب کے دُکھ درد میں شریک ہوتی ہیں۔ اسے تو بچپن سے عادت تھی اپنی ہر بات مردان کو بتانے کی لیکن میراں اماں لائٹ جلنے سے شاید ڈسٹرب ہو جاتیں۔ وہ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ میراں اماں اور ان کے خاندان کے ان سترہ بندوں کے متعلق سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ آج بہت دنوں بعد اس نے پھر وہی خواب دیکھے تھے جو اکثر بچپن میں دیکھتی تھی اور مردان ان خوابوں پر ہنستا تھا۔

اس نے ''ایک مکان دو دیواروں'' کے درمیان امجد کو دیکھا تھا۔ بوڑھی چالاک نانی نے صحن کے بیچوں بیچ دیوار کھڑی کر دی تھی اور دیوار کے اس طرف تنہا کھڑا امجد جو اپنی شرارتوں سے سب کو زچ کر دیتا تھا، رو رہا تھا، وہ بند مٹھیوں سے آنسو پونچھتا جاتا تھا اور آنسو تھے کہ بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اس نے قریب جا کر امجد کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے تھے۔ اسے تسلی دی تھی۔ تم اکیلے نہیں ہو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ اور امجد مسکرا دیا تھا پھر اس نے سینڈریلا کو تسلی دی تھی جس پر سوتیلی ماں ظلم کر رہی تھی۔ اس نے سنو وائٹ کو زہریلا سیب کھانے سے منع کیا تھا اور پتا نہیں صبح تک اس نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے اور پھر اس نے مردان کو دیکھا تھا، وہ دوڑ کر مردان سے لپٹ گئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے مسکرا رہا تھا پھر اس نے پیچھے مڑ کر کسی کو بلایا تھا۔

''عادل...... اس سے ملو میری چھوٹی بہن یسمل'' اور سر پر دوپٹہ درست کر کے وہ جلدی سے مردان سے الگ ہوئی تھی اور اُدھر دیکھا تھا۔ وہ نوشیرواں عادل تھا جو مسکراتے ہوئے ایک ٹانگ پر تھوڑا سا دباؤ ڈالتا چلتا ہوا مردان کے قریب آ کھڑا ہوا تھا اور وہ جو نوشیرواں کو دیکھ کر اکثر سوچتی تھی کہ بھلا اس میں اور مردان میں کیا ایک جیسا ہے...... دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر یک دم چونکی تھی۔ دونوں کے بالوں کا کٹ ایک جیسا تھا۔

''عادل یار اس کا خیال رکھنا، میری یہ بہن بہت نازک دل ہے۔ کہانیاں پڑھ کر روتی اور ہنستی ہے''۔ پھر اس نے یسمل کا ہاتھ پکڑ کر عادل کی طرف بڑھایا تھا کہ یک دم کسی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ اُٹھ کر میٹرس پر بیٹھ گئی۔ میراں اماں واش روم سے نکل رہی تھیں، شاید یہ دروازہ کھلنے کی آواز تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا پھر کمرے میں نظر دوڑائی، اسے لگا

جیسے ابھی ابھی مروان اور نوشیرواں کمرے سے باہر گئے ہوں۔ اماں اس کی طرف کروٹ کیے سو رہی تھیں۔ ساری رات وہ سکون سے سوتی رہی تھیں۔ بس ایک بار شروع رات میں پانی مانگا تھا۔ اس نے میراں اماں کی طرف دیکھا جو اَب جائے نماز پر بیٹھ چکی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے کیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''جلدی سے وضو کرلو بیٹا، وقت کم ہے۔ میری آنکھ بھی آج دیر سے کھلی''۔

''جی''۔ وہ تیزی سے واش روم کی طرف بڑھ گئی لیکن جاتے جاتے اس نے دیکھ لیا تھا کہ میراں اماں کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور چہرہ ستا ہوا تھا۔

''کبھی کبھی یوں اچانک بچھڑ جانے والوں کا دُکھ کتنا ستاتا ہے''۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے بھی وہ مسلسل میراں اماں کے متعلق سوچ رہی تھی۔

''اگر میراں اماں یہاں پڑوس میں آکر نہ رہتیں تو میں کیا کرتی۔ میراں اماں نے کتنا ساتھ دیا ہے میرا جب جب اماں بیمار ہوئی ہیں تب تب۔ شکر ہے اللہ کا میراں اماں یہاں آکر رہنے لگیں۔ نہیں، یہ میں کیا کہہ رہی ہوں''۔ اس نے ہولے سے اپنے رخسار پر تھپڑ مارا۔ ''کاش میراں اماں کو کبھی یہاں نہ آنا پڑتا۔ کبھی نہیں، وہ ہمیشہ وہاں رہتیں اپنے گھر میں اپنے لوگوں کے ساتھ''۔ وضو کرکے وہ بہت افسردہ دلی کے ساتھ باہر آئی تھی۔ میراں اماں نماز پڑھ کر فارغ ہو چکی تھیں اور اب تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ وہ جاکر جائے نماز پر کھڑی ہوگئی۔ نماز پڑھ کر اس نے جلدی جلدی چائے بنائی تھی اور جب ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے وہ کمرے میں آئی تو میراں اماں، اماں کے بیڈ پر بیٹھی تھیں اور اماں کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لیے ہولے ہولے کچھ کہہ رہی تھیں۔ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے مسکرا کر اماں کی طرف دیکھا۔

''آپ جاگ گئیں اماں جی، طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟'' اماں نے سر ہلایا تھا۔

''آپ چائے لے نا اماں جان''۔

''شیری بھی جب صبح صبح میں نماز پڑھ کر فارغ ہوتی ہوں تو چائے بنا کر لے آتا ہے''۔ میراں اماں مسکرائی تھیں۔

میراں اماں کو چائے دے کر وہ اماں کو واش روم لے گئی۔ اماں چپ چاپ کسی روبوٹ کی طرح اس کے ساتھ چلتی ہوئی واش روم گئی تھیں اور جب وہ ان کا منہ ہاتھ دُھلا کر انہیں باہر لائی تو میراں اماں چادر اوڑھے کھڑی تھیں۔

''ارے، آپ جارہی ہیں اماں جان...... نہیں آپ ناشتہ کرکے جائیں گی۔ آپ

ناشتے میں کیا لیں گی پراٹھا آملیٹ یا......''

''نہیں، میں ابھی ناشتہ نہیں کروں گی۔ چائے پی ہے ابھی تو...... اب نو دس بجے تک ناشتہ کروں گی''۔

''تو ٹھیک ہے میں دس بجے ناشتہ بنا دوں گی آپ کا''۔

''نہیں بچہ شیری نے اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے۔ وہ ناشتے پر میرا انتظار کررہا ہوگا''۔

''میں بنا دیتی ہوں ان کے لیے ناشتہ''۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ میراں اماں مسکرائی تھیں اور یہ مدھم سی مسکراہٹ ان کے سرخ و سپید چہرے پر کتنی جچتی تھی۔

''نہیں سیمل بچہ۔ اس نے ناشتہ تو بنا ہی لیا ہوگا۔ جب یہاں ہوتا ہے تو مجھے ناشتہ کب بنانے دیتا ہے، میں تو ابھی تلاوت سے فارغ بھی نہیں ہوتی تو وہ ناشتہ تیار کرکے لے آتا ہے۔ پریشان مت ہونا، میں شیری کے جانے کے بعد چکر لگاؤں گی''۔

''وہ اسلام آباد کیوں جارہے ہیں، جاب کرتے ہیں وہاں؟''

''نہ بچہ......'' ان کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی تھی اور آنکھوں سے جیسے کوئی گہرا درد جھلکنے لگا تھا۔

''وہ تو گل کے لیے جارہا ہے، اس کا پتہ کرنے...... میرا پوتا گل، ریحان گل نام ہے اس کا...... ادھر پشاور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ گیارہ ماہ ہوگئے ہیں، کچھ پتہ نہیں اس کا''۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی اور سیمل جیسے وہیں منجمد ہوگئی تھی۔ بھرے خاندان کے بچ جانے والے تین بندے اور اس میں سے بھی......

''اور پتا نہیں ریحان گل زندہ بھی ہوگا یا کسی نے اسے......''

''نہیں''۔ اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور میراں اماں کی طرف دیکھا جو چادر اوڑھے دروازے کی طرف مڑ چکی تھیں۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل دی۔

☆☆☆

دادا جان کی اس طرح اچانک موت نے رومی کو بالکل خاموش کردیا تھا۔ بہت سے دن وہ بالکل چپ رہا۔ گڑیا اور اماں سے بھی کم باتیں کیں لیکن پھر ہولے ہولے سنبھل گیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ ابا سے کچھ کہنا فضول ہے۔ وہ ایک خود پسند اور مغرور شخص ہیں جنہیں اپنے سامنے سب حقیر لگتے ہیں، کمتر اور چھوٹے۔ حالانکہ وہ خود کیا تھے، اگر دادا جان انہیں یتیم خانے سے نہ لاتے تو آج پتہ نہیں کہاں گلیوں میں رُل رہے ہوتے۔ اس روز وہ کالج سے جلدی آگیا تھا۔ اس

نے گڑیا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج اسے آئس کریم کھلانے لے جائے گا اور جب اماں کو گڑیا کو تیار کروانے کا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گیا تو کچھ ہی دیر بعد اس نے ابا کی دھاڑتی آواز سنی تھی۔

"احمق عورت کیا کہا تھا صبح میں نے تم سے"۔ اماں نے پتا نہیں کیا کہا تھا۔ ان کی مدھم آواز اس کے کانوں تک نہیں آئی لیکن ابا کی آواز پھر آئی تھی۔

"لے جاؤ انہیں اور آگ میں جھونک دو اور وہ بلیک پینٹ اور پنک دھاری والی شرٹ استری کروا کے لاؤ"۔

"اماں گڑیا کو تیار کر رہی تھیں"۔ یک دم ہی اسے خیال آیا اور وہ تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ گڑیا صوفے کے پیچھے چپکی کھڑی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں خوف سے مزید پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا جو زمین پر پڑے ابا کے کپڑے اُٹھا رہی تھیں۔ وہ سیدھا گڑیا کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے کے پیچھے سے باہر لایا۔ صوفے پر پڑا اس کا ریڈ کیچر اور برش اُٹھایا اور ابا کی طرف دیکھے بغیر گڑیا کا ہاتھ پکڑے واپس سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اماں ابا کے کپڑے لیے لاؤنج سے نکل رہی تھیں جب آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور عین اسی وقت ابا نے ایش ٹرے اُٹھا کر غصے سے لاؤنج سے نکلتی اماں پر پھینکی۔ کرسٹل کی ایش ٹرے ایک چھناکے سے ٹوٹی تھی۔ وہ بغیر رُکے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ گڑیا پنک فراک میں پری لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کا خوف اسے اندر سے رُلا رہا تھا لیکن وہ تیار کرتے ہوئے گڑیا سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بالوں میں برش کر کے کیچر لگا کر وہ نیچے آیا تو ابا بڑے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ دھرے ٹی وی پر کوئی انڈین شو نہایت انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈال کر اماں کی طرف متوجہ ہوا تھا، جو خود ہی ٹرالی دھکیلتی آ رہی تھیں۔

"اماں جی"۔ اسے غصہ آیا۔ "نازو کہاں مر گئی ہے، وہ چائے لے آتی، آپ تیار ہو جاتیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا"۔

"وہ بیٹا"۔ انہوں نے گھبرا کر حبیب خان کی طرف دیکھا۔ "میں جا کر کیا کروں گی بیٹا، تم گڑیا کو لے جاؤ"۔ ٹرالی ابا کے سامنے کھڑی کر کے انہوں نے جلدی سے پلیٹ انہیں پکڑائی تھی، جسے انہوں نے نہایت نخوت سے پکڑ لیا اور اب تنقیدی نظروں سے ٹرالی کا جائزہ لے رہے تھے۔ نگٹس، چکن پیٹیز، شامی کباب، رول سب کچھ ہی ان کی پسند کا تھا۔ وہ آفس سے آ کر اکثر کھانا نہیں کھاتے تھے، اس لیے اماں چائے پر خاصا تردد کرتی تھیں۔ کھانا وہ رات کو ہی کھاتے

تھے اور اچھے کھانے کے شوقین تھے۔

"نہیں اماں جی، آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے"۔ اس نے گڑیا کا ہاتھ چھوڑ کر قریب آ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "آئیں، ایسے ہی ٹھیک ہے، بس چادر لے لیں"۔ اماں نے سوالیہ نظروں سے حبیب خان کی طرف دیکھا۔

"وہ گڑیا آئس کریم کھانے کی ضد کر رہی تھی اور کہتی ہے اماں بھی ساتھ چلیں"۔

"تو جاؤ مرو یہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو اسٹیچو بن کر"۔ انہوں نے ایک تمسخر بھری نظر اُن پر ڈالی تھی۔ جب اماں چادر لینے باہر چلی گئی تھیں۔ اس نے بغیر ابا سے پوچھے گاڑی کی چابی اُٹھائی تھی تو اسی تمسخر بھری نظروں سے روحی کو دیکھتے ہوئے ہنسے تھے۔

"یہ اپنی اماں کو تو لے کر جا رہے ہو، کوئی دوست وغیرہ مل گیا تو کیا کرو گے؟" روحی کی آنکھوں میں پہلے حیرت اُتری تھی پھر اس کا گندمی رنگ غصے کی اور غم کی زیادتی سے سرخ ہو گیا تھا۔

"مجھے اپنی اماں کے ساتھ چلتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے، مجھے اپنی ماں دنیا کی ساری عورتوں سے زیادہ خوب صورت لگتی ہے اور ہمیشہ اس بات پر غرور کرتا ہوں کہ میں ان کا بیٹا ہوں"۔ پھر ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر گڑیا کا ہاتھ پکڑے تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس روز اس نے پہلی بار اماں کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ وہ ہنسی تھیں اور وہ مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ آئس کریم کھاتے ہوئے کے ایف سی میں چکن پیٹیز کھائے اور پھر کافی ہاؤس میں آئس کافی پیتے ہوئے اس نے اماں کی آنکھوں میں خوشی کے جو ستارے دمکتے دیکھے تھے وہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور وہاں ہی کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ اب اپنی ماں اور بہن کا اسے خود خیال رکھنا ہے۔ گڑیا جو گھر میں ڈری سہمی رہتی تھی، اس وقت چہک رہی تھی اور اماں کی آنکھوں کا خوف اور چہرے پر چھائی بے بسی اور بے چارگی اس وقت کہیں نہیں تھی۔

"اماں جی......" ان کا ہاتھ اپنے توانا ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے سرگوشی کی تھی۔

"اب ہم ہر ویک اینڈ پر باہر آیا کریں گے"۔

"نہیں"۔ اماں ایک بار پھر سہم گئی تھیں۔

"تمہارے ابا بہت ناراض ہوں گے روحی، بہت خفا ہوں گے"۔

"ہوتے رہیں اماں جی"۔ اس نے لاپرواہی سے کہا تھا۔ "یہ چند گھنٹے جو ہم نے، آپ نے اور گڑیا نے گھر سے باہر گزارے ہیں، یہ ہماری زندگی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ یہ

تازہ ہوا کے جھونکے ہیں جو اس گھر میں نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے لیے خوشیوں کے چند لمحے تلاش کرنے کا حق ہے اور میں یہی حق استعمال کروں گا۔ آپ ابا کی پروا نہیں کریں"۔

اور وہ کیسے پروا نہیں کرتیں...... وہ رات جو انہوں نے گزاری تھی اس کی اذیت انہوں نے کیسے برداشت کی تھی، یہ وہی جانتی تھیں۔ اس رات بڑے دنوں بعد وہ ان کے کمرے میں آئے تھے۔ آج انہوں نے بچوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارہ تھا۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ یوں خوش ہوئی تھیں۔ بچوں کی خوشی کے خیال سے ان کی آنکھیں دمک رہی تھیں اور رخساروں پر جیسے رنگ سے بکھرے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھیں اور ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں اور مگن سی نگاہیں جھکائے تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی حبیب خان کی نظر اُن کے چہرے پر پڑی تھی اور وہ وہیں ٹھٹک کر رُک گئے تھے۔

یہ امینہ تھی ان کی بیوی، اتنی دل کش، ایک لمحہ حیرت تھا جس سے گزر کر وہ ان کے قریب آئے تھے اور پھر اپنی اُنگلیاں ان کے بازو میں چبھو دی تھیں۔ اذیت سے ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا لیکن حبیب خان کے ناخن ان کی کھال اُدھیڑ چکے تھے۔

"یہ رومی کو کیا سبق پڑھاتی رہتی ہو تم؟" انہوں نے ہونٹ بھینچ کر نگاہیں جھکالی تھیں۔

تب ان کی ٹھوڑی کے نیچے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا رکھ کر ان کا چہرہ اونچا کیا تھا۔

"بغاوت پر اُکسا رہی ہو میرے خلاف، میرے مقابلے پر کھڑا کرو گی اسے"۔ انہوں نے انگوٹھا ہٹا کر ایک تھپڑ ان کے رُخسار پر مارا تھا۔

"اب تو تڑی (زبان) بند ہو گئی ہے تیری۔ بول کیا کہا ہے تو نے اسے"۔ دایاں ہاتھ رخسار پر رکھتے ہوئے امینہ کا دل جیسے ہزاروں کرچیوں میں تقسیم ہوا تھا۔

"میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود ہی...... گڑیا کی وجہ سے......"

"اچھا......!" انہوں نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی اُنگلیاں ان کے کلائی میں چبھوئی تھیں۔

"بکواس کرتی ہو میرے ساتھ...... وہ میرا بیٹا ہے، اگر آئندہ کوئی پلاننگ کی تو طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا اور بچے چھین لوں گا تم سے"۔

"نہیں...... نہیں پلیز......" امینہ نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"میں منع کر دوں گی، نہیں جاؤں گی پھر کبھی"۔ اور ان کے بازو سے ہاتھ ہٹا کر وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گئے تھے اور اب دوسری طرح کی اذیت شروع ہوئی تھی۔ ان کے گداز بازو پر چٹکی

بھرتے ہوئے ان کے ہونٹوں سے زہر نکلا تھا۔

"یہ آدھی آستین والی قمیص پہن کر کیا باہر مردوں کو دکھانے گئی تھی۔ کوئی نہیں دیکھتا تم پر"۔

"نہیں...... وہ میں نے تو چادر پہنی ہوئی تھی"۔ انہوں نے بہ مشکل سسکی کو ہونٹوں میں ہی دبایا تھا۔

"میری تو مجبوری ہے کہ تم میری بیوی ہو اور مجھے ایک دن اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے، ورنہ تم جیسی عورت پر میرے جیسا کوئی مرد تھوکتا بھی نہیں"۔ اور ان کا جی چاہا کہ وہ کہیں پھر آپ مجھے فارغ کیوں نہیں کر دیتے اور کسی من پسند عورت سے شادی کیوں نہیں کر لیتے لیکن ہمیشہ کی طرح وہ کچھ نہیں کہہ سکی تھیں اور بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی تھیں اور صبح انہوں نے رومی سے بازوؤں کے نیل اور کھرنڈ چھپانے کے لیے فل آستین کی شرٹ پہن لی تھی لیکن پھر بھی ناشتے کی ٹیبل پر رومی انہیں کھوجتی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔

"ابا نے کچھ کہا؟" چودھری حبیب خان جب ناشتہ کر کے اُٹھ گئے تو رومی نے پوچھا۔

"نہیں تو انہوں نے تو کچھ نہیں کہا"۔ انہوں نے نظریں نہیں اُٹھائی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ باپ بیٹا مقابل آ جائیں۔

"اچھا"۔ رومی کی گہری نظریں انہیں اندر تک اُترتی محسوس ہوئی تھیں۔

"اگر وہ کچھ کہیں تو آپ بھی جواب دیا کریں، یوں چپ سادھ کر نہ بیٹھا کریں، وہ اور بھی شیر ہوتے ہیں۔ بلاوجہ آپ پر ہاتھ اُٹھائیں تو آپ ان کا ہاتھ پکڑ لیں۔ لوگ ہم پر اس لیے زیادتی کرتے ہیں کہ ہم انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کرتے۔ ہم انہیں اپنے ساتھ زیادتی کرنے دیتے ہیں"۔ وہ آج انہیں نیا سبق پڑھا رہا تھا۔ انہیں یک دم رومی پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ ایسا کچھ بھی کبھی بھی نہیں کر سکیں گی۔

ماموں ممانی اور ماں کی لاڈلی امینہ جو ہر وقت چہکتی رہتی تھی اور ماموں پیار سے اسے مینا کہا کرتے تھے، حبیب کی زندگی میں آ کر ایسی چپ ہوئی تھی کہ کوئی بات کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچتی تھی۔ حبیب خان نے پہلے روز ہی اسے ریجیکٹ کر دیا تھا۔

"تم میرے قابل ہرگز نہیں تھیں۔ دراصل ابا نے مجھے پال کر جو احسان مجھ پر کیا تھا، اس کا بدلہ لے لیا ہے مجھ سے اور میں نے بھی تمہیں قبول کر کے وہ احسان چکا دیا ہے"۔ وہ حیران سی حبیب کو دیکھتی رہ گئی تھی، جس نے نظر بھر کر اسے دیکھا بھی نہیں تھا، حالانکہ اس کی سہیلیوں نے کتنی ہی بار اسے بتایا تھا کہ آج اس کے روپ پر نظر نہیں ٹھہر رہی۔ آج تو حبیب بھائی چاروں

شانے چت گر جائیں گے، تاب نہیں لاسکیں گے اس ملیح حسن کی۔اس روز اور اس کے بعد کتنی ہی بار انہوں نے سوچا تھا، وہ کتنی بدنصیب ہیں لیکن آج انہیں رومی کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ نہیں وہ تو بڑی خوش نصیب ہیں......ان کا بیٹا کتنا سجیلا اور کتنا بانکا تھا۔"یا اللہ رومی کو نظر بد سے بچانا"۔ انہوں نے فوراً ہی اس کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں۔

رومی سے وعدہ کر لینے کے باوجود وہ اپنے اندر ہمت پیدا نہ کرسکی تھیں اور جب اگلے ویک اینڈ پر رومی نے انہیں باہر چلنے کو کہا تو وہ سہم گئی تھیں۔اس رات کی اذیت رگ و پے میں زندہ ہوگئی تھی۔بازوؤں میں جلن ہونے لگی تھی جہاں اب بھی ناخنوں کے کھرنڈ موجود تھے۔

"نہ بیٹا، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔

"کیا ہوا؟" وہ پریشان ہوا تھا۔

"بس طبیعت اچھی نہیں ہے۔تم اور گڑیا چلے جاؤ لیکن ان کے بغیر دونوں کو زیادہ مزہ نہیں آیا تھا اور وہ دونوں ہی جلدی واپس آگئے تھے اور پھر جب اگلی بار بھی انہوں نے جانے سے انکار کیا تو رومی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اماں ابا سے خوف زدہ ہیں۔اس روز وہ گڑیا کو باہر سے گھما کر لے آیا تھا لیکن دوسرے روز شام کی چائے پیتے ہوئے اس نے اماں سے کہا تھا۔

"اماں آج رات باہر کھانا کھانے چلیں گے۔آپ تیار ہو جایئے گا" اور ابا کے حسد سے بگڑتے نقوش کو دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہوا تھا اور بہت دنوں بعد اس نے حبیب خان کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ بھی چلیں"۔

"میں"۔انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا اور نخوت سے ان کی گردن اکڑ گئی۔"میں اس عورت کے ساتھ باہر کسی ہوٹل میں کھانا کھانے جاؤں"۔

"یہ عورت آپ کی بیوی ہے"۔رومی کی آنکھوں میں غصہ......بل کھا رہا تھا۔"اور اپنے بیوی اور بچوں کے ساتھ کہیں باہر جا کر کھانا کھانا کوئی معیوب بات نہیں ہے"۔

"تمہیں لگتا ہے کہ یہ عورت میری بیوی بننے کے قابل تھی؟" ان کے نتھنوں سے جیسے دھواں نکل رہا تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ آپ میری ماں کے قابل نہیں تھے"۔اماں کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو گیا اور ان کے ہاتھوں کی لرزش رومی سے چھپی نہ رہ سکی تھی جبکہ وہ غصے سے ٹرالی کو ٹھوکر مارتے ہوئے کھڑے ہو گئے تھے۔ٹرالی اُلٹ گئی اور چیزیں نیچے کارپٹ پر بکھر گئی تھیں۔

"میں اس عورت کے قابل نہیں"۔انہوں نے اماں کو دھکا دینے کے لیے بازو آگے بڑھایا تھا لیکن رومی نے آہستگی سے ان کا ہاتھ پیچھے کر دیا اور اماں جو زمین پر گری ٹرالی سیدھا کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تھیں انہیں ایک ہاتھ سے اپنے پیچھے کیا اور خود جیسے ڈھال بن کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"میں"۔وہ دھاڑے تھے۔"میرے جیسا وجیہہ اور خوب صورت مرد اتنا اعلیٰ تعلیم یافتہ اس عورت کے قابل نہیں تھا"۔انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"تمہارا دماغ اس عورت نے خراب کر دیا ہے رومی، ورنہ تم اس بات پر فخر کرتے کہ تمہارا باپ دُنیا کا خوب صورت ترین اور بہترین شخص ہے"۔رومی نے ایک گہری سانس لی تھی۔

"اور مجھے لگتا ہے جیسے میرا باپ دنیا کا بدصورت ترین مرد ہے۔خوب صورت وہ نہیں ہوتا ابا جی جس کا ظاہر خوب صورت ہو، اصل خوب صورت وہ ہوتا ہے جس کا اندر بھی خوب صورت ہو"۔وہ اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا تھا اور حبیب خان وہیں کھڑے تلملاتے رہے۔آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے نازو کو آواز دی تھی۔

"نازو، یہ سب سمیٹ لو"۔اور نازو تو جیسے کہیں آس پاس ہی کھڑی ہوئی تھی کہ یک دم لاؤنج میں آگئی۔

اس رات اس نے اماں کو اپنے کمرے میں جانے نہیں دیا تھا۔وہ جانتا تھا رات اگر اماں اپنے کمرے میں اکیلی ہوئیں تو ابا نے انہیں اذیت دینی ہے۔

"تم ایسا کیوں کرتے ہو رومی......وہ تمہارے باپ ہیں"۔آنے والے کسی لمحے کے خوف سے......تھر تھر کانپتے ہوئے انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"ہاں، مجھے اس رشتے کا احترام ہے لیکن میں انہیں آپ پر ظلم کرنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی میں یہ سب دیکھ رہا ہوں اماں جی لیکن اب برداشت نہیں ہوتا مجھ سے"۔

"پر بیٹا اس طرح ان کا غصہ اور بڑھ جاتا ہے۔وہ......"

"آج تک انہیں کسی نے ایسا کرنے سے منع نہیں کیا۔دادا جان اور دادی جان یہاں نہیں تھے، وہ اپنی من مانی کرتے رہے لیکن اب میں انہیں من مانی نہیں کرنے دوں گا۔میں روز روز آپ کی عزت نفس مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتا اماں جی۔ابا جی کو خود کو بدلنا ہوگا"۔لیکن شاید اس سے وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ انہیں بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

اس رات اماں اور گڑیا اس کے بیڈ پر سوئی تھیں اور وہ کارپٹ پر تکیہ رکھ کر سو گیا تھا۔

رات کو اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ پانی پینے کے لیے اُٹھا تو نائٹ بلب کی روشنی میں اس کی نظر اماں کے بازو پر پڑی تھی۔ وہ گڑیا کے گرد بازو رکھے گہری نیند سو رہی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر ساکت کھڑا ان کے بازو کو دیکھتا رہا تھا۔ جگہ جگہ پڑے ہوئے نیل اور پھر بازو پر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہ ذرا کی ذرا اماں کی گردن پر پڑی تھی، وہاں بھی کئی ایسے ہی نیل تھے۔ وہ سارا دن فل آستین کی قمیص پہنے اچھی طرح دوپٹا اپنے گرد لپیٹے رکھتی تھیں۔

"نہیں"۔ اس نے نظریں ان پر سے ہٹالی تھیں اور پھر وہ پوری رات نہیں سو سکا تھا۔

ایک بار پھر اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اماں کو بہت جلد اس عقوبت خانے سے لے جائے گا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ اس رات نے اس نے کارپٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک لائحہ عمل بنایا تھا۔ ابھی وہ فرسٹ ایئر میں تھا۔ اماں صحیح کہتی تھیں اس کا غصہ اور ابا سے بحث اماں کے لیے زندگی کو مزید مشکل بنا رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ اب ان سے کچھ نہیں کہے گا لیکن اماں اور گڑیا کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھے گا۔ وہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا اور اس نے اگلے دو سالوں میں ایسا ہی کیا تھا۔

وہ کالج سے آتے ہی اماں کے ساتھ ساتھ رہنے لگا تھا، خاص طور پر جب ابا گھر پر ہوتے۔ وہ گڑیا کو ڈھیروں کہانیاں سناتا۔ اس کا ہوم ورک کرواتا، اسے گھمانے لے جاتا، اس کے لیے اپنے جیب خرچ سے ڈھیروں چیزیں لاتا۔ اماں کیلئے شاپنگ کرتا، خوب صورت زمانے کے مطابق ڈریس خریدتا، سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی اس کی سوچ ایک میچور شخص کی سی تھی۔

"میں آرمی جوائن کروں گا"۔ اس نے اماں کو بتایا۔ "میری ٹریننگ کے چند سال آپ تنہا ہوں گی یہاں...... آپ کو اپنا اور گڑیا کا خود خیال رکھنا ہے۔ پھر ہم یہاں نہیں رہیں گے"۔ یہ اس کا فیصلہ تھا۔

وہ اماں کا سایہ بنا ہوا تھا پھر بھی ابا کو کسی نہ کسی وقت اماں پر ہاتھ اُٹھانے اور چیخنے چلانے کا موقع مل ہی جاتا تھا۔ اس نے کئی بار اماں کی پیشانی پر گومڑ اُبھرا دیکھا تھا اور نظر انداز کیا تھا۔ کئی بار ان کے رُخساروں پر اُنگلیوں کے نشان ثبت دیکھے تھے اور دل خون کے آنسو رویا تھا لیکن اس نے ابا سے بازپُرس کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی بازپرس اماں کو مزید اذیت دیتی ہے۔ اس روز جب وہ اپنا ایف ایس سی کا آخری پریکٹیکل دے کر گھر آیا تو ابا کی دھاڑ لاؤنج سے باہر تک آ رہی تھی اور نازو لاؤنج کی دیوار کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نازو پر ایک غصیلی نظر

ڈال کر وہ تیزی سے لاؤنج کی طرف بڑھا۔ اماں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

"میں...... مجھے کچھ علم نہیں"۔ روی وہیں ساکت کھڑا ہو گیا۔

"بکواس کرتی ہے، وہ بڈھا ساری جائیداد تیرے نام لکھ گیا۔ گاؤں کی ساری زمینیں، حویلی، سرگودھا کے مربعے، سب کچھ اور تو کہتی ہے تجھے علم نہیں"۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پشاوری جوتا ان کی پیٹھ پر مارا تو وہ جو بت بنا کھڑا تھا، تڑپ کر آگے بڑھا۔

"ابا جی......!" وہ زور سے بولا۔ "خبردار اب اگر میری ماں کو ہاتھ لگایا تو"۔

"تو......" انہوں نے مڑ کر خون خوار نظروں سے اسے دیکھا اور ایک لات اماں کو ماری۔ اماں لڑکھڑائی تھیں۔ روی نے تیر کی طرح آگے بڑھ کر انہیں اپنے بازوؤں میں سنبھالا لیکن وہ بھربھری مٹی کی طرح اس کے بازوؤں میں ڈھیر ہو گئی تھیں۔

"اماں جی...... اماں جی"۔ اس نے انہیں آرام سے صوفے پر لٹاتے ہوئے پکارا تھا۔ ہولے ہولے ان کے رخساروں کو تھپتھپایا، پھر ان کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اسے لگا جیسے ان کی نبض ڈوب رہی تھی اور ایک خوف ناک سی ٹھنڈک پورے وجود میں سرائیت کرتی جا رہی تھی۔

"میری ماں کو اگر کچھ ہو گیا تو میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا"۔ اس نے روتے ہوئے چیخ کر کہا اور پھر دونوں بازوؤں میں انہیں اُٹھائے تیزی سے لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے اس نے نازو سے گاڑی کی چابی لانے کو کہا اور خود تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

"اور پتا ہے مروان، یہ جو میراں اماں ہیں نا ان کا نام امیر خاتون ہے لیکن پتا نہیں کیوں سب انہیں میراں اماں کہتے ہیں۔ شاید بچپن میں انہیں میراں کہتے ہوں گے اور جب وہ ماں کے عہدے پر فائز ہوئی ہوں گی تو میراں اماں ہو گئی ہوں گی۔ میراں اماں تو جیسے محبت کے خمیر سے گندھی ہوئی ہیں۔ جب سے یہاں آئی ہیں، سب محلے والوں کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتی ہیں اور تو اور اماں جی بھی ان کی باتیں بڑے دھیان سے سنتی ہیں۔ وہ جب بھی آتی ہیں اماں کی آنکھوں سے خوشی جھلکنے لگتی ہے۔ پر مروان ان کے گھر کے پورے سترہ بندے ایک دن میں ختم ہو گئے۔ میراں اماں کا بہت بڑا گھر تھا، ڈاما ڈولا میں۔ جہاں ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے۔ دیور اور جیٹھ کا خاندان بھی ساتھ تھا، بیٹیاں جیٹھ اور دیور کے گھر بیاہی تھیں۔ یہ جنوری 2006ء کی صبح تھی، جب اچانک ان کے گاؤں پر راکٹ آ کر گرا تھا۔

گاؤں پر فضائی حملہ ہوا تھا۔

یک دم یمل چونکی، اسے لگا جیسے اماں کراہ رہی ہوں۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ اماں اپنا گھٹنا پکڑے زمین پر بیٹھی ہولے ہولے کراہ رہی تھیں۔

''کیا ہوا اماں جی......؟'' وہ گھبرا کر اُن کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے پلنگ کے پائے کی طرف اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئی۔ اماں شاید واش روم...... گئی تھیں اور باہر آتے ہوئے وہ پلنگ کے پائے سے ٹکرا گئی تھیں۔ اماں کے ساتھ پچھلے سات آٹھ بلکہ نو سالوں سے یہ مسئلہ بھی تھا کہ وہ کبھی کبھی یوں ہی ناک کی سیدھ میں چلتی رہتی تھیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ سامنے کوئی چیز ہے۔ اس نے جلدی جلدی ان کی شلوار کا پائنچہ اوپر کیا، گھٹنے سے نیچے ٹانگ پر نیل پڑ چکا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اسے رگڑا پھر دوڑ کر آئیوڈیکس لے آئی اور نرم ہاتھوں سے آئیوڈیکس لگا کر انہیں سہارا دے کر اُٹھایا۔

''اُٹھیں نا اماں جی......'' ان کے چہرے پر اذیت تھی، لب ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

''اماں جی......'' اس کا دل چاہا وہ ان سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگے۔ یہ اس کی اتنی بہادر اور صابر اماں تھیں جنہوں نے اس سے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کی تھیں لیکن اب......

بہت محبت سے انہیں بیڈ پر بٹھاتے ہوئے اس نے اُن کے ہاتھ چوم لیے۔ کیسے خوب صورت ہاتھ تھے اماں کے۔ وہ کتنی ہی دیر انہیں ہاتھوں میں لیے بیٹھی رہی۔ اماں بالکل چپ بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں، ان کی آنکھوں میں ہلکی نمی تھی لیکن وہ روئی نہیں تھیں۔ وہ روتی نہیں تھیں البتہ ان کے چہرے اور آنکھوں سے اذیت کا احساس ہوتا تھا، جیسے وہ بہت تکلیف میں ہوں۔

''اب درد تو نہیں ہو رہا اماں جی؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

آج اتوار تھا اسے یونیورسٹی نہیں جانا تھا۔ وہ اماں کو ناشتہ کروا کے باہر صحن میں بیٹھی تھی۔ اماں ناشتہ کر کے لیٹ گئی تھیں، وہ عموماً ناشتہ کر کے سو جاتی تھیں۔

''آپ مجھے آواز دے لیتیں اماں جی۔ آج فضیلت آ جائے تو میں یہ بیڈ ذرا سا پیچھے کروا دیتی ہوں''۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں کی نظریں اس کی...... طرف اُٹھیں۔ سوال کرتی، التجا کرتی۔

''ابھی آتی ہوں اماں...... وہ میں مروان کو بتا رہی تھیں میراں اماں کے متعلق''۔

مروان کے نام پر اماں کی آنکھیں یک دم سپاٹ ہو گئی تھیں۔ یوں جیسے وہ...... اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہو گئی ہوں۔

''بس ابھی آئی اماں جی''۔ اس نے انہیں حال میں واپس لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن اب وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں بلکہ سامنے دیوار پر نظریں جمائے پتا نہیں کس منظر میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہ افسردہ سی صحن میں آ گئی اور تخت پر پڑا اپنا موبائل، ڈائری اور قلم اُٹھایا۔ موبائل کی اسکرین روشن تھی۔ اس نے بغیر نمبر دیکھے فون آف کیا اور افسردہ افسردہ سی اماں کے پاس آ گئی۔ اماں اب لیٹ چکی تھیں اور اُن کی آنکھیں چھت پر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

''پتا نہیں اماں کب اپنی زندگی کی طرف لوٹیں گی اور اماں کو کیا پتا کہ ان کی یہ چپ مجھے اندر ہی اندر ہولے ہولے مارے جا رہی ہے۔ میں کتنا ترس گئی ہوں ان کے لیے حالانکہ اماں میرے پاس ہیں''۔ وہ ان کی پائنتی بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگی لیکن ان کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی، وہ ویسے ہی سیدھی لیٹی اوپر چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ وہ ان کی ٹانگیں دباتی ان کی طرف پُر اُمید نظروں سے دیکھتی رہی شاید وہ اس سے کہیں۔

''بس کرو بیٹا، تھک جاؤ گی''۔ شاید وہ کچھ نہ کہیں لیکن اپنی ٹانگیں کھینچ لیں، اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھیں جیسے منع کر رہی ہوں لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور وہ یونہی چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے سو گئیں۔ وہ آنکھوں میں آنے والی نمی کو اُنگلیوں کی پوروں سے پونچھتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

فضیلت ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اتوار کو وہ کچھ دیر سے آتی تھی لیکن آج کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے سامنے کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے اور اسے ڈاکٹر عرفان کی طرف جانا تھا۔ اماں کی دوائیاں بھی ختم ہو رہی تھیں اور اسے ڈاکٹر عرفان سے یہ بھی کہنا تھا کہ وہ اماں کی دوائیاں کچھ کم کر دیں۔ ان دوائیوں سے اماں کو بہت نیند آتی تھی، بعض اوقات تو وہ بیٹھے بیٹھے سو جاتی تھیں اور ان کی طویل نیند سے اسے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ خوف آنے لگتا تھا۔ اماں جاگ رہی ہوتیں تو جیسے سارے خوف، ساری گھبراہٹ آپ ہی آپ ختم ہو جاتی تھی۔ اماں بھلے چپ رہتی تھیں لیکن ان کے جاگنے سے پورے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اماں پر کندھوں تک چادر ڈال کر وہ باہر نکل آئی۔ دھوپ صحن کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ پورے صحن میں موتیے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے موتیے کے پھول توڑے اور اماں کے تکیے کے پاس رکھ دیے...... اماں کو موتیا بہت پسند تھا، اماں جب ٹھیک تھیں تو وہ موتیے کے پھول اپنے کانوں میں ڈالتی تھیں اور گجرا سا بنا کر چٹیا پر لپیٹ لیتی تھیں۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اماں سے کہتی تھی کہ اس کے کانوں میں بھی موتیے کے بالے ڈالیں لیکن اس کے کانوں میں اتنے بڑے بڑے سوراخ نہ تھے جن میں موتیے کے پھول کی ڈنڈی چلی جاتی۔

"اماں آپ نے اتنے بڑے بڑے چھید کروائے ہیں اور میرے چھوٹے چھوٹے"۔

"یہ خود ہی بڑے ہو گئے ہیں بھاری جھمکے پہننے سے۔ تمہاری دادی اماں نے مجھے بہت بھاری زیور پہنایا تھا اور جتنا عرصہ میں گاؤں میں رہی، ماسی مجھے جھمکے اور چوڑیاں نہیں اُتارنے دیتی تھیں۔ نئی بیاہی دُلہنیں خالی کان، خالی گلے کے ساتھ اچھی نہیں لگتیں۔ تو بس وہ بھاری جھمکے پہننے سے چھید بڑے ہو گئے تھے"۔ اور اماں کے کانوں میں تین چھید تھے اور اب تو اماں کبھی کبھی ہیرے کے چھوٹے چھوٹے نگوں والے ٹاپس پہنتی تھیں یا پھر صبح صبح موتیے کے پھول کانوں میں اڑس لیتی تھیں۔ وہ ٹاپس اور اماں کا سارا زیور تو وہیں رہ گیا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ آہستگی سے بھیڑ کر باہر آ گئی۔ باہر کے دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"او فضیلت آ گئی"۔ وہ خوش ہو گئی۔ فضیلت کو سارا کام سمجھا کر جب وہ گھر سے نکلی تو ساڑھے دس بج رہے تھے اور دھوپ چبھ رہی تھی۔ جون کی تین تاریخ تھی اور دس بجے ہی سورج آگ برسا رہا تھا۔ اگر فضیلت جلدی آ جاتی تو وہ سویرے سویرے ہی اپنے کام نبٹا لیتی۔ چادر کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے یک دم ہی تنگ گلی کی طرف قدم بڑھا دیے۔

یہاں اس گلی میں دھوپ براہ راست نہیں پڑتی تھی۔ اونچی چھتوں والے مکانوں کے شیڈز اور گیلریوں سے گلی سایہ دار تھی۔ اسے لگا جیسے وہ یک دم کھلے میدان سے کسی سایہ دار جگہ پر آ گئی ہو۔ یہ راستہ تھوڑا لمبا تھا لیکن وہ براہ راست دھوپ سے تو بچ جاتی۔ وہ سکون کی سانس لیتے ہوئے اماں کے متعلق سوچتے ہوئے چل رہی تھی کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور اندر سے......

نوشیرواں عادل نے باہر قدم رکھا۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت اُتر آئی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رکی اور پھر اس نے قدم آگے بڑھا دیے لیکن نوشیرواں لمبے لمبے قدم اُٹھاتا اس کے قریب آ گیا اور اب اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ تنگ گلی میں دونوں کے درمیان بس دو ہاتھ کا فاصلہ ہی تھا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"ڈاکٹر عرفان کے کلینک"۔ اس نے نوشیرواں کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اماں کی دوائیاں ختم ہو گئی تھیں اور پھر انہیں اماں کی طبیعت کا بھی بتانا تھا"۔

"آپ مجھے کہہ دیتیں، لائیں مجھے دیں اماں کا نسخہ"۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن سیمل بدستور چلتی رہی۔

"نہیں، مجھے ان سے اماں کے متعلق تفصیلی بات بھی کرنی ہے"۔

"کیوں، کیا ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟"۔

"نہیں، بلکہ مجھے لگ رہا ہے کہ وہ کچھ Improve کر رہی ہیں"۔

"گڈ......" وہ مسکرایا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اسے مسلسل ساتھ ساتھ چلتے دیکھ کر سیمل نے پوچھا۔

"آپ کے ساتھ جا رہا ہوں کلینک...... میں یہاں آیا تھا حیدر کے گھر پر، پیچھے حیدر کا گھر ہے۔ میرا بیٹ مین تھا"۔ وہ ذرا سا چونکی۔ اس کا خیال صحیح تھا نوشیرواں کا تعلق فوج سے ہی تھا۔ وہ نیچے زمین کی طرف دیکھتی چل رہی تھی۔ اس کی نظریں نوشیرواں کے پاؤں پر پڑی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر غور کیا، وہ ایک پاؤں پر زور دے کر چل رہا تھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کلینک نہ جائے، وہ اکیلی جا سکتی ہے اور پہلے بھی تو اکیلی ہی جاتی رہی ہے۔

یہ ساری گلیاں اب برسوں سے اس کی جانی پہچانی تھیں۔ اب یہاں چلتے ہوئے اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ یہاں آس پاس سب اچھے اور ملن سار لوگ رہتے تھے، حالانکہ شروع میں...... وہ بہت ڈرتی تھی اور سارے راستے...... آیت الکرسی پڑھتی جاتی تھی، تب بھی تو اکیلے ہی جاتی تھی۔ اس نے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ گلی سنسان تھی۔ کبھی کبھار کسی گھر کا دروازہ کھلتا اور اندر سے کوئی عورت یا بچہ نکل کر کسی سمت چلا جاتا۔ اس کے قدموں کی رفتار ذرا دیر کو مدھم ہوئی، وہ رُک کر اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ تکلیف نہ کرے اسے کوئی ڈر نہیں ہے لیکن جب اس نے نوشیرواں عادل کی طرف دیکھا تو وہ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سیمل بی بی۔ میں آپ کے ساتھ جا رہا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں آپ کو میرے ساتھ کی ضرورت نہیں"۔ وہ چپ کر گئی۔ وہ کسی کے سامنے یونہی لاجواب ہو جایا کرتی تھی اور مروان کہتا تھا۔

"جو تمہارے دل میں ہوتا ہے، کہا کرو...... کسی کی غلط بات پر چپ نہ ہو جایا کرو بلکہ تردید کرو، دلیلوں سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا کرو"۔

اب پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس کا یوں ساتھ ساتھ چلنا پتا نہیں اسے اچھا لگ رہا تھا یا نہیں، لیکن ایک تحفظ کا احساس ہو رہا تھا جیسے مروان کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ چلتے چلتے روڈ پر آ گئے تھے۔ نوشیرواں نے پھر کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی سیمل نے کچھ کہا تھا حالانکہ کتنی بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اس سے گلی کے متعلق پوچھے۔ وہ اسلام آباد گیا تھا۔ کیا اسے گلی کا کچھ پتا چلا۔ اس نے سنا تھا کہ اسلام آباد میں ایک آفس سے لاپتا افراد کے متعلق پتا چل جاتا

ہے۔ حمنہ نے اسے بتایا تھا، پتا نہیں صحیح تھا یا غلط۔ حمنہ کے ایک دور کے عزیز جو راولپنڈی میں رہتے تھے، وہ بھی عین ان کی بیٹی کی شادی والے دن گھر سے غائب ہو گئے تھے اور ابھی تک ان کے متعلق کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ وہ کہاں ہیں، زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ ان کا بیٹا بھاگ، بھاگ کر تھک گیا تھا۔ کبھی کسی دفتر میں، کبھی کسی دفتر میں لیکن کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور حمنہ کو ہی کسی نے بتایا تھا کہ اسلام آباد میں کسی سوشل ورکر نے آفس کھولا ہے، وہ پتا کروا دیتا ہے۔ شاید نوشیرواں کو بھی کسی نے اس آفس کا بتایا ہو اور شاید اس سوشل ورکر نے اسے بتا دیا ہو کہ گل کہاں ہے اور میراں اماں کتنی خوش ہوں گی۔ اس نے سڑک عبور کرنے کے انتظار میں کھڑے کھڑے نوشیرواں کی طرف دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کیا پوچھنا ہے سیم...... پوچھ لیں"۔ اس نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی تھی اور سیمل نے جھنجلا کر سوچا تھا۔

"افوہ...... یہ نوشیرواں عادل ہے، یا نوشیرواں نجومی۔ پتا نہیں کیسے دل میں سوچی گئی بات بھی جان لیتا ہے۔ نوشیرواں نجومی"۔ اس نے دُہرایا اور اُس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

نوشیرواں نجومی...... آئیے دل کا حال معلوم کیجئے۔ قسمت کا احوال جانیے اور پیش بندی کے لیے...... دیواروں پر لکھے اشتہار اس کی آنکھوں کے سامنے آئے تو اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، اگر وہ یہاں سڑک پر نوشیرواں کے ساتھ نہ کھڑی ہوتی تو کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ آنکھوں کے سامنے جگہ جگہ دیواروں پر لکھا نوشیرواں نجومی...... ملک کے ماہر ستارہ شناس آ رہا تھا اور نوشیرواں کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔ لبوں پر کھلتی مسکراہٹ نے تپتی دھوپ میں گلستان مہکا دیے تھے۔ وہ ایک وارفتگی کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ لڑکی خوب صورت ہے، اس میں کوئی شک نہیں لیکن اس کی مسکراہٹ اتنی ظالم ہو گی، اس کا انداز مجھے ہرگز نہیں تھا"۔ اس نے سیمل پر سے نظریں ہٹا کر سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ ٹریفک رُک گیا تھا۔

"آئیے......" اس نے جیسے اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تھا پھر ہاتھ نیچے کر لیا۔ سیمل نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سڑک عبور کی، کچھ آگے جا کر وہ ایک گلی میں مڑ گئے تھے۔ دو گلیاں آگے جا کر پھر ایک سڑک تھی جس پر ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ ریسپشن پر اماں کی فائل دے کر وہ ویٹنگ روم میں آئے تھے، وہاں صرف تین مریض تھے۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے

حسب عادت چادر کے پلو سے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور نوشیرواں عادل کو دیکھنا چاہا تو وہ اسی صوفے پر بیٹھا اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے آہستگی سے کہا۔

"اگر آپ فیصلہ کر چکی ہوں تو پوچھ لیں، کیا پوچھنا ہے"۔ لمحے بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت اُتری تھی اور پھر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"گل...... مجھے گل بھائی کے متعلق پوچھنا تھا"۔

"گل...... گل بھائی...... ہاں یہ ٹھیک ہے"۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"کچھ پتا چلا ان کا"۔ اب وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی، وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔ یکا یک اس کی آنکھوں سے گہرا حزن جھانکنے لگا تھا اور چہرے کے عضلات تن گئے تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ حمنہ...... میری دوست ہے نا، وہ کہہ رہی تھی کہ وہاں اسلام آباد میں ایک شخص تھا......"

"سب فراڈ تھا"۔ اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو انسانی لاشوں پر بھی اپنی سوداگری جما لیتے ہیں۔ وہ بھی کوئی ایسا ہی شخص تھا۔ انسانی لاشوں کا کاروبار کرنے والا"۔ اس نے تنفر سے ہونٹ سکیڑے۔

"لوگوں کے جذبات سے کھیل کر ان کی مجبوریاں خریدنے والا۔ آپ کو پتا ہے سیم مجھے وہاں ایک خاتون ملی تھیں۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے، اس کے شوہر کو لاپتہ ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا سارا زیور فروخت کر دیا تھا اور اس شخص نے اس سے دو لاکھ لیے تھے۔ اس کے شوہر کے متعلق خبر دینے کے عوض...... کاش میں ایسے لوگوں کو سولی پر لٹکانے کا اختیار رکھتا"۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

"مجھے وہ مل جاتا تو میں اسے نہ چھوڑتا"۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"تو آپ......"

"میں جی۔ ایچ۔ کیو گیا تھا۔ میرے ایک بہت مہربان ہیں بریگیڈیر مصطفیٰ، ان سے التجا کرنے کہ وہ گل کی تلاش میں میری مدد کریں۔ اماں جان ساری ساری رات سجدے میں گر کر رو رو کر اس کی واپسی کی دُعا مانگتی ہیں۔ مجھ سے اماں جان کا رونا نہیں دیکھا جاتا سیمل، ورنہ جہاں میں نے سب پر صبر کر لیا تھا، اُس پر بھی صبر کر لیتا"۔ سیمل کی آنکھیں جیسے بے تاب ہو رہی تھیں لیکن وہ ہونٹ بھینچے نوشیرواں عادل کو سن رہی تھی۔

"آپ کو اماں جان نے گل کے متعلق بتایا کچھ"۔

"نہیں......" یسمل نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"گل بہت پیارا تھا۔ بہت نازک۔ لڑکیوں جیسا حسن تھا اس کا۔ بچپن میں ہم سب اسے چھیڑتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے لڑکا بنادیا ہے، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکیوں کی طرح رو پڑتا تھا۔ وہ میرے بڑے ماموں کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی تین بہنیں تھیں۔ وہ سب کا لاڈلا تھا۔ سب اس کا یوں خیال رکھتے تھے جیسے وہ کوئی کانچ کا گڈا ہو، ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جائے گا۔ اماں جان تو صبح شام اس پر نظر کی دُعا پڑھ کر پھونکا کرتی تھیں۔ پتا ہے یسمل اس کا دل تو چڑیا جتنا تھا۔ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر کر مر جاتا تو وہ گھنٹوں روتا رہتا۔ بلی یا کتے کے پلے کو شریر بچے رسی باندھ کر گلی میں گھسیٹتے تو وہ ان سے لڑ پڑتا کہ یہ ظلم ہے...... اور پھر اس ظلم پر آنسوؤں سے روتا اور کئی دنوں تک اُداس رہتا تھا۔ گلی میں کسی فقیر کو دیکھتا تو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ یہ بھیک کیوں مانگ رہا ہے، اس کے کپڑے اچھے نہیں ہیں۔ اس کے بچوں کو کھانا کون دیتا ہے۔ وہ اماں جان کو اپنے سوالوں سے زچ کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی اماں جان جھنجلا جاتیں۔

ارے کون کہے گا اور یقین کرے گا کہ گل بیدار بخت خان کا پوتا ہے، جو کسی کی غلط بات برداشت نہ کرسکتا تھا اور جو حق کی خاطر لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔

ہاں تو کیا ہوا، میں کسی سے لڑوں یا نہ لڑوں، پوتا تو میں بیدار بخت کا ہی رہوں گا۔

لیکن اُس نے کبھی بندوق ہاتھ میں نہیں لی، کبھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر غلیل سے پرندے نہیں گرائے، کبھی جوان ہونے پر وہ ہمارے ساتھ شکار کے لیے نہیں گیا۔ وہ خونِ ناحق کے خلاف تھا۔ اُسے دہشت گردی سے نفرت تھی۔ وہ انسان تو کجا، کسی جانور کا خون بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُسے ظلم سے، ناانصافی سے نفرت تھی۔

پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ اُسے غائب کر دیا گیا۔

شاید کوئی غلط فہمی۔

اُس کے ہوسٹل کے ساتھی کہتے تھے، وہ جو آئے تھے اُنہوں نے کہا تھا اُنہیں شک ہے کہ وہ القاعدہ کا ساتھی ہے۔ دہشت گردی میں ملوث ہے۔ حالانکہ اُنہوں نے اُنہیں یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ نہ دہشت گرد ہے، نہ القاعدہ کا ساتھی۔ وہ تو خود دہشت گردی کا شکار ہے۔ لیکن انہوں نے اُن کی بات نہیں سنی اور کہا کہ وہ کچھ ضروری تفتیش کر کے چھوڑ جائیں گے لیکن پتا نہیں وہ کہاں ہے۔ گوانتاموبے یا......

وہ جنوری کا مہینہ تھا جب ہم یکایک بھرے پُرے خاندان سے محروم ہو گئے تھے اور اگست میں ہم بچ جانے والے تین افراد میں سے ایک اور کم ہو گیا تھا"۔ وہ جیسے تھک کر چپ ہوا تھا اور یسمل کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیسے تسلی دے۔ ایسے زخم بھلا تسلی کے چند لفظوں سے بھرتے ہیں۔ یہ تو سدا رستے رہتے ہیں، ہمیشہ تر و تازہ رہتے ہیں۔ وہ جیسے بے بس سی ہو کر چپ کر گئی تھی، تب وہ ہولے سے کھنکارا تھا۔

"تم کچھ بھی نہ کہو...... کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ صرف میرا یا میرے خاندان کا دُکھ نہیں ہے۔ ہم تو جیسے اب خود کو پرسا دیتے ہیں اور خود ہی تسلی کے لفظ اپنے اندر انڈیل لیتے ہیں"۔ وہ پھر جیسے اس کے دل کی بات جان گیا تھا۔ یسمل حیران ہوئے بغیر اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔ ماحول کا تناؤ دور کرنے کے لیے وہ مسکرایا۔

"آپ کے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں یسمل"۔ یک دم اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ تب ہی ریسپشن پر کھڑی لڑکی اندر آئی۔

"مس یسمل......"

"جی......" اس نے اندر جانے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یسمل اُٹھی تو نوشیرواں بھی اُٹھ گیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کلینک میں آئے تھے۔ ڈاکٹر عرفان نے اس کے پیچھے آتے نوشیرواں کو دیکھا تو یک دم ہی اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا اور میز کے پیچھے سے نکل کر انتہائی گرم جوشی سے اسے گلے لگایا۔

"یہ تم ہی ہو نا میجر نوشیرواں، آج ہماری یاد کیسے آگئی۔ خواب تو نہیں دیکھ رہا میں"۔ نوشیرواں مسکرایا تھا۔

"بس یار میں پچھلے ایک سال سے کم کم ہی اِدھر آیا ہوں، لاہور"۔

"اور اماں جان......؟" ڈاکٹر عرفان پوچھ رہا تھا۔

"جب اُدھر تھا گلبرگ میں تو ایک مستقل ملازمہ تھی ان کے پاس اور اب یہاں سمن آباد میں حیدر کا گھر ہے نا پاس ہی تو جب میں نہیں ہوتا گھر پر تو اس کے گھر سے کوئی آجاتا ہے ان کے پاس"۔ یسمل کو اپنی بے خبری پر ندامت ہوئی۔ اسے تو کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ میراں اماں گھر پر بالکل اکیلی ہوتی ہیں۔

"سمن آباد میں تم کہاں رہ رہے ہو؟" ڈاکٹر عرفان واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

"ان کا پڑوسی ہوں"۔ نوشیرواں نے مڑ کر اسے دیکھا اور تب پہلی بار ڈاکٹر عرفان اس

کی طرف متوجہ ہوا۔

''ارے یسمل بی بی کیسی ہیں آپ اور آنٹی کا کیا حال ہے؟'' اور جب وہ اماں کے متعلق تفصیل بتا رہی تھی تو نوشیرواں بھی درمیان میں لقمے دیتا جا رہا تھا اور اس رات کی اماں کی حالت اس نے تفصیل سے بتائی تھی اور یسمل چپ ہوگئی تھی۔ وہ اماں کے متعلق ہر بات یوں ڈاکٹر عرفان سے ڈسکس کر رہا تھا جیسے مروان کرتا تھا۔

''اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے بندوں کو نہیں بھولتا''۔ ایک بار مروان نے کہا تھا۔ ''وہ ہماری بھی ضرور سنے گا''۔

ڈاکٹر عرفان بہت پُراُمید تھے، اماں کے متعلق۔ اس ایک ماہ میں وہ کب ہنسی تھیں، کب انہوں نے کوئی بات کی تھی، یسمل نے ایک ایک بات تفصیل سے بتائی تھی۔

''یہ بہت خوش آئند ہے یسمل بی بی۔ مجھے یقین ہے کہ آنٹی اب جلد واپس اپنی نارمل حالت میں آجائیں گی''۔ انہوں نے کچھ دوائیں تبدیل کی تھیں اور یسمل جب نوشیرواں کے ساتھ کلینک سے باہر نکلی تو اتنی خوش تھی کہ اس نے نوشیرواں کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، حالانکہ جب وہ کلینک میں داخل ہو رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ واپس جاتے ہوئے وہ نوشیرواں کو صاف صاف منع کر دے گی کہ خوامخواہ اس کی عادتیں خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ کتنی مشکلوں سے تو اس نے تنہا جینا سیکھا تھا، مروان کے بغیر۔ لیکن واپس جاتے ہوئے وہ صرف اماں کے متعلق سوچ رہی تھی اور مروان کے متعلق......

''کیا سوچ رہی ہیں؟'' سڑک کے کنارے کھڑے نوشیرواں نے پوچھا تھا۔

''میں سوچ رہی ہوں مروان کو جب پتا چلے گا کہ اماں بہتر ہو رہی ہیں تو وہ کتنا خوش ہوگا''۔

''ہاں یہ تو ہے''۔ نوشیرواں مسکرایا تھا اور اس نے ماتھے پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر سامنے سڑک کی طرف دیکھا۔ سڑک کے دوسری طرف کھڑی خواتین میں سے ایک لڑکی پر اسے حمنہ کا گمان گزرا تھا۔ دوسری طرف کھڑی لڑکی تو نہ جانے کون تھی لیکن سیاہ ہنڈا سٹی میں سے جھانکتے شخص سے نظر ملتے ہی وہ ڈر کر پیچھے ہٹی تھی۔ اس کا رنگ یک دم زرد ہو گیا تھا۔ سڑک پر گاڑیاں اشارے پر رکی ہوئی تھیں، اسے لگا۔ ہنڈا سٹی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص فرنٹ ڈور کھول رہا ہے لیکن اشارہ کھل گیا تھا اور یک دم بہت ساری گاڑیوں کے ہارن بج اُٹھے تھے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی لیکن خوف زدہ نظروں سے اُدھر ہی دیکھتے ہوئے اسے لگا جیسے گاڑی یوٹرن سے مڑ کر واپس آ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر سڑک پر ڈالی اور پھر

مڑ کر دوڑ لگا دی، وہ سامنے والی گلی میں گھس گئی تھی۔ نوشیرواں نے ایک لمحے رُک کر اسے خوف زدہ ہو کر دوڑتے دیکھا تھا اور پھر خود بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پیچھے گلی میں گھس گیا۔

☆☆☆

دو دن رہ کر اماں اہسپتال سے گھر آگئی تھیں۔ ان دو دنوں میں ابا ایک بار بھی اہسپتال نہیں گئے تھے۔ اکیلا رومی تھا جو اماں کے پاس تھا اور اسے گڑیا کی بھی فکر تھی جو گھر میں اکیلی تھی۔ اگرچہ وہ دو تین چکر گھر کے لگاتا تھا۔ ناز کو بھی سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ گڑیا کا خیال رکھے پھر بھی دو دنوں میں گڑیا کا ذرا سا منہ نکل آیا تھا۔ ابا کو اپنی پوجا سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ گڑیا یا کسی اور طرف دھیان دیتے۔ ڈاکٹر نے رومی سے پوچھا تھا۔

''تمہارے گھر میں کوئی بڑا نہیں ہے بیٹا؟ تمہارے والد یا کوئی اور''۔

''نہیں''۔ رومی نے چپکے سے اماں کو دیکھا تھا۔ نرس ان کا بی پی چیک کر رہی تھی۔

''میرے والد گھر پر نہیں ہیں۔ دادا کا انتقال ہو چکا ہے اور گھر میں بس چھوٹی بہن ہے''۔ ڈاکٹر خاصا ہمدرد تھا اور نرسیں بھی اچھی تھیں۔ شام کو جب وہ گڑیا کو لاتا اماں سے ملانے تو ڈیوٹی پر موجود نرسیں اسے بہت پیار کرتیں، جب وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر اماں کے لیے دُعا کرتی تو اس پر بے ساختہ پیار آتا تھا، پھر ڈاکٹر نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔

''خون کی شدید کمی ہے اور کمزوری بھی بہت ہے۔ لگتا ہے، یہ کچھ کھاتی پیتی نہیں ہیں۔ ان کی ڈائٹ کا خیال رکھا کریں''۔ ڈاکٹر نے تاکید کی۔

گھر میں سب کچھ وافر تھا لیکن شاید اماں کی بھوک ہی مر گئی تھی۔ گھر آنے کے بعد رومی اماں کی خوراک کا بھی خود خیال رکھنے لگا تھا۔ ابا نے احوال تک نہ پوچھا۔

''آپ اہسپتال نہیں آئے؟'' رومی نے گلہ کیا۔

''میں نے کیا کرنا تھا وہاں آ کر، تم تھے نا اپنی ماں کی دیکھ بھال کے لیے''۔ رومی کو افسوس ہوا تھا کہ اس نے ان سے کیوں کہا۔ حالانکہ وہ ابا سے کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا پھر بھی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔

رومی کی زندگی اب گڑیا اور اماں کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس نے ابا کی طرف دیکھنا اور خود سے ان سے بات کرنا چھوڑ دیا اور ابا خود سے کبھی کوئی بات کرتے تو وہ جواب دے دیتا تھا اور ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ ابا اس سے بات کریں۔

آج کل وہ فارغ تھا، اس لیے اس کا سارا وقت اماں اور گڑیا کے ساتھ گزر رہا تھا۔

گڑیا کو خود اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا، گھر آتا تو اماں کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ وہ کچن میں ہوتیں تو وہ پاس کھڑا ان سے باتیں کر رہا ہوتا۔ لاؤنج میں آتیں تو اُن کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈراموں پر تبصرہ کرتا۔

ان دنوں اماں کی صحت اچھی ہوگئی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ خود ان کے کمرے میں دودھ کا گلاس لے کر جاتا اور جب تک وہ پی نہ لیتیں، نہ اُٹھتا۔ پھر گڑیا کو کہانی سناتا۔ گڑیا کہانی سنے بغیر سوتی ہی نہیں تھی۔ اس کی اپنی دلچسپیاں بالکل محدود ہو کر رہ گئی تھیں لیکن وہ خوش تھا۔

ابا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر، لاؤنج میں کہیں بھی وہ طنز کرنے سے باز نہ آتے۔ انہوں نے کبھی گڑیا یا رومی کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھی کسی معمولی بات پر پہلے کی طرح ہی آپے سے باہر ہو جاتے پھر چیزوں کی شامت آجاتی تھی لیکن رومی کی موجودگی میں وہ ان پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے اب۔ اس روز وہ اماں کے پاس بیٹھا انہیں اپنے ایک دوست کے متعلق بتا رہا تھا اور اماں پالک کاٹ رہی تھیں کہ اچانک ہی وکیل کا فون آ گیا۔ وہ اماں سے بات کرنا چاہتے تھے، تب اسے یاد آیا کہ اس روز جب اماں بے ہوش ہوئی تھیں تو جھگڑا اماں کے نام کی گئی جائیداد پر ہوا تھا۔ اماں بات کر چکیں تو اس نے تفصیل پوچھی، تب اماں نے بتایا۔

''ماموں جان نے اپنی تمام پراپرٹی اور بینک میں موجود رقم میرے نام کی ہے کیونکہ میں ان کی واحد وارث ہوں شرعاً اور قانوناً۔ وکیل نے مجھے یہی بتایا ہے۔ تمہارے ابا کے نام کچھ نہیں ہے، سوائے اس کوٹھی کے جس میں وہ رہ رہے ہیں''۔

''وکیل نے اب آپ کو کیوں فون کیا ہے؟'' اماں جھجک گئیں۔

''وہ پوچھ رہا تھا کہ کیا میں نے تمہارے ابا کو کوئی مختار نامہ دیا ہے''۔

''آپ نے کیا کہا؟'' رومی اماں کی کمزوری کو جانتا تھا۔ وہ جھگڑے اور ابا کے غصے سے بہت گھبراتی تھیں۔

''وہ...... وکیل نے مجھے ملنے کو کہا ہے''۔

''ابا یقیناً کوئی فراڈ کر رہے ہیں، تب ہی اتنے دنوں سے انہوں نے پھر جائیداد کا ذکر نہیں کیا''۔ یہ رومی کا خیال تھا۔

وہ اماں کو لے کر خود وکیل کے پاس گیا تھا۔ ابا نے ایک جھوٹا مختار نامہ تیار کر کے اس پر اماں کے جعلی دستخط کر دیے تھے''۔ ان پر فراڈ کا کیس بھی چل سکتا ہے''۔

''نہیں، نہیں وکیل صاحب، بس بات ختم کر دیں''۔ انہوں نے مختار نامہ پھاڑ دیا۔

''کوئی فراڈ ہوا تو نہیں نا!'' رومی کی اتنی زیادہ توجہ اور سہارے نے اماں کے اندر خود اعتمادی پیدا کی تھی اور اسی خود اعتمادی کے سہارے انہوں نے سب پراپرٹی اور نقد رقم رومی اور گڑیا کے نام کر دی تھی۔ ابا کو پتا چلا تو وہ بہت چلائے اور بہت ہنگامہ کیا۔

''تم چالاک...... عورت، میسنی...... کس کے ساتھ وکیل کے پاس گئی تھیں''۔

''میں اماں کے ساتھ گیا تھا''۔ قمیص کی آستینیں فولڈ کرتا رومی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا۔

''اس احمق عورت کو عقل نہیں کہ بچوں کے نام سب کچھ کر دیا۔ ضائع ہو جائے گا، کوئی بچوں کے ساتھ دھوکا بھی کر سکتا ہے''۔

''کی تو تھی ایک کوشش آپ نے فراڈ کی۔ جعلی مختار نامہ تیار کر کے اور اماں کے جعلی دستخط کر کے''۔ رومی نے اب ان سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کو ان کا رنگ بدلا تھا۔

''میں نے تمہارے لیے کیا تھا، اپنے بچوں کے لیے، ورنہ اس بے وقوف جاہل عورت سے کیا اُمید کی جا سکتی ہے کہ یہ اتنی بڑی پراپرٹی سنبھال سکتی''۔ انہوں نے پینترا بدلا تھا۔

''دادا جان نے سب بندوبست کر دیا تھا''۔ بڑے رسان سے جواب دیتا وہ اماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ زمینیں ٹھیکے پر ہیں۔ رقم اماں کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی رہے گی''۔

''وہ شخص تمہارا دادا نہیں تھا''۔

''سوری! نانا ابا نے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ وکیل نے آپ کو بتایا نہیں نانا جان نے آپ کے اکاؤنٹ میں بھی ایک کروڑ سے زیادہ کی رقم جمع کروائی ہے۔ آخر کو انہوں نے آپ کو پالا تھا''۔

''لعنت بھیجتا ہوں میں اس رقم پر...... میں مہینے میں لاکھوں کماتا ہوں''۔ وہ سامنے پڑی چھوٹی ٹیبل کو ٹھوکر مارتے لاؤنج سے نکل گئے...... رومی کی نظر سیڑھیوں پر پڑی تھی، ریلنگ پر ہاتھ رکھے گڑیا اوپر والی سیڑھی سے خوف زدہ سی جھانک رہی تھی۔

''گڑیا نیچے آ جاؤ، واک کے لیے چلتے ہیں''۔ رومی بہت خوش تھا، اسے لگا تھا کہ آج ابا لاجواب ہو گئے تھے۔ اس روز وہ پھر ضد کر کے اماں کو ساتھ لے گیا تھا اور اس روز پھر انہوں نے ایک بہت اچھا اور خوب صورت دن گزرا تھا۔ واپسی پر اس نے ابا کے لیے بھی آئس کریم اور بروسٹ پیک کروا لیا تھا۔ اس کا خیال تھا بلکہ یقین تھا اسے کہ ابا دونوں چیزیں اُٹھا کر پھینک دیں گے لیکن خلاف توقع انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا بلکہ شکریہ کہہ کر نازو کو پلیٹیں لانے کے لیے کہا تھا اور آئس کریم فریج میں رکھوا دی تھی۔

اس روز رومی بڑے دنوں بعد پُرسکون نیند سویا تھا اور خواب میں اس نے مکمل گھرانا دیکھا تھا۔ ابا، اماں، وہ اور گڑیا۔ یہ خواب وہ جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھتا تھا اور اس رات اس نے سونے سے پہلے دنوں بعد ہوم سوئیٹ ہوم کی کہانی گڑیا کو سنائی تھی۔ نیلی چارلس کا سوئیٹ ہوم۔ جس میں نیلی اپنے دو جڑواں بھائیوں اور اپنے مماپپا کے ساتھ رہتی تھی۔ نیلی کا گھر جس میں محبت کی گرمی اور حدت تھی، جہاں غربت تھی اور جہاں نیلی کو ہفتے میں ایک بار بھوکے پیٹ سونا پڑتا تھا پھر بھی نیلی خوش تھی کہ اس کے ماما، پاپا ان تینوں سے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور اس گھر میں سب ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کو تیار رہتے تھے، حتیٰ کہ ننھے جون اور ولیم بھی...... اور کوئی یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ اس نے قربانی دی ہے۔ گڑیا نے ہمیشہ کی طرح کہانی بہت شوق سے سنی تھی اور سنتے سنتے سو گئی تھی۔ ابا ان دنوں لڑائی جھگڑا نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے گڑیا سے بھی باتیں کی تھیں اور رومی سے بھی اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھا تھا حتیٰ کہ اس نے ایک روز انہیں اماں سے بھی نرمی سے بات کرتے دیکھا تھا اور ابا کے اتنے سے التفات پر جیسے اس کے اندر کے غصے پر پانی کے چھینٹے پڑ گئے تھے اور اس کی ساری تلخی ختم ہو گئی تھی۔ پھر بہت سارے دن سکون سے ہی گزر گئے تھے۔ ابا نے صرف چند بار طنز کرنے کے اماں سے کچھ نہیں کہا تھا، پھر اس کا رزلٹ آ گیا۔ اس نے اے پلس گریڈ لیا تھا۔ اماں بے حد خوش تھیں۔

"شکر ہے تو اس عورت پر نہیں چلا گیا۔ میری ذہانت ملی ہے تجھے"۔ اس کا دل بے حد برا ہوا تھا ابا کی بات پر، لیکن اس نے اگنور کیا۔ نیچر کہاں بدلتی ہے بھلا۔ اس نے انہیں نیچر کا مارجن دے کر اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا، تب ابا نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے تعلیم کی غرض سے باہر بھیجنا چاہتے ہیں۔ یو کے، یو ایس اے...... جہاں وہ چاہے۔ تب اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"نہیں مجھے باہر نہیں جانا"۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے، یہیں پاکستان میں رہ کر کروں گا۔ میں اماں اور گڑیا کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا"۔

"کیوں تمہاری اماں کو چور پکڑ رہے ہیں کیا۔ وہاں جا کر کچھ تہذیب اور ادب آداب سیکھ لیتے"۔

"وہ تہذیب جو آپ سیکھ کر آئے ہیں"۔ رومی کا جی چاہا وہ کہے لیکن اب مدت ہوئی اس نے ان سے بحث کرنا چھوڑ دی تھی، کرنا اس نے وہی تھا جو اس نے سوچ رکھا تھا۔ اس کی پہلی ترجیح آرمی جوائن کرنا تھی۔

"اگر مجھے کمیشن نہ ملا تو میں بی ایس سی کر لوں گا اور ایک بار پھر ٹرائی کروں گا"۔ اس

نے اماں کو بتایا تھا۔ رومی کو کمیشن مل گیا اور وہ پی ایم اے کے لانگ کورس کے لیے اکیڈمی چلا گیا۔ گڑیا تب نو سال کی تھی جب وہ اکیڈمی جا رہا تھا اور جب دو سال بعد وہ پاسنگ آؤٹ کے بعد واپس آیا تو گڑیا گیارہ سال کی ہو چکی تھی۔ یہ دو سال اماں نے بہت مشکل سے گزارے تھے لیکن جب کبھی وہ چھٹی پر گھر آتا تو اماں نے کبھی اس پر کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔ البتہ گڑیا اسے ہمیشہ ہی ڈری سہمی اور خوف زدہ سی ملتی تھی۔ اس کی غزل آنکھوں میں جیسے خوف بس گیا تھا۔ اماں کی صحت پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔

"اماں......" ان کے گلے کے گرد بانہیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"آرمی میں جانا میرا شوق تھا لیکن آرمی جوائن کرنے کی ایک وجہ بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا بھی تھا۔ میں آپ کو یہاں سے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، جہاں بھی رہا گڑیا اور آپ میرے ساتھ ہی رہیں گی"۔

اس کی پاسنگ آؤٹ پر کوئی نہیں آیا تھا۔ اماں اور گڑیا تو اکیلے آ نہیں سکتی تھیں اور ابا...... اس نے انہیں فون کر کے کہا بھی تھا کہ وہ گڑیا اور اماں کے ساتھ آئیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے آنے کا"۔ اس کی پہلی پوسٹنگ کھاریاں میں ہوئی تھی۔ وہ اب لیفٹیننٹ تھا اور چاہتا تھا اماں اور گڑیا اس کے ساتھ چل کر رہیں۔ اسے آرمی کی طرف سے گھر نہیں ملا تھا لیکن اس نے کہا تھا، وہ کہیں باہر کرائے پر گھر لے لے گا لیکن اماں نے منع کر دیا۔

"تمہارے ابا ناراض ہوں گے"۔ اماں کی آنکھوں کی التجا پر وہ چپ ہو گیا۔ وہ ہر ویک اینڈ پر گھر آ جاتا اور یہ دن گڑیا اور اماں کے ساتھ پلک جھپکتے میں گزر جاتے۔ وہ انہیں میس میں ہونے والے لطیفے سناتا اور اپنے ساتھیوں کی اور اپنی باتیں بھی...... وہ بہت خوش تھا۔ بچپن میں جو اس نے سوچا تھا کہ وہ فوج میں جائے گا، اس کا وہ خواب پورا ہو گیا تھا لیکن ابا کے بدل جانے کا خواب پورا نہیں ہوا تھا۔ ابا ویسے ہی تھے، تنگ دل، اکھڑ اور بدمزاج۔ اب تو انہوں نے اماں کے کمرے میں آنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا اور گیسٹ روم میں مستقل اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ کھانے کی ٹیبل پر لاؤنج میں لیونگ روم میں ان کی زبان زہر اُگلتی رہتی۔

اماں کے علاوہ ان کا نشانہ دادا جان اور دادی کی ذات ہوتی۔ کبھی کبھی وہ دادا جان کو خوب گالیاں دیتے اور رومی کا دل دُکھتا۔ اماں چپکے چپکے روتیں اور گڑیا ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی ہولے ہولے کہتی رہتی۔

"اماں نہ روئیں، اماں چپ کریں" اور کبھی جوابا کی نظر اماں پر پڑ جاتی تو ان کا رونا انہیں بھڑکا دیتا۔

"کس بات کا پیٹنا ہے ناشکری عورت! تجھ جیسی عورت کو میرے جیسا بندہ مل گیا، شکر کر" اور پھر لاتیں، مکے، تھپڑ...... اور گڑیا اماں کو بچاتے ہوئے اکثر ان کی زد میں آجاتی اور ایسا اس وقت ہوتا جب رومی گھر پر نہ ہوتا، رومی کی موجودگی میں وہ غصے میں آنے سے گریز ہی کرتے تھے۔ اماں ہر بات رومی سے چھپانے لگی تھیں۔ انہیں جوان کے بیٹے کے غصے سے خوف آتا تھا اور وہ گڑیا کو بھی سختی سے منع کر دیتیں۔

"رومی کو کچھ نہ بتانا ...... خوانخواہ باپ سے جھگڑا کرے گا" اور گڑیا تو یوں بھی جھگڑے نے سے گھبراتی اور ڈرتی تھی، سو وہ رومی کے لاکھ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بتاتی تھی اور پھر جب گڑیا نے میٹرک کا امتحان دیا تو...... رومی کی پوسٹنگ لاہور ہوگئی۔ رومی کی یہ تیسری پوسٹنگ تھی اور وہ لاہور آ کر بے حد خوش تھا۔ گڑیا اور اماں کے لیے یہ دن زندگی کے خوب صورت ترین دن تھے۔ ابا یو۔کے گئے ہوئے تھے اور گھر میں معمولی سی بھی ٹینشن نہ تھی، ان دنوں رومی کے ساتھ وہ پورا لاہور گھومی تھی۔ وہ میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی، لہٰذا اس کے پاس بہت وقت تھا۔ ان دنوں رومی نے اسے ڈھیروں کتابیں خرید کر دی تھیں اور وہ بڑے بڑے ادیبوں سے روشناس ہوئی تھی۔ بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ وغیرہ ان سب کو اس نے تب ہی پڑھا تھا۔ رومی بھی کتابوں کا کیڑا تھا۔

کوئی بھی نئی کتاب پڑھنے کے بعد وہ اس پر تبصرہ کرتے۔ اس نے اماں کو بھی پڑھنے کا چسکا ڈال دیا تھا۔ اب اماں بھی فارغ وقت میں کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوتیں۔ اب وہ خود پڑھ سکتی تھی لیکن اسے اب بھی رومی سے کہانی سننا اچھا لگتا تھا۔ وہ فرمائش کر کے رومی سے کہانی سنتی۔ رومی بھی اس کی فرمائش ضرور پوری کرتا جیسے وہ ننھی بچی ہو۔ اسے آج سولہ سال کی عمر میں بھی نیلی کے سوئیٹ ہوم والی کہانی بہت پسند تھی اور جب نیلی کا گھر بک جاتا تھا اور انہیں ایک پہاڑ کی کھوہ میں رہنا پڑتا تھا تو آج بھی اسے سنتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے اور رومی ہنستا۔

"پگلی ...... یہ کہانی ہے"۔

"کہانیاں بھی تو زندگی کے المیوں اور واقعات سے کشید کی جاتی ہیں۔ کیا خبر کہیں حقیقت میں بھی کوئی نیلی ہو، جسے کبھی کسی پہاڑی غار میں پناہ لینی پڑی ہو"۔ وہ سوچتی تھی۔

اس روز جب پہلی بار اس نے رومی کے ساتھ انارکلی سے پرانی کتابیں خریدی تھیں تو

رومی اسے انارکلی کی بانو بازار کی چاٹ کھلانے لے گیا تھا۔ واپسی پر وہ یونہی وہاں رک کر کتابیں دیکھنے لگے تھے اور رومی نے اس کے لیے وہاں سے قرۃ العین کی "آگ کا دریا" لی تھی۔ ان دنوں اماں کتنی خوب صورت لگنے لگی تھیں۔ اسمارٹ اور باوقار، نازک سی اماں۔ وہ اکثر سوچتی تھی آخر ابا کو اماں پسند کیوں نہیں ہیں۔ اماں تو کسی بھی شخص کا آئیڈیل ہو سکتی تھیں۔ پھر...... ابا یو۔کے سے آئے تو اماں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"بڑی عیاشیاں ہو رہی ہیں میرے پیچھے"۔

ابا اچانک آئے تھے۔ وہ تینوں باہر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ دراصل رومی اور گڑیا نے چپکے چپکے اماں کی سالگرہ کا پروگرام بنایا تھا۔ آج ان کا برتھ ڈے تھا۔ گڑیا اور رومی نے خود اماں کے لیے کپڑے سلیکٹ کیے تھے اور گڑیا نے ضد کر کے ان کا لائٹ سا میک اَپ کیا تھا۔ وہ ٹی پنک اور لائٹ فیروزی امتزاج کے سوٹ میں بے حد دلکش لگ رہی تھیں۔

"تم جاؤ رومی، گڑیا کو لے جاؤ۔ تمہارے ابا آ گئے ہیں، میں نہیں جاؤں گی"۔ انہوں نے آہستہ سے رومی سے کہا تھا اور ابا کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"آپ فریش ہو جائیں، میں چائے لگواتی ہوں"۔

"نہیں بھئی، تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جاؤ سیر سپاٹے کرو۔ نازو ہے، دے دے گی مجھے چائے"۔

"دراصل ابا"۔ رومی نے بڑے تحمل سے کہا۔ "آج اماں کی سالگرہ ہے اور ہم نے اماں کو...... سرپرائز دینے کا پروگرام بنایا تھا۔ تو ایسا ہے کہ آپ فریش ہو جائیں، پھر آپ بھی چلیں ہمارے ساتھ"۔

"نہ جی، مجھے تو بخشو، تم اُٹھاؤ اپنی ماں کے چوچلے"۔

"ابا جی ...... یہ زندگی بہت مختصر ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہم سب مل جل کر منا لیں تو زندگی بڑی سہل ہو جاتی ہے"۔

"مجھے فلسفہ نہ پڑھا، تجھ سے زیادہ علم ہے میرے پاس۔ اس احمق عورت کے ساتھ زندگی کی خوشیاں بانٹنے سے تو بہتر ہے کہ آدمی کنوئیں میں چھلانگ لگا دے"۔ بڑے دنوں بعد آج رومی کے سامنے انہوں نے اس طرح اماں کو مخاطب کیا تھا۔ اماں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ رومی نے بہ مشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ گڑیا، اماں کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

"ٹھیک ہے ابا جی، آپ آرام کریں۔ نازو ہے گھر میں، چائے کھانا جو بھی چاہیے

ہوگا، کہہ دیجئے گا اس سے''۔اس نے اماں کا ہاتھ پکڑا۔

''چلیں اماں''۔

اماں نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اماں پلیز! میں نے کیک آرڈر کیا ہوا ہے اور......''

''نازو......''ابا چلائے۔''میرا بیگ رکھو میرے روم میں''۔اور خود بریف کیس اُٹھا کر زور زور سے پاؤں زمین پر مارتے باہر چلے گئے۔اماں لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

''چلیں اماں''۔رومی سنجیدہ تھا۔

''مجھے اس امتحان میں نہ ڈال، ضد نہ کر۔انہیں اور غصہ نہ دلا''۔رومی کو اماں کی بے چارگی پر دُکھ ہوا۔

''ٹھیک ہے اماں جی ریلیکس ہو جائیں، میں کیک پیک کروا کے گھر ہی لے آتا ہوں''۔ان کے گرد بازو حمائل کر کے وہ انہیں صوفے کی طرف لے گیا اور صوفے پر بٹھایا۔

''گڑیا! اماں کا خیال رکھنا۔میں ابھی آیا''۔وہ اپنی جیپ کی چابی اُٹھاتا تیزی سے باہر نکل گیا۔رومی کے جانے کے بعد اماں اُٹھیں۔

''گڑیا تو بیٹھ اِدھر میں تیرے ابا کے کپڑے نکال دوں''۔

''اماں''۔گڑیا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔''وہ غصے میں ہیں''۔

''وہ کب غصے میں نہیں ہوتے گڑیا''۔انہوں نے آہستگی سے کہا اور گیسٹ روم کی طرف بڑھ گئیں۔وہ جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز تھے۔

''آپ نے جوتے بھی نہیں اُتارے''۔انہوں نے کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے ان کے جوتے اُتارے۔

''ایزی ہو کر لیٹ جائیں۔میں واش روم میں کپڑے لٹکا دیتی ہوں۔کچھ ریسٹ کر لیں، پھر نہا...... لیجئے گا''۔نرمی سے کہتی وہ وارڈ روب کی طرف مڑ گئیں، وہ زہریلی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔اماں کو ان کی نظریں اپنی پیٹھ میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔وہ شلوار قمیص کا سوٹ نکال کر مڑیں تو وہ جیسے پھنکارے تھے۔

''دو تین ماہ کے لیے گھر سے گیا تھا، عیاشیاں ہونے لگیں، ہوٹلنگ ہوتی تھی روز...... میرے پیسے پر رنگ رلیاں منائی جاتی رہی تھیں۔میرا...... میرا پیسہ تھا امینہ بیگم...... میرا حق تھا۔بیٹا

تھا میں ان کا لیکن تو نے اپنی چالاکی اور میسنے پن سے اپنے نام کروالیا سب کچھ میرا حق تھا میرا''۔وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

''آپ بیٹے ہی تو نہیں بنے ان کے حبیب...... بیٹا بن کر دکھاتے تو ماموں مامی یوں زخمی دل لیے اس دنیا سے نہ جاتے''۔سگے ماموں کا دُکھ امینہ کو کبھی کبھی رُلا دیتا تھا اور اسی دُکھ کے زیرِ اثر آج پہلی بار انہوں نے حبیب خان کی بات کے جواب میں پلٹ کر کچھ کہا تھا۔

''تو......تو دو ٹکے کی عورت مجھے بتا رہی ہے کہ مجھے کیا کرنا تھا......تو......''انہوں نے ایش ٹرے اُٹھا کر ان کی طرف پھینکا تھا اور پھر امینہ بیگم تھیں اور حبیب خان کے جوتے، مکے، لاتیں اور زبان سے نکلنے والی گالیاں۔

رومی جب کیک لیے گھر آیا تو گڑیا جو دروازے کے ساتھ سہمی کھڑی تھی، روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔اسے پچکارتے ہوئے اس نے نازو کی طرف دیکھا جو گیسٹ روم کے بند دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔اس نے گڑیا کو صوفے پر بٹھایا اور نازو کو پانی لانے کے لیے کہا اور خود بے حد ضبط کیے گیسٹ روم کی طرف بڑھا۔تب ہی گیسٹ روم کا دروازہ کھلا اور ابا نے اماں کو باہر دھکا دے کر دروازہ بند کر لیا۔

وہ تیر کی طرح اماں کی طرف لپکا تھا پھر اس نے انہیں اپنے توانا بازوؤں میں اُٹھا لیا اور سیدھا سیڑھیاں چڑھتا ہوا ان کے کمرے میں آیا تھا۔اماں ہولے ہولے سسکیاں رہی تھیں۔ان کا چہرہ نیل سے بھرا تھا۔اس نے ان سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔گڑیا کو آئیوڈیکس لانے کا کہہ کر وہ ان کے بیڈ کے پاس ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔گڑیا نے انہیں آئیوڈیکس لگائی تھی اور گرم گرم دودھ کے ساتھ پین کلر کھانے کو دی تھی۔

''اماں پلیز میری بات مان لیں''۔بڑی دیر بعد اس نے کہا تھا۔انہوں نے اپنے جوان مضبوط بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور تڑپ گئی تھیں۔

''ٹھیک ہے رومی جیسے تیری مرضی''۔اور انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔اس رات گڑیا نے اور اس نے پوری رات اماں کے سرہانے جاگ کر گزاری تھی اور اگلے روز سے ہی وہ ایک چھوٹے لیکن اچھے سے گھر کی تلاش کرنے لگا تھا۔وہ یہ گھر خریدنا چاہتا تھا، مستقل ٹھکانے کے طور پر۔ورنہ اس کی جہاں بھی پوسٹنگ ہوتی اماں اور گڑیا نے اس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔بالآخر اسے ایک اچھی سوسائٹی میں دس مرلے کا گھر پسند آ گیا تھا۔اِردگرد کے لوگ بھی اچھے تھے لیکن جب وہ اماں سے چیک لے کر گیا تو پتا چلا کہ ان کے اکاؤنٹ میں تو صرف دس ہزار ہیں، وہ

بنا کچھ کہے بینک سے گھر آ گیا تھا۔

''اماں آپ نے کبھی ابا کو چیک دیا، کوئی رقم......''

''ہاں دو دفعہ، انہیں رقم کی ضرورت تھی تو انہوں نے مانگے تھے مجھ سے''۔

''کتنے؟''

''ایک دفعہ پچاس ہزار اور ایک دفعہ دو لاکھ''۔

رومی خاموش تھا۔

''بیٹا وہ تمہارے باپ ہیں اور ماموں جان نے انہیں بیٹا بنایا تھا''۔

''اماں انہوں نے آپ کے اکاؤنٹ سے سب پیسہ نکلوا لیا ہے، آپ کے جعلی دستخط کر کے''۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اماں نے رومی اور گڑیا کے اکاؤنٹ میں بھی رقم جمع کروائی تھی۔

''بیٹا اپنے باپ کے خلاف کوئی کیس مت کرنا۔ کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ اتنی پراپرٹی ہے، کچھ فروخت کر دو اور گھر لے لو۔ اچھا سا ہی ایک بار......'' اور رومی اماں کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے اماں ابھی ہم کوئی گھر کرائے پر لے لیتے ہیں''۔ اور ابھی اسے کوئی گھر پسند ہی نہیں آیا تھا کہ وہ واقعہ ہو گیا۔ اماں لاؤنج میں بیٹھی تھیں اور ان کے چہرے پر ابھی بھی نیل پڑے ہوئے تھے۔ ماتھے پر گومڑ تھا۔

''اماں جی''۔ وہ ان کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''میں نے آج ایک گھر لے لیا ہے کرائے پر بعد میں پھر اپنا لے لیں گے، آپ اپنی ضروری چیزیں پیک کر لیجئے گا''۔

''رومی کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے بیٹا، کیا ہم یہاں رہ کر سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکتے''۔

''اماں جی ہم نے اب تک اتنے سالوں میں کیا ٹھیک کر لیا ہے۔ ابا جی نہیں بدلیں گے اور مجھ سے آپ کی عزت نفس بار بار مجروح ہوتی نہیں دیکھی جاتی۔ میرے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے شاید ہمارے چلے جانے سے انہیں اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو جائے''۔

تب ہی ابا نے لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہمیشہ کی طرح وہ بہت شاندار لگ رہے تھے۔ ٹائی سے لے کر جوتے تک ہر چیز برانڈڈ تھی۔ ان کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے لاؤنج کے داخلی دروازے پر رک کر رومی اور اماں کی طرف دیکھا۔ ابھی تک اماں کا ہاتھ رومی کے ہاتھ میں تھا۔

''تو دل جوئیاں ہو رہی ہیں ماں کی''۔ لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ اور لہجے میں تلخی......

رومی نے کچھ نہیں کہا تھا بس ایک شاکی نظر ان پر ڈالی تھی اور پھر نظریں جھکا لی تھیں۔

''یہ میرے پیچھے ماں کو کس راستے پر لگا دیا تھا تو نے''۔ رومی نے اُلجھ کر انہیں دیکھا۔

''میں سمجھا نہیں ابا؟''

''سنا ہے بڑی پارٹیوں شارٹیوں میں لے جاتا تھا اپنے افسروں کو پیش کرتا......''

''ابا جی......'' رومی زور سے دھاڑا تھا ''اس سے آگے ایک لفظ مت کہیے گا نہیں تو......''

''نہیں تو کیا کرے گا تو''۔ انہوں نے ہاتھ دیوار پر رکھا۔ رومی نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ اماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ رومی نے مڑ کر دیکھا۔ اماں کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

''یہ آپ کے گندے خون کا اثر ہے کہ آپ کی سوچ اتنی گھٹیا ہے''۔

''اچھا میرا خون گندہ ہے......تو کس کا خون ہے کیا کسی اور کا''۔

''میرے وجود میں میری ماں کا خون بھی ہے جو آپ کے خون پر غالب آ گیا ہے''۔

''اچھا میں سمجھا کسی اور کا خون ہے''۔ طنزیہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

''ابا......'' اب کے اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ ''آپ کو میری ماں کی پاکیزگی پر الزام لگاتے ہوئے شرم آنی چاہیے''۔

''اچھا''۔ وہ تیر چلا کر واپس مڑے اور انہوں نے دروازہ کھول کر نازو کو آواز دی تھی۔

''اندر آ جاؤ، باہر ہی کھڑی ہو گئی ہو''۔ نازو اندر آئی تھی۔ شرماتی لجاتی، دوپٹے کے کونے کو انگلی پر لپیٹتی۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس، کسی مہنگے بوتیک سے خریدا گیا وہ سوٹ اس کے جسم پر اجنبی سا لگ رہا تھا۔

''میں نے نازو سے شادی کر لی ہے''۔ انہوں نے ایک اور تیر چلایا تھا...... ''اور اب تم اپنی ماں کو یہاں سے لے کر دفع ہو جاؤ''۔ حیرت کا جھٹکا کھا کر رومی نے نازو کو دیکھا۔ سولہ سترہ سال کی نازو......اَن پڑھ جاہل......اس کی اتنی شاندار، باوقار اور میٹرک پاس ماں انہیں ساری زندگی احمق اور جاہل دکھتی رہی تھی اور اب یہ نازو......کیا یہ کیمبرج یا آکسفورڈ سے پڑھ کر آئی تھی۔

اماں کا ہاتھ اس کے بازو سے ہٹ گیا تھا۔ ابا نازو کا ہاتھ پکڑے گیسٹ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا، وہ ساکت بیٹھی تھیں اور سامنے دیوار کو سپاٹ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اماں جی''۔ اس نے ان کا بازو ہلایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

ان کی نظروں کے خالی پن سے گھبرا کر اس نے انہیں جھنجوڑ ڈالا۔

"اماں......اماں جی"۔ وہ لہرا کر اس کی گود میں آ گری تھیں اور وہ ان کے رُخسار تھپتھپا رہا تھا۔ انہیں آوازیں دے رہا تھا لیکن وہ پتھر کی طرح ساکت پڑی تھیں۔

☆☆☆

بھاگتے ہوئے وہ پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ یک دم بھاگتے بھاگتے اس کا پاؤں مڑ گیا۔ وہ یک دم پاؤں پکڑ کر بیٹھی تھی اور اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ تو ڈاکٹر کے کلینک کی طرف بھاگی تھی لیکن یہ گلی تو کوئی اور تھی۔ پاؤں کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے اس نے اُٹھنے کی کوشش کی تب اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو بے اختیار اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ نوشیرواں تھا۔

"سیمل......سیمل کیا ہوا۔ آپ کس سے خوف زدہ ہو کر بھاگی تھیں۔ میں تھا نا آپ کے ساتھ، آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے غیر ارادی طور پر قریب آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔

"کوئی میری لاش سے گزر کر ہی آپ کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہم قبائلی لوگ اپنی عزت کے لیے جان سے گزر جاتے ہیں"۔

"وہ بس ایسے ہی میں ڈر گئی"۔ وہ ہکلائی تھی۔

"او کے چلیں ابھی گھر چل کر تفصیل سے بات ہوتی ہے"۔

"مگر وہ...... وہاں...... روڈ پر تو میں نے خود انہیں یوٹرن سے گاڑی موڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا مجھے آپ کے ساتھ کھڑے"۔ وہ زرد ہو رہی تھی۔ نوشیرواں نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور تسلی کے سے انداز میں مسکرایا۔

"میں ہوں نا آپ کے ساتھ"۔ لیکن وہ یوں ہی گھبرائی سی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی جیسے ابھی کسی گلی سے وہ نکل آئیں گے۔

"او کے ہم یہاں پچھلی گلی سے نکل کر چوک پر پہنچ جائیں گے اور وہاں سے پھر رکشا کر لیں گے"۔

"آپ کو پتا ہے ان رستوں کا"۔

"ہاں......" وہ مسکرایا۔

"رستے نہ بھی پتا ہوں تو تلاش کرنے کا ہنر آتا ہے مجھے"۔ وہ چپ چاپ اس کے

ساتھ چل رہی تھی۔ سہمی سہمی خوف زدہ سی۔

پھر نوشیرواں نے ایسا ہی کیا تھا، جانے کن کن گلیوں سے نکل کر وہ چوک پر آ گئے تھے، وہاں سے رکشا کر کے جب وہ اپنی گلی میں گھر کے سامنے پہنچی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

"تھینک یو"۔ اس نے متشکر نظروں سے اسے دیکھا۔ "یہ دوسری بار ہے جب آپ نے میری مدد کی"۔

"تو کبھی آپ بھی ہماری مدد کر دیجیے گا"۔

"میں بھلا کیا مدد کر سکتی ہوں آپ کی"۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"وقت آنے پر بتا دیں گے"۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو نوشیرواں نے پوچھا۔

"کیا وہ یہاں بھی آ سکتا ہے"۔

"نہیں......انہیں اس گھر کا پتا نہیں ہے......" جواب دے کر وہ پھر دستک دینے لگی۔ دیر ہو گئی تھی، اماں شاید جاگ گئیں ہوں گی، اس نے سوچا تب ہی فضیلت نے دروازہ کھول دیا۔

"اماں جاگ گئیں کیا؟"

"نہیں"۔ فضیلت جواب دے کر پلٹ گئی۔ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے دیکھا وہ بھی اپنے گھر جا رہا تھا۔

اماں کے کمرے میں آ کر اس نے چادر اُتارنے سے پہلے اے سی آن کیا۔ اماں کروٹ کے بل سو رہی تھیں۔ چادر کے پلو سے چہرہ پونچھتے ہوئے وہ اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اطمینان کی سانس لی، جیسے وہ کسی محفوظ پناہ گاہ میں آ گئی ہو، پھر اس کی نظر اپنے دائیں ہاتھ پر پڑی اور اسے لگا جیسے نوشیرواں کا لمس زندہ ہو گیا ہو۔ کلائی پر جہاں سے نوشیرواں نے اسے پکڑ کر اُٹھایا تھا جیسے اب بھی وہ اس کے ہاتھ کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ "یہ نوشیرواں......"

"نہیں بھلا میں کیوں اس کے متعلق سوچ رہی ہوں"۔ اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور فضیلت کو آواز دی۔

"ایک گلاس پانی پلا دو"۔

"میں چلی جاؤں جی"۔ پانی کے گلاس کے ساتھ ہی فضیلت فرمائشیں لیے کھڑی تھی۔

"کیوں؟"

"آپ تو گھر میں ہو نا جی اماں جی کے پاس"۔

"ہاں......لیکن"۔

"وہ جی کام تو میں نے سارا کر دیا ہے۔ صفائی، برتن، آٹا بھی گوندھ دیا ہے۔ بس جی ہانڈی آپ خود بنالینا۔ کپڑے میں کل دھولوں گی آ کر"۔

"تمہیں پتا ہے فضیلت میں کام کی وجہ سے نہیں اپنی تنہائی کی وجہ سے شام تک تمہیں روکتی ہوں۔ میرا دل گھبراتا ہے اکیلے، ورنہ اتوار والے دن تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا"۔

"وہ تو جی ٹھیک ہے پر مجھے آج کام سے جانا تھا۔ آپ کا دل بہت گھبرائے تو آپ اُدھر میراں اماں کی طرف چلے جانا۔ اماں جی کو بھی لے جانا۔ اچھا ہے ہر وقت گھر میں رہتی ہیں، کہیں آتی جاتی بھی نہیں، خوش ہوں گی دیکھ لینا"۔ وہ مشورے دے کر چلی گئی تھی لیکن سیمل کو اس کا مشورہ پسند آیا تھا۔

"ہاں، اماں تو ہمیشہ گھر میں رہتی ہیں۔ اگر میں انہیں کہیں لے جایا کروں تو شاید ان پر اچھا اثر پڑے۔ شام کو اور کبھی رات کو۔ سب بلاک کی اکثر عورتیں پارک میں واک کے لیے جاتی تھیں۔ میں بھی اماں کو لے جاؤں گی"۔ اس نے فیصلہ کیا۔

کھانا تیار کر کے اس نے اماں کو اُٹھایا، پھر اماں کو نہلا کر کپڑے بدلوا کے ان کے بال بنائے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ اماں کو نہانے کے لیے واش روم چھوڑ کر آتی تو وہ گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی تھیں۔ تب وہ نہانے میں ان کی مدد کرنے لگی تھی۔ ان کے بال سلجھاتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح باتیں کرتی رہی۔ اس نے انہیں آج کے واقعے کے متعلق بھی بتایا تھا۔

"اماں ہم مروان کے بغیر کتنے تنہا ہیں۔ ہمیں کتنی ضرورت تھی نا اس کے...... ہر قدم پر، ہر لمحے......" اس نے دیکھا مروان کے نام پر اماں نے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ پھر سر جھکا لیا تھا۔

"اماں کبھی کبھی میں بہت تھکنے لگتی ہوں۔ جی چاہتا ہے میں اور آپ کچھ کھا کر سو جائیں۔ ہمیشہ کی گہری نیند"۔ اماں نے جھرجھری لی تھی۔ ان کی چٹیا بنا کر وہ ان کے سامنے آ بیٹھی، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"اماں جی"۔ اس نے ان کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"یوں لگتا ہے اماں جیسے اس بھری دُنیا میں صرف ہم دونوں ہی ہیں جو بالکل تنہا ہیں اکیلے...... کوئی اپنا نہیں...... کیوں نہ اماں ایسا کریں کسی دن دونوں گھر سے نکل چلیں اور ریل کی پٹری پر جا کر لیٹ جائیں اور پھر کوئی ریل ہمیں کچلتی ہوئی چلی جائے اور بس سب دُکھوں کا خاتمہ ہو جائے"۔ پتا نہیں کیوں آج وہ اتنی قنوطی ہو رہی تھی اور اتنی مایوس، حالانکہ مروان اسے کتنا سمجھاتا تھا۔

"سیمل یہ زندگی بہت مشکل ہے۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ تمہارا ہاتھ پکڑ کر نہیں چلوں گا۔ کچھ لمحے ایسے بھی آئیں گے جب تمہیں اکیلے چلنا پڑے گا پھر کیا کرو گی۔ بیٹا ان لمحوں کے لیے خود کو بہادر بناؤ۔ یہ ڈر جو تمہارے اندر بیٹھ گیا ہے، اسے دل سے نکال دو"۔ وہ مروان کے متعلق سوچنے لگی تھی اور اسے محسوس بھی نہیں ہوا تھا کہ اماں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں اور اس کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھ رہی تھیں، اس کا دھیان نہیں تھا لیکن پھر اسے سکون مل رہا تھا اور پھر وہ یونہی سوچتے سوچتے اماں کی گود میں سر رکھے سوگئی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی، وہ یونہی سوتی رہی۔ پھر شاید کوئی آہٹ ہوئی تھی یا یونہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی، وہ ابھی تک اماں کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اور اماں اس طرح بیٹھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سپاٹ، خالی آنکھوں میں محبتوں کے رنگ جھلملاتے صاف نظر آ رہے تھے۔

"اماں جی"۔ وہ یک دم اُٹھ کر ان سے لپٹ گئی۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ اماں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا...... اور ہولے ہولے اسے تھپک رہی تھیں۔

"اماں جی"۔ اس نے ان سے الگ ہو کر ان کے ہاتھ چومے اور پھر ان کے گھٹنے دبانے لگی۔

"اماں جی۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں"۔ اماں اسی محبت سے اسے دیکھتی رہیں۔ اس کا جی چاہا وہ گول گول چک پھیریاں کھائے، خوش ہو، اماں نے کتنے سالوں بعد اسے یوں محبت سے دیکھا تھا۔

"مروان...... مروان......" وہ اسے بتانے کے لیے باہر بھاگی پھر پلٹ آئی۔

"اماں جی، آج آپ نے دوائی بھی نہیں کھائی"۔ پھر اس نے انہیں ان کی ٹیبلٹ دیں اور چائے کا پوچھا۔

"نہیں"۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا پھر لیٹ جائیں، تھک گئی ہوں گی"۔ انہیں لٹا کر وہ اپنی کتابیں لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اسے نوٹس تیار کرنا تھے لیکن پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ابھی صرف پانچ بجے تھے اور باہر پورے صحن میں دھوپ پھیلی تھی...... اسے پھر نوشیرواں کا خیال آ گیا۔ اس کی نظر اپنی کلائی پر پڑی۔ وہ کتنی ہی دیر کلائی کو دیکھتی رہی اور پھر کتاب پر نظریں جما لیں لیکن لفظ آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ کتابوں کے صفحوں میں سے جیسے نوشیرواں جھانکنے لگا تھا۔

اس نے جھنجلا کر کتاب بند کر دی۔ اماں بیڈ پر لیٹی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ آج ڈاکٹر نے دوائیں بدل دی تھیں ورنہ اماں دوا کھاتے ہی سو جاتی تھیں۔ وہ اُٹھ کر ان کے پاس آئی۔

''اماں جی، سکنج بین بنا کر لے آؤں؟'' انہوں نے سر ہلایا تھا۔ وہ ایک بار پھر حیران ہوئی تھی۔ وہ تو ہمیشہ ہی اماں سے ہر بات پوچھتی تھی عادتاً۔ اماں نے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جلدی جلدی کچن میں گئی اور سکنج بین بنا کر لے آئی۔

''بہت گرمی ہے آج...... ہیں نا''۔ اس نے گلاس انہیں پکڑاتے ہوئے کہا۔ آپ کو یاد ہے نا جب مروان ایسے موسم میں یہاں ہوتا تو روز ہی سکنج بین بنوا کر پیتا تھا''۔ اماں بس غور سے اسے دیکھ رہی تھیں، پتا نہیں اس کے چہرے میں کیا کھوج رہی تھیں۔

مغرب کے بعد وہ اماں کو ساتھ لے کر میراں اماں کے گھر آئی۔ یہ پہلی بار تھا جب وہ ڈاکٹر کے علاوہ اماں کو کہیں لے کر آئی تھی۔ دروازہ میراں اماں نے ہی کھولا تھا اور انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں۔

''یہ تم نے اچھا کیا یسل...... امینہ بہن کو لے آئیں، میں صبح بھی شیری سے کہہ رہی تھی۔ اکیلی بچی ہے ماں کو کہیں لے جا بھی نہیں سکتی کہ ان کا دل بہلے''۔ وہ ان کے ساتھ برآمدے تک آئی۔ یہاں بھی برآمدے میں بالکل ویسا ہی تخت بچھا تھا جیسا ان کے ہاں تھا اور غالباً یہاں بھی پہلے سے موجود تھا اور ان کے آنے سے پہلے میراں اماں شاید یہیں بیٹھی تھیں کیونکہ تخت پر ان کی جائے نماز تہہ کی ہوئی پڑی تھی اور پاس ہی تسبیح پڑی تھی۔

''یہاں ہی بیٹھ جاتے ہیں اماں جان''۔ انہیں اندر کی طرف جاتے دیکھ کر اس نے کہا اور برآمدے کے دائیں طرف پڑی کرسی اُٹھا لائی اور تخت کے قریب رکھ کر اماں کو اس پر بٹھایا اور خود تخت پوش پر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''بچہ یہ ادھر اس کمرے میں شیری ہوگا، ذرا اسے تو بلا لا دوڑ کر بازار سے کچھ لے آئے اور چائے کا پانی رکھ دے''۔

''نہیں، اماں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے''۔

''تکلف نہیں بچہ ہماری خوشی۔ امینہ بہن پہلی دفعہ ہمارے گھر آئی ہیں۔ جا شاباش بچہ......'' وہ جھجکتے ہوئے اُٹھی، اماں کی طرف دیکھا۔ اماں بے نیازی بیٹھی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور نوشیرواں ایک میز کے پاس کھڑا تھا۔ دروازے کے پاس جا کر وہ رُک گئی۔ نوشیرواں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اسکیل تھا۔

''آ جائیں...... میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا''۔

''جی...... میرا...... لیکن آپ کو کیسے پتا چلا میں آج اِدھر آؤں گی''۔ اسے حیرت ہوئی۔

''میرے وجدان نے مجھے بتایا تھا''۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ اُبھری اور آنکھوں میں کوندا سا لپکا تھا۔ وہ حیران سی دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

''آ جائیں نا، رُک کیوں گئی ہیں''۔

''کیا آپ سچ مچ میں کوئی نجومی ہیں؟'' اسے اپنی صبح والی بات یاد آئی تو بے اختیار پوچھ بیٹھی۔ نوشیرواں ہنسا اور ہنسی نے اس کا پورا چہرہ روشن کر دیا تھا۔

''دراصل یہ میرے دل کی خواہش تھی یسل بی بی، جسے میں نے انتظار کا نام دیا، ورنہ میں ان معنوں میں ہرگز نجومی نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں''۔ وہ اس کے لفظوں پر غور کرتے ہوئے اندر کمرے میں آئی تو اس کی نظر میز پر پڑی۔ میز پر ایک بڑا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ کئی جگہوں پر سرخ نشان لگے تھے۔

''یہ آپ کیا کر رہے تھے''۔

''میں یہ نقشہ دیکھ رہا تھا۔ یہ کارگل ہے، یہ چھوٹا سا قصبہ ہے اور یہ کارگل کا پہاڑی سلسلہ ہے جو تقریباً 44 میل لمبا اور 7 میل چوڑا ہے''۔ وہ ذرا سا منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے نقشے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''سوری''۔ وہ چونکا۔ ''میں خوامخواہ آپ کو بور کرنے لگا۔ دراصل یہ میرا ایک ویک پوائنٹ ہے۔ کارگل۔ ابھی جب آپ آئیں تو میں تصور ہی تصور میں خود کو کارگل سیکٹر میں دیکھ رہا تھا۔ یہی جون کا مہینہ تھا جب میں......'' وہ نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی شاید اس نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی تب ہی بات ادھوری چھوڑ کر وہ اسے دیکھنے لگا۔

''بیٹھیں نا پلیز، مجھے آپ سے کچھ باتیں بھی کرنا تھیں''۔

''وہ میں......'' وہ چونکی تھی۔ ''اماں جان نے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے مجھے''۔

وہ ایک گہری نظر اس پر ڈال کر نقشہ رول کرنے لگا۔ وہ یک دم بہت خاموش اور سنجیدہ لگنے لگی تھی۔

میراں اماں نے اس کے منع کرنے کے باوجود نوشیرواں کو بازار بھیج دیا تھا۔

''ناں بچہ...... امینہ بہن پہلی دفعہ میرے گھر آئی ہیں۔ کبھی کبھار انہیں گھر سے باہر کہیں لے جایا کرو، کبھی ہمارے ہاں، کبھی بازار......'' میراں اماں کہہ رہی تھیں لیکن اس کا ذہن اندر ٹیبل پر موجود نقشے کی طرف تھا، وہاں نقشے پر کارگل کے گرد سرخ دائرہ لگا ہوا تھا۔ کارگل جس کے متعلق

مروان نے اسے بتایا تھا۔

سائبیریا کے بعد دوسرا سرد ترین علاقہ ہے۔ یہاں کا درجہ حرارت منفی 60 ہے۔ یہاں برف ہی برف ہے۔ ٹھنڈ ہڈیوں میں اُتری جاتی ہے پھر بھی ہم اپنے مشن کی کامیابی تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہاں مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر حسام کھڑا ہوا ہے۔ کیسا بانکا جوان ہے' کبھی کبھی مجھے اس پر رشک آتا ہے۔ اس کے پاؤں Frostbite کے باعث گل چکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے لیکن یہ یہاں سے جانے کو تیار ہی نہیں۔ اس کا جذبۂ شہادت دیکھنے کے لائق ہے۔ یسمل پتا ہے جب بھی اسے آرام کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو مسکراتا ہے اور کہتا ہے کہ میں شہادت کے لیے چن لیا گیا ہوں۔ جب کبھی تمہارا اور اماں کا خیال مجھے کمزور کرنے لگتا ہے تو کیپٹن حسام کو دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے''۔ وہ ہاتھ گود میں دھرے سامنے صحن کی دیوار کو دیکھ رہی تھی اور اس کے سامنے کارگل کے برف زار تھے پھر برف زاروں پر خون پھیل گیا۔ سفیدی سرخی میں بدل گئی۔

''یسمل بچہ......'' میراں اماں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''بچہ اندر کچن میں جا کر چائے کا پانی رکھ دے۔ شیری آتا ہوگا۔ چائے وہ آکر بنا دے گا''۔

''میں چائے بنالوں گی اماں جان''۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن سامنے ہی تھا صحن میں دائیں طرف، کچن کے آگے شیڈ سا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے اس کے گھر میں تھا۔ جاتے جاتے اس نے دیکھا۔ اماں کا ہاتھ میراں اماں کے ہاتھ میں تھا۔ اماں کی آنکھوں میں چمک تھی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ۔ اماں کو میراں اماں کی باتیں پسند آرہی تھیں۔ ان کی آنکھیں اس کا رسپونس دے رہی تھی اور یہ کتنی بڑی کامیابی تھی۔ ڈاکٹر عرفان بہت پُر جوش تھے، انہوں نے تاکید کی تھی کہ وہ اگلے ہفتے اماں کو ضرور لے کر آئے۔ وہ خود ان کے ساتھ ایک میٹنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ابھی تک مروان کو اماں کی اس امپروومنٹ کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ یہاں سے جا کر پہلے وہ مروان کو بتائے گی اماں کے متعلق۔

کچن میں جا کر اس نے چائے کا پانی رکھا۔ پھر اس کی نظر ٹرالی پر پڑی تو اس نے ٹرالی میں پلیٹیں چمچ شوگر پاٹ وغیرہ رکھے۔ اب پتا نہیں نوشیرواں کیا کیا لے کر آتا ہے۔ اس نے صافی اُٹھا کر کاؤنٹر پر گرا پانی پونچھا، تب ہی نوشیرواں شاپر اُٹھائے کچن میں آیا۔

''ارے، آپ نے کیوں تکلیف کی، میں کر لیتا خود آکر''۔

''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی''۔ اس نے نوشیرواں کے ہاتھ سے شاپر لے لیے۔

''ارے، یہ اتنا کچھ کیوں اُٹھا لائے ہیں آپ۔ اماں کی خوراک تو بالکل کم ہے''۔

''دل کی خوشی کے لیے''۔ اس نے زیرِ لب کہا تھا۔ وہ آہستگی سے کہہ کر کیبنٹ سے ڈشز اور پلیٹیں نکالنے لگا۔ دہی بلے، میڈیم سائز پزا، کیک، پیٹیز، چکن رول، نمکو اور جانے کیا کیا۔

''لگتا ہے آپ نے ہمیں بہت پیٹو سمجھ لیا یا آپ کا خیال ہے کہ ہم کسی قحط زدہ علاقے سے آئے ہیں''۔ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ وہ کیبنٹ سے نکالی جانے والی پلیٹوں کو صافی سے پونچھنے لگا۔ یسمل ان میں سامان رکھنے لگی۔

کاش کوئی یہ منظر ہمیشہ کے لیے یہیں ہی ساکت کر دیتا......ایک مکمل مطمئن ہیپی فیملی کا یہ منظر......اس کے اندر حسرت نے چٹکی بھری۔ وہ ایک مکمل، خوش اور مطمئن گھر کو ترسا ہوا تھا۔ وہ ٹرالی لے کر باہر جانے لگا۔

''آپ بھی آجائیں، چائے میں آکر بنالیتا ہوں''۔

''میرا خیال ہے میں بھی چائے اچھی ہی بنالیتی ہوں''۔

''آپ......'' وہ رُکا۔ ''آپ تو سب ہی کچھ اچھا کرتی ہوں گی سیم، مجھے یقین ہے''۔

اس کی آواز یسمل کو بوجھل سی لگی لیکن وہ سر جھٹک کر ٹی پاٹ میں پتی ڈالنے لگی۔

چائے دم کر کے وہ واپس آئی تو وہ اماں کو اپنے ہاتھ سے پزا توڑ توڑ کر کھلاتے ہوئے نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہا تھا۔ اماں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی بالکل ایسا ہی ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا تھا۔ نوشیرواں کی جگہ مروان تھا اور اماں کے منہ میں یونہی پزا کے نوالے بنا بنا کر ڈال رہا تھا۔ اماں ہنس رہی تھیں اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر منع کر رہی تھیں۔

''میں خود کھالوں گی بیٹا......بس مجھے پزا کچھ خاص پسند نہیں ہے۔ اچھا دو میں خود کھا لیتی ہوں''۔ اس کے کانوں میں اماں کی آواز آرہی تھی اور پھر مروان کی آواز......

''نہیں آج تو میں اپنی اماں کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا''۔ یک دم اماں نے نوشیرواں کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''میں خود کھالوں گی'' اور پھر چونک کر انہوں نے نوشیرواں کے بازو سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ اب وہ اجنبی نظروں سے نوشیرواں کو دیکھ رہی تھیں۔

یسمل اماں کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ بھی اسی منظر میں چلی گئی تھیں۔ پیچھے کئی سال

پہلے...... یسمل کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میراں اماں اور نوشیرواں کے خیال سے اس نے دل پر جبر کر کے ساری چیزیں ہی چکھی تھیں۔ نوشیرواں نے کئی بار نظر اُٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر جب اس نے چائے بنا کر سب کو دی تو نوشیرواں نے ایک گھونٹ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ واقعی بہت اچھی چائے بناتی ہیں۔ مجھ سے کبھی ایسی چائے نہیں بنی۔ کبھی کڑوی ہو جاتی ہے، کبھی بالکل ہی پتی کم......"

"مجھے مردان نے چائے بنانا سکھائی تھی"۔ یسمل مسکرائی۔

"اچھا تو آپ مجھے سکھا دیجئے گا"۔ اس نے سر ہلایا۔ عشاء کی اذان کے بعد وہ گھر جانے کے لیے اُٹھی تھی۔ اماں ساتھ نہ ہوتیں تو وہ سیڑھی پر چڑھ کر دوسری طرف اُتر جاتی لیکن اب اماں ساتھ تھیں اور اسے گلی سے جانا تھا۔ وہ اُٹھی تو نوشیرواں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آیئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں"۔

"نہیں یہ ساتھ تو گھر ہے"۔ اس نے منع کیا تھا لیکن نوشیرواں بنا کچھ کہے ان کے ساتھ ہو لیا تھا۔ اس کا یہ کیئرنگ انداز یسمل کو اچھا لگا تھا۔ دروازے کا لاک کھول کر اس نے اندر قدم رکھا اور اماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اللہ حافظ......" نوشیرواں کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

"اللہ حافظ......" اماں اس سے ہاتھ چھڑا کر برآمدے کی طرف جا رہی تھیں۔

"دوسروں کی دل آزاری نہ کرنا اور ان کا خیال رکھنا اچھی بات ہے لیکن اتنا جبر بھی اچھا نہیں ہوتا"۔

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا۔

"آپ کا جی نہیں چاہ رہا تھا کچھ کھانے کو لیکن آپ ہمارے خیال سے...... بہت شکریہ لیکن مجھے آپ کا خود پر جبر کرنا......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ وہ تو اماں کی طرف متوجہ تھا پھر اس نے کب اسے مانیٹر کیا تھا...... وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گلی میں جلتے بلب کی روشنی نوشیرواں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ براؤن آنکھیں، خم دار پلکیں، دراز قد۔ یسمل نے نظریں جھکا لیں۔

"کیا مردان کا خیال آ گیا تھا آپ کو؟" اس نے اچانک کہا تھا۔

"ہاں"۔ وہ چونکے بغیر بولی۔

"مردان بالکل آپ کی طرح کبھی کبھی اماں کو نوالے بنا کر کھلاتا تھا"۔

"آپ مردان کو اتنا مس کرتی ہیں تو اسے بلا کیوں نہیں لیتیں۔ کیا اس کا آنا بہت

مشکل ہے۔

وہ دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑی تھی۔

"آپ مردان کو کہیں...... اماں کی خاطر وہ ایک چکر لگا جائے۔ اماں کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔ اسے ہر صورت آنا ہو گا یسمل، اماں کی صحت کے لیے یہ سب ضروری ہے"۔ پتا نہیں کب اس نے اماں کو اماں کہنا شروع کیا تھا۔ یسمل نے اب کے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر جانے کے بجائے سامنے والی گلی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس نے اسے گلی کا موڑ مڑتے دیکھا اور پھر دروازہ بند کر کے اس نے اماں کی طرف دیکھا، وہ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ چکی تھیں۔ دروازے سے ٹیک لگائے ہوئے اس کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ "اسے ہر صورت آنا ہو گا...... مگر کیسے...... کیسے آئے گا وہ اتنی دور سے۔ مردان آ جاؤ، پلیز......" روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اماں پتا نہیں کب اُٹھ کر اس کے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی اور ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

"اماں مردان...... وہ کیوں نہیں آتا ہمارے پاس...... ہمیں اس کی بہت ضرورت ہے، بہت زیادہ......" اماں اسے تھپک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں اور رخساروں کو چوم رہی تھیں اور وہ مردان کو پکار پکار کر رو رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اماں کی نگران اور محافظ بنی ہوئی تھی اور آج اماں اس کی نگران بن گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ پھر اس کے ہاتھ پکڑے پکڑے اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ اماں نے اسے بیڈ پر لیٹنے کے لیے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گئی تو وہ واش روم سے تولیہ گیلا کر کے لے آئیں۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کیا، پھر اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگیں۔ اماں کے ہاتھوں کے لمس میں کتنا سکون تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے پھر آنسو مچل اُٹھے تھے لیکن اس نے ان آنسوؤں کو بہنے نہ دیا۔ اماں ہولے ہولے اس کا سر دبا رہی تھیں۔ بند آنکھوں کے سامنے نوشیرواں کا سراپا آ گیا۔ ایک پاؤں پر زور دے کر بڑے بڑے قدم اُٹھا کر گلی کے کونے میں غائب ہوتا ہوا، گلی میں جلنے والے بلب کی روشنی میں اس کا دراز قد کتنا نمایاں ہو رہا تھا اور پتا نہیں اس نے مجھ سے کیا باتیں کرنا تھیں، سوچتے سوچتے جانے کب وہ سو گئی تھی۔

☆☆☆

تین بیڈ روم کا یہ چھوٹا سا گھر بالکل نیا بنا ہوا تھا۔ رومی نے چند ہی دنوں میں گھر کو کسی

حد تک فرنشڈ کر لیا تھا۔ جب وہ گڑیا اور اماں کو لے کر گھر آیا تو گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اماں کو وہ سیدھے اسپتال سے اِدھر ہی لایا تھا اور پھر گڑیا کے ساتھ وہ گھر سے اپنی گڑیا اور اماں کی ضروری چیزیں لینے گیا تھا۔ ابا اپنے آفس میں تھے، گھر میں نازو تھی اور ایک نئی ملازمہ۔ نازو لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں پاؤں صوفے پر رکھے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اور اس کی گود میں دھری پلیٹ ڈرائی فروٹ سے بھری ہوئی تھی اور مزے سے کھاتے ہوئے وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جونہی رومی نے اندر قدم رکھا وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی تو اس کی گود سے پلیٹ نیچے کارپٹ پر گر گئی اور کاجو، اخروٹ، بادام اور کشمش نیچے کارپٹ پر بکھر گئے۔ وہ یک دم نیچے بیٹھ کر انہیں اُٹھانے لگی۔ ایک ناگوار سی نظر اس پر ڈالتا ہوا گڑیا کا ہاتھ پکڑے وہ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ جب ضروری سامان پیک کر کے وہ نیچے اُترے تو نازو پھر پہلی پوزیشن میں بیٹھی فلم دیکھتے ہوئے کاجو کھائے جا رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر بے نیازی سے فلم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سارا سامان گاڑی میں رکھ کر وہ پھر واپس آیا اور گڑیا کو نیچے لاؤنج میں کھڑا کر کے وہ اوپر گیا۔ کتابوں والا بیگ اوپر ہی رہ گیا تھا۔ جب وہ بیگ لے کر نیچے آیا تو گڑیا ریلنگ پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔

کیا ہوا گڑیا؟'' بیگ آخری سیڑھی پر رکھ کر وہ تیزی سے گڑیا کی طرف لپکا۔

''کیا نازو نے کچھ کہا؟'' اس نے گھور کر نازو کی طرف دیکھا، جو ایک بار پھر بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''نہیں''۔ گڑیا نے نفی میں سر ہلایا اور تیزی کے ساتھ ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے تھے۔

''بس ایسے ہی مجھے لگا رومی بھائی جیسے میں ہوم سویٹ ہوم کی نیلی ہوں اور مجھے نیلی یاد آ گئی تھی۔ اسے جب اپنا گھر چھوڑنا پڑا ہو گا تو اسے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔ ہے نا......؟'' رومی نے ایک ہاتھ میں بیگ اُٹھاتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا...... وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا اور اس وقت گڑیا کے دل کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔

''ہاں گڑیا اسے بہت تکلیف ہوئی ہو گی۔ اتنی ہی تکلیف، جتنی آج تمہیں ہو رہی ہے لیکن کبھی کبھی اچھے مستقبل کے لیے یہ تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ آؤ......'' گڑیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''اپنا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا گڑیا''۔ اس کی آواز میں آنسو گھلے تھے لیکن اس کی آنکھیں شفاف تھیں۔ پورچ کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے اس نے مڑ کر اندرونی دروازے کو دیکھا۔

لکڑی کا یہ بھاری منقش دروازہ انتہائی خوب صورت تھا۔ اماں نے اسے بتایا تھا کہ ان کے گاؤں کے ایک مستری جس نے ان کی حویلی میں لکڑی کا کام کیا تھا، یہ دروازہ پورے چھ ماہ میں بنایا تھا۔ انتہائی خوب صورت کام تھا۔ وہ لمحہ بھر یونہی مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔

''میں اس گھر سے کبھی بھی نہیں جانا چاہتا تھا گڑیا، کبھی بھی نہیں...... میں نے ہمیشہ اماں ابا اور تمہارے ساتھ ایک مکمل گھر کی دُعا کی تھی لیکن کبھی کبھی دُکھ برداشت کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے''۔ وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھا تھا۔ بیگ ڈگی میں رکھ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اندرونی گیٹ کھول کر تیز تیز چلتے ہوئے ابا باہر نکلے تھے۔ شاید وہ سو رہے تھے، یا اپنے کمرے میں تھے اور اس نے سوچا تھا کہ وہ آفس میں ہیں۔ وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔ چوکی دار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ ''رکو......'' وہ پورچ کی سیڑھیاں اُتر کر آئے۔

''گڑیا تمہارے ساتھ نہیں جائے گی''۔

''کیوں......؟''

''مجھے تم پر اور اس احمق عورت پر اعتبار نہیں ہے''۔

''اور مجھے آپ پر اعتبار نہیں ہے''۔ رومی نے جواب دیا تھا۔ اس کے برابر بیٹھی گڑیا کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

''گڑیا یہاں رہے گی، اپنے باپ کے گھر''۔ وہ چلائے تھے۔

''گڑیا اپنی ماں کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر رہے گی ابا جی۔ آپ کے پاس آپ کی بیوی ہے، جائیے اس کی جا کر ناز برداریاں کیجیے''۔ وہ تلملائے تھے۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو رومی''۔

''سوری، اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو''۔

''میں عدالت کے ذریعے گڑیا کو لے لوں گا''۔

''کوشش کر کے دیکھ لیجیے''۔ رومی مسکرایا تھا۔ ''عدالت ماں کا حق صائب مانتی ہے، بیٹی کے لیے''۔ اور پھر وہ تیزی سے گاڑی گیٹ سے نکال کر لے گیا تھا۔

نیا گھر اچھا تھا، وہاں سکون تھا۔ ابا کے جھگڑے نہیں تھے لیکن اماں ٹھیک نہیں تھیں، وہ جب سے اسپتال سے آئی تھیں بالکل چپ تھیں، جہاں بیٹھی ہوتیں وہیں بیٹھی رہتیں۔ رومی اور گڑیا کوئی بات کرتے تو خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہتیں۔ کبھی کبھی ان کی نظروں میں اتنا سپاٹ پن ہوتا کہ گڑیا گھبرا کر رونے لگتی۔ وہ جیسے اپنے اردگرد سے بے خبر ہو جاتیں۔ رومی نہیں

مختلف ڈاکٹروں کے پاس لیے پھرتا۔

''دراصل یہ سائیکولوجیکل شاک کی کیفیت ہے''۔ ڈاکٹر عمر نے کہا تھا۔ ''وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس شاک سے نکل آئیں گی۔ اس میں کچھ وقت لگ جائے گا''۔

''اندازاً کتنا......؟''

''کچھ کہا نہیں جاسکتا، کم بھی ہوسکتا ہے، زیادہ بھی......'' کبھی کبھی وہ بالکل نارمل لگتیں لیکن زیادہ تر وہ چپ رہتی تھیں۔

''انہیں تنہا مت رہنے دیا کریں، ان سے باتیں کیا کریں۔ بھلے وہ جواب دیں یا نہیں۔ زندگی کی سرگرمیوں میں انہیں انوالو کریں''۔

ہولے ہولے وہ گھریلو امور میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ کبھی پیاز کاٹ دی، کبھی ایسا ہی چھوٹا موٹا کام...... رومی نے گھر کے لیے ملازمہ کا بندوبست کردیا تھا۔ وہ جب بھی فارغ ہوتا اماں اور گڑیا کو آؤٹنگ پر لے جاتا۔ کبھی اماں کا موڈ نہ ہوتا تو وہ صرف گڑیا کو لے جاتا۔ ان دنوں گڑیا فارغ تھی اور اس نے اس کے ساتھ جاکر بے شمار کتابیں خریدی تھیں۔ رومی کو اماں کی بہت فکر تھی۔

''اماں کچھ بولا کریں نا''۔

''کیا بولوں؟'' بہت کم وہ جواب دیتیں۔

''کچھ بھی اماں......'' وہ ان کا ہاتھ تھام لیتا۔ ''جو آپ کے دل میں ہے''۔

''میرے دل میں......'' وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگتیں۔

''ہاں، آپ کا کیا جی چاہتا ہے اماں......؟ مجھے بتائیں نا؟''

''کچھ بھی نہیں''۔ وہ نفی میں سر ہلا دیتیں۔ وہ پریشان ہوجاتا، گڑیا رونے لگتی لیکن ڈاکٹر عمر بہت پُراُمید تھے۔

''وہ بات تو کرتی ہیں نا کبھی کبھی۔ یہ خوش آئند ہے''۔

ایک دن چوبیس گھنٹے کی مسلسل بے ہوشی کے بعد وہ ہوش میں آئی تھیں، تب رومی ان کے پاس اسپتال میں ان کے بیڈ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ نہیں تھے۔

''کوئی شدید ذہنی شاک......؟'' ڈاکٹر عمر نے رومی سے استفسار کیا تھا۔

''پتا نہیں کون سا صدمہ زیادہ شدید تھا''۔ رومی نے سوچا تھا۔ ''ان کے کردار پر کیچڑ اُچھالنے کا صدمہ...... یا پھر ان کی ملازمہ کو ان کی سوکن بنا کر سامنے لا کھڑا کرنے کا صدمہ......''

''اپنے پیشنٹ کا علاج کرنے کے لیے ڈاکٹر کو پیشنٹ کے حالات جاننا ضروری ہوتا ہے۔ جب ہمیں اس ذہنی شاک کا پس منظر پتا چلے گا تو ہمارے لیے آسانی ہوگی کیپٹن''۔ تب رومی نے مختصراً ابا کی دوسری شادی کے متعلق ڈاکٹر کو بتادیا تھا۔

''ہم پوری کوشش کریں گے لیکن آپ کو بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا تاکہ یہ اس کیفیت سے نکل آئیں''۔ رومی کسی ننھے بچے کی طرح اماں کا خیال رکھتا۔ کبھی کبھی نوالے بنا کر خود انہیں کھلاتا۔ اکثر انہیں اور گڑیا کو آؤٹنگ کے لیے لے جاتا۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ کافی امپروو کررہی ہیں۔ وہ بولتی نہیں تھیں لیکن ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے سے ان کے احساسات کا اظہار ہوتا۔ گڑیا کے میٹرک کا رزلٹ گلبرگ کے اس گھر میں آنے کے چند دن بعد ہی آگیا تھا۔ تب رومی انہیں باہر لے گیا تھا۔ اس نے گڑیا کو خوب صورت کتابوں کا سیٹ تحفے میں دیا تھا۔ تب اس روز اماں کے چہرے سے بھی خوشی کا اظہار ہورہا تھا۔ گڑیا کالج جانے لگی تھی۔ گھر میں ایک مستقل ملازمہ رومی نے رکھ لی تھی جو اس کے یونٹ کے کسی حوالدار کی عزیزہ تھی۔ وہ بیوہ تھی اور آگے پیچھے کوئی نہیں تھا سوائے ایک بیٹے کے جو ماں سے لاتعلق ہوچکا تھا۔ حوالدار اسے گاؤں سے لے آیا تھا۔ اس کے آنے سے رومی بہت مطمئن ہوگیا تھا۔ جب گڑیا کالج جاتی اور وہ اپنے یونٹ میں تو عذرا بی بی کے ہونے سے اسے کوئی فکر نہیں ہوتی۔ عذرا بی بی نے بھی اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھا تھا۔ گڑیا اور رومی انہیں خالہ جی کہہ کر بلاتے تھے۔

ابا اور نازو کیسے تھے۔ کس طرح کی زندگی گزار رہے تھے، گڑیا نہیں جانتی تھی۔ اسے ابا کی پسند پر حیرت ہوتی تھی اور وہ سوچتی تھی کہ کیا ابا نازو پر بھی یونہی چلاتے ہوں گے، جیسے اماں پر چلاتے تھے۔

''شاید......اور شاید نہیں......'' ایک روز اس نے رومی سے پوچھا تھا۔

''دراصل ابا خود پرست تھے بلکہ ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ پرفیکٹ ہیں حالانکہ اس دنیا میں کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ہے۔ کامل ذات تو صرف اللہ کی ہے''۔ رومی نے اسے سمجھایا تھا۔

ان دنوں رومی کو اسلامی کتب کے مطالعے کا بھی بہت شوق ہوگیا تھا۔ وہ خود خریدنے کے علاوہ آرمی کے میس سے بھی کتابیں پڑھنے کے لیے لاتا رہتا تھا۔

''دراصل ابا خود کو دُنیا کا حسین ترین مرد سمجھتے ہیں اور ذہین ترین بھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے لیے بیوی بھی ایسی ہی ہونا چاہیے لیکن جب ایک دیکھی بھالی لڑکی سے ان کی شادی ہوگئی جسے انہوں نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی اور جوان کی نظر میں ایک عام سی کم علم لڑکی تھی تو ان کی

خود پسندی اور خود پرستی نے اپنی انا کی تسکین کا یہ راستہ اپنایا...... اماں کی عزت نفس مجروح کر کے
وہ اپنے نفس کی تسکین کرنے لگے تھے"۔

"تو انہیں تو کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت تھی نا رومی بھائی"۔ گڑیا کے لبوں سے نکلا تھا۔

"ہاں، اچھا خیال ہے، کسی روز ملے تو میں انہیں ضرور مشورہ دوں گا"۔

"لیکن آپ نے میری بات کا جواب تو دیا ہی نہیں"۔

"کیا چندا......؟"

"وہ نازو......"

"دے تو دیا کہ شاید ہاں شاید نہیں لیکن ایک بات طے ہے بیٹا کہ ابا کی نازو سے نبھے
گی نہیں"۔

یہ رومی کا خیال تھا جبکہ گڑیا سوچتی تھی کہ ابا اور نازو مزے سے زندگی گزار رہے ہوں گے۔

اس روز وہ اماں کو معمول کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے۔

ڈاکٹر عمر اماں کی امپرومنٹ پر بہت خوش تھے۔

"اب یہ اپنے اردگرد کے ماحول میں دلچسپی لینے لگی ہیں اور اپنے اطراف کو محسوس
کرنے لگی ہیں۔ بہت جلد انشاء اللہ یہ نارمل لائف کی طرف واپس آ جائیں گی۔ بعض اوقات
چوٹ اس زاویے سے لگتی ہے کہ ان بریک ایبل گلاس بھی کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ اکثر مرد
شادی کر لیتے ہیں، دوسری عورتیں برداشت کر لیتی ہیں لیکن آپ کی اماں برداشت نہیں کر سکیں"۔

اس روز وہ واپسی پر بہت خوش تھے۔

"اماں نارمل ہو گئیں تو میں ایک بہت بڑی پارٹی دوں گا، تم بھی اپنی سہیلیوں کو بلانا،
سب کو...... جتنی بھی ہوں۔ دس، پندرہ، بیس، پچاس......" وہ مسکرایا تھا۔

"لیکن میری تو ایک سہیلی بھی نہیں ہے رومی بھائی......"

"ارے، ایک سال میں تم نے کوئی سہیلی نہیں بنائی کالج میں"۔ یہاں اس گھر میں
آئے انہیں ایک سال ہونے والا تھا۔

"نہیں"۔

"کیوں نہیں"۔

"پتا نہیں، بس میں آج تک کوئی سہیلی بنا ہی نہیں سکی"۔

"تو چلو آج سے میں تمہاری سہیلی بلکہ سہیلا"۔

"رومی بھائی آپ......" وہ ہنسی تھی۔ وہ اس سے گیارہ سال بڑا تھا اور اس کے ساتھ
بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا بلکہ کبھی کبھی بیٹا کہہ کر بھی بلا لیتا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا
تھا خود کو اور بھی بزرگ اور بڑا سمجھنے لگا تھا۔

"کیوں، میں اچھی سہیلی نہیں بن سکتا"۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ "یا تم مجھے سہیلی بنانا نہیں چاہتیں"۔

"نہیں تو...... آپ تو بہت اچھے ہیں رومی بھائی۔ لیکن سہیلیوں کے ساتھ ہر بات شیئر
کی جاتی ہے...... تو آپ کے ساتھ کیسے شیئر کروں گی"۔

"بھئی جیسے سہیلیوں کے ساتھ کرتی ہو، ویسے ہی میرے ساتھ کر لینا۔ آخر تم اپنے
رومی بھائی کے ساتھ بھی اپنی باتیں شیئر کرتی ہو نا، اپنے ٹیچرز کی، اپنی......"

"ہاں۔ تو اب رومی بھائی...... بھائی کے ساتھ دوست بھی بن جائیں گے...... ٹھیک"۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا اور رومی نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ اس رات اپنے
بیڈ پر لیٹنے کے بعد اس نے اماں کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا تھا۔

"رومی بھائی دنیا کے سب بھائیوں سے اچھے بھائی ہیں۔ بالکل "روزلی" کے بھائی
جیسے۔ اسے روزلی اور اس کے بھائی رچ کی کہانی بھی بہت پسند تھی اور رچ بھی روزلی کو رات
سونے سے پہلے کہانیاں سناتا تھا۔

روزلی جو چھ سال کی تھی تو اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی اور روزلی رچ کے
ساتھ چھ ماہ اپنے باپ کے ساتھ اور چھ ماہ ماں کے ساتھ رہتی تھی، جبکہ نہ ماں کو اُس کی پروا تھی، نہ
باپ کو اور پھر جب روزلی چودہ سال کی ہوئی تھی تو رچ کو جبری بھرتی کر کے ویت نام کی جنگ
میں بھیج دیا گیا تھا اور ایک روز اُس کی لاش آئی۔

"نہیں"۔ اس نے جھرجھری سی لی تھی۔ کتنے دنوں بعد آج پھر وہ روزلی کے لیے چپکے
چپکے روئی تھی اور رومی کہتا تھا، وہ کہانیوں میں خود کو اتنا انوالو نہ کرے۔ کہانی تو کہانی ہوتی ہے لیکن
کہانی حقیقت سے ہی تو جنم لیتی ہے یا پھر کبھی کبھی کہانی حقیقت میں ڈھل جاتی ہے۔

اور پھر اگلے کئی دن روٹین ہی کے گزر گئے۔ وہی کالج جانا۔ اماں اور رومی کو کالج کی ہر
بات بتانا۔ خالہ جی کے ساتھ کچن میں ان کا ہاتھ بٹانا۔ رومی کے ساتھ کبھی کبھی آؤٹنگ کے لیے
جانا، کبھی اماں کے ساتھ اور کبھی اکیلے۔ جب وہ اکیلے جاتے تو بانو بازار کی چاٹ کھانے ضرور
جاتے اور پھر واپسی پر پرانی کتابیں چھانتے، کبھی کبھی بہت اچھی کتابیں مل جاتی تھیں۔

اس روز بھی وہ فیروز سنز سے نکلے تھے۔ اماں گھر پر تھیں اور رومی کو اپنے لیے کتابیں

خریدنی تھیں۔ وہ کتابیں خرید کر باہر نکلے تو رومی کو کیپٹن عثمان مل گئے۔

"ارے تم یہاں؟" کیپٹن عثمان نے پوچھا تھا۔

"بس کچھ کتابیں لینے نکلا تھا۔ یہ میری چھوٹی بہن ہے"۔ کیپٹن عثمان نے مسکرا کر اسے وش کیا تھا۔

"یار کبھی لاؤ نا اپنی مدر اور سسٹر کو ہمارے گھر"۔

"ضرور"۔

وہ تینوں پارکنگ کی طرف جا رہے تھے۔ عثمان اور رومی ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھے جب اس نے ایک گاڑی سے ابا اور نازو کو اُترتے دیکھا تھا۔ شاید ابا نے نئی گاڑی لی تھی۔ اس نے گاڑی کا ماڈل دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ عین اسی وقت نازو کی نظر اس سے ملی تھی۔ یہ وہ ڈیڑھ سال پہلے والی نازو تو نہیں تھی۔ اس نے سلیقے سے میک اَپ کیا ہوا تھا اس کے جسم پر بریزے چکن کا کسی اچھے بوتیک سے خریدا ہوا سوٹ آج اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی سانولی رنگت پر سلیقے سے کیا گیا میک اَپ اسے دل کش بنا رہا تھا۔ نازو نے مڑ کر ابا سے کچھ کہا تھا۔ ابا نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ نازو چپکے چپکے کچھ کہہ رہی تھی اور ابا جانے نہیں کیوں غصے میں لگ رہے تھے۔ جانے نازو ان سے کیا کہہ رہی تھی۔ ان سے نظریں ہٹا کر اس نے رومی کی طرف دیکھا تھا۔ رومی کیپٹن عثمان کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ عثمان نے رومی سے ہاتھ ملانے کے بعد اسے مخاطب کیا تھا۔

"گڑیا...... آپ ضرور آئیے گا۔ یہ آپ کا بھائی تو بھلکو ہے، گھر میں آپ کی بھابی کے علاوہ میری بھی چھوٹی بہن ہے، آپ ان سے مل کر خوش ہوں گی"۔ وہ مسکرا دی تھی۔

نازو کے ساتھ کھڑے حبیب خان بہت غصے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا لیکن نازو نے ایک ادا سے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر روک دیا تھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گڑیا نے نازو کو نہایت لگاوٹ سے ابا کو دیکھتے اور ان کے بازو پر ہاتھ رکھے دیکھا تو اس کا دل جیسے اندر ہی اندر رو پڑا۔ اس نے اس منظر میں اپنی پسند کے رنگ بھرنا چاہے تھے۔ اماں، ابا کے بازو پر ہاتھ رکھے کھڑی اور ان کی طرف محبت سے دیکھتے ابا لیکن وہ اس منظر کو اپنی پسند کے منظر میں تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ تب ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"ارے کیا ہوا گڑیا"۔ مین روڈ پر آتے ہی رومی کی نظر اس پر پڑی تھی اور اس کا اتنا پوچھنا غضب ہو گیا تھا۔ گڑیا کے آنسو روانی سے اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

"وہاں پارکنگ میں ابا تھے اور نازو"۔

"سو واٹ!" رومی نے کندھے اُچکائے تھے۔ "اپنے آپ کو مضبوط بناؤ گڑیا۔ اسی ایک شہر میں رہتے ہوئے تم کئی بار کئی مقامات پر ابا اور نازو کو دیکھو گی تو کیا ہر بار اسی طرح روؤ گی وہ ہمارے باپ ہیں۔ ہمارا یہ رشتہ ہمیشہ ان سے رہے گا۔ یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ چاہے وہ دس شادیاں کیوں نہ کر لیں...... مجھے ابا کے شادی کرنے کا افسوس نہیں ہے گڑیا۔ ہاں انہوں نے اماں کی قدر نہیں کی مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ جب میں اماں کو ساتھ لے آؤں گا تو ابا کو مشورہ دوں گا کہ وہ کسی اپنے اسٹینڈرڈ کی ایسی لڑکی سے شادی کر لیں جس سے شادی کرنا ان کا خواب تھا اور اماں پر اپنا غصہ نکالنا بند کر دیں لیکن انہوں نے نازو سے شادی کر لی۔ مجھے اس کا بے حد صدمہ ہے۔ ان کے اپنے معیار سے اتنے گر جانے کا دُکھ ہے۔ انہوں نے اماں پر نازو کو ترجیح دی، مجھے اس کا صدمہ اور رنج ہے اور شاید اماں کو بھی جو شاک لگا ہے اسی وجہ سے...... وہ کسی خاندانی لڑکی سے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی بہت خوب صورت ہوتی ان کے مقابلے کی ہوتی اس سے شادی کرتے تو شاید اماں کو اتنا صدمہ نہ ہوتا کیونکہ انہوں نے خود ابا کو کئی بار کہا تھا کہ وہ اپنی پسند سے شادی کر لیں۔ ان کی طرف سے اجازت ہے"۔

یہ رومی...... کے خیالات تھے۔ گڑیا کو اس بات کا بہت دُکھ ہوتا خواہ ابا کسی سے بھی شادی کرتے وہ ابا کے ساتھ صرف اماں کو دیکھنا چاہتی تھی، خوش اور مطمئن...... اور اس کے لیے اب بھی اللہ میاں سے دعائیں مانگتی تھی، کہانیوں کی طرح کوئی جادو کی چھڑی ہو جسے وہ گھمائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ ابا ایک ظالم حکمران سے نرم دل اور رحم کرنے والے ہمدرد انسان بن جائیں اور ان کا گھر امن و سکون کا گہوارہ بن جائے۔

لیکن زندگی کہانی نہیں ہے۔ رومی سچ کہتا تھا جہاں انسان اپنی مرضی سے حالات و واقعات کو بدل لے۔ اس روز سونے کے بعد بھی خواب میں وہ ابا اور نازو کو دیکھتی رہی تھی۔ صبح جب وہ اُٹھی تو اماں اپنے بستر پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔

"اماں جی"۔ اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی پیشانی کو چوم لیا۔ "اماں جی آپ نماز پڑھیں گی؟"

"ہاں"۔ وہ بیڈ سے اُٹھتے ہوئے بولیں۔

"تم بھی پڑھ لو"۔

"جی اماں"۔ وہ خوشی سے رومی کے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ "رومی، رومی بھائی

اماں نے مجھے نماز پڑھنے کے لیے کہا اور وہ خود بھی نماز پڑھنے لگی ہیں"۔
اس روز وہ کالج میں بھی بہت خوش رہی تھی لیکن کبھی کبھی خوشی کتنی مختصر ہوتی ہے۔ وہ کالج سے آئی تھی اور ابھی کھانے کے لیے ٹیبل پر بیٹھی تھی کہ باہر گیٹ پر بیل بجی۔
رومی آج جلدی آ گیا تھا۔ وہ اماں اور اس کے ساتھ ابھی ٹیبل پر آ کر بیٹھا تھا۔ خالہ جی بھی کھانا لگا کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ رومی کا حکم تھا کہ خالہ جی بھی ان کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھائیں گی۔
"آپ ہمارے گھر کی ہی ایک فرد ہیں۔ آپ کو کیا پتا خالہ جی ہم کسی بزرگ کے لیے کتنا ترسے ہیں"۔ بیل کی آواز پر خالہ جی کھڑی ہو گئیں۔
"میں دیکھتی ہوں"۔
"آپ بیٹھیں خالہ جی میں دیکھتا ہوں"۔ رومی اُٹھ کر باہر گیا۔ جب وہ کچھ دیر تک واپس نہیں آیا تو اماں نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔
"رومی"۔ ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے پہلی بار اماں نے رومی کا نام لیا تھا۔ ڈاکٹر عمر صحیح کہتے تھے اماں بہت جلد نارمل ہو جائیں گی۔
"میں دیکھتی ہوں اماں"۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی، پھر جب وہ اندرونی گیٹ کھول کر باہر آئی تو گیٹ کے پاس ابا اور رومی کھڑے تھے اور رومی کہہ رہا تھا۔
"ابا میں نے آپ سے کہہ دیا ہے نا کہ گڑیا آپ کے ساتھ نہیں جائے گی"۔
"کیسے نہیں جائے گی"۔ رومی کی آواز آہستہ تھی لیکن ابا کی آواز بہت بلند...... وہ وہیں دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ابا کی نظر اس پر پڑی تھی۔
"میں اسے زبردستی لے جاؤں گا رومی۔ میں اسے تمہارے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ تم جس طرح اپنی ماں......"
"اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہیے گا ابا ورنہ......"
"ورنہ کیا......" ابا اس بار اپنے پرانے انداز میں دھاڑے تھے اور گڑیا کو لگا تھا وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑی نہیں رہ سکے گی۔
"میں نے خود دیکھا ہے تمہارے ساتھ ایک اجنبی مرد کو جو ہنس ہنس کر گڑیا سے باتیں کر رہا تھا اور تم......"
"ابا پلیز اتنا مت گریں کہ آپ سے نفرت ہو جائے۔ وہ میری یونٹ کا ہی ایک کیپٹن ہے، اتفاقاً مل گیا تھا"۔

"جو بھی ہو میں گڑیا کو یہاں چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ گڑیا"۔ انہوں نے اسے پکارا اور ایک قدم آگے بڑھایا لیکن رومی نے بازو آگے کر کے انہیں روک دیا۔
"آپ یہاں سے چلے جائیں ابا...... ورنہ میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں گا"۔ اور گڑیا یک دم بھاگ کر اندر چلی گئی تھی۔ پھر پتا نہیں رومی نے کیسے انہیں واپس کیا تھا۔ وہ تو اندر جا کر اماں کے گلے لگ کر رونے لگی تھی۔ اماں حیران سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ رومی نے اندر آ کر اماں کو تسلی دی۔
"بالکل پاگل ہے اماں جی، ذرا سی آہٹ پر بھی ڈر جاتی ہے"۔ اماں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چومی تھی اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔
"پریشان مت ہونا گڑیا...... ابا تمہیں یہاں سے نہیں لے جا سکتے"۔ رات کو اپنے کمرے میں جانے سے پہلے رومی نے اسے تسلی دی تھی لیکن پھر بھی اگلے تین چار دن تک وہ بہت پریشان سی رہی۔ گیٹ پر بیل ہوتی تو اس کا رنگ زرد ہو جاتا۔ دو دن وہ کالج بھی نہیں گئی۔ پتا نہیں ابا کو گھر کا ایڈریس کہاں سے ملا تھا۔ وہ سوچتی۔ رومی کو پتا چلا تو وہ حیران ہوا۔
"گڑیا تو کالج کیوں نہیں جا رہی ہو؟"
"ڈر لگتا ہے"۔
"کس سے؟"
"ابا سے...... کہیں وہ مجھے"
"پگلی ایک فوجی کی بہن ہو کر ڈرتی ہو اور ابا کچھ نہیں کر سکتے، نہ وہ تمہیں زبردستی لے جا سکتے ہیں اور نہ ہی عدالت کے ذریعے"۔ رومی کے بے حد تسلی دینے پر کہیں اس کا دل ٹھہرا تھا اور وہ معمول کے مطابق کالج جانے لگی تھی۔
صبح تو ہمیشہ وہ رومی کے ساتھ جاتی تھی لیکن واپس اکیلے ہی پیدل آ جاتی تھی۔ کالج ان کے گھر سے نزدیک ہی تھا۔ اگرچہ اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے کسی بھی بہترین کالج میں ایڈمیشن مل سکتا تھا لیکن رومی نے اس خیال سے اسے وہاں ایڈمیشن نہیں دلوایا تھا کہ اس کی پوسٹنگ ایسی جگہ ہو گئی جہاں وہ انہیں نہ لے جا سکتا ہو تو پھر گڑیا کے لیے کسی دور کے کالج میں اکیلے جانا مشکل ہو گا۔ سو یہ گلبرگ انٹر کالج اس کے گھر کے نزدیک ہی تھا، یہاں وہ پیدل بھی جا سکتی تھی۔ ایف۔ ایس۔ سی کے بعد اس میں ذرا کانفیڈنس پیدا ہو جائے تو پھر بی ایس سی وغیرہ کسی اچھے کالج سے کر لے گی۔ یہ رومی نے سوچ رکھا تھا اور گڑیا کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا۔ ابا کی طرف سے بے حد مطمئن ہو کر وہ پھر سے کالج جانے لگی تھی۔ اس روز واپسی پر وہ روڈ کراس کر کے اپنے گھر

والی گلی کی طرف مڑی تھی۔ ان کا گھر روڈ پر نہیں تھا بلکہ اندر ایک گلی میں تھا۔ وہ اپنے دھیان میں مگن جا رہی تھی کہ یک دم ابا نے پیچھے سے آ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"چلو میرے ساتھ"۔

"نہیں"۔ وہ مچلی۔

"میں کہہ رہا ہوں سیدھی طرح چلو، ورنہ کھینچتا ہوا لے جاؤں گا"۔

"نہیں...... خدا کے لیے نہیں"۔ وہ رونے لگی تھی۔ گلی میں آس پاس کوئی نہیں تھا، سوائے دو بچوں کے جن کا دھیان اس بال کی طرف تھا جسے وہ اُچھالتے ہوئے جا رہے تھے۔

"ہنگامہ مت کرو، ورنہ بدنامی ہوگی تمہاری"۔ وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بے آواز روئے جا رہی تھی اور وہ تقریباً اس کے بازو کو دبوچے اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ ان کی نئی گاڑی گلی کے کنارے پر کھڑی تھی۔ انہوں نے ڈرائیور کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا اور خود اسے اندر دھکیلتے ہوئے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی فراٹے سے گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی اور وہ شدید خوف زدہ ہو کر اونچا اونچا رونے لگی تھی۔

☆☆☆

سیمل صبح اُٹھی تو اس کا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا، وہ سو رہی تھیں۔ جانے رات وہ کب سوئی تھیں۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹی تھی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ اس نے انہیں نہیں جگایا۔ نماز پڑھ کر اس نے چائے بنائی اور باہر تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ اندر کے مقابلے میں اس وقت باہر کا موسم بہت اچھا تھا۔ فضا میں خنکی تھی اور سامنے درختوں پر چڑیوں کا شور تھا۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے وہ کتنی ہی دیر تک جامن کے درخت پر چڑیوں کو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکتے ہوئے دیکھتی رہی۔ چڑیوں کو دیکھتے اور گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر نوشیرواں کے متعلق سوچ جا رہی تھی۔

"اگر مروان ہوتا تو یقیناً نوشیرواں سے مل کر خوش ہوتا"۔ چائے کا خالی کپ کچن میں رکھ کر وہ اپنا موبائل، قلم اور ڈائری لے کر پھر تخت پر آ بیٹھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے، اسے مروان سے بات کیے۔

"اور اگر انہوں نے مجھے پھر دیکھ لیا تو......" اس نے جھرجھری سی لی۔

"اور اگر نوشیرواں نہ ہوتا تو وہ...... مجھ تک پہنچ جاتے۔ زبردستی مجھے لے جاتے تو......

پھر اماں کا کیا ہوتا مروان۔ پتا ہے مروان یہ جو نوشیرواں ہے نا، کل اگر میرے ساتھ نہ ہوتا تو وہ

ضرور مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ ڈاکٹر عرفان کہتے ہیں اس ایک ماہ میں اماں نے جو ردِعمل ظاہر کیا ہے، وہ بہت پُر اُمید ہے۔ ہم نے کتنی دعائیں کی تھیں نا اماں کے لیے کہ وہ ٹھیک ہو جائیں۔ ہماری ہر خوشی کتنی ادھوری ادھوری سی ہوتی تھی۔ تب ڈاکٹر عمر ہمیں ڈھارس دیتے تھے، ہمارا حوصلہ بڑھاتے تھے اور اب ڈاکٹر عرفان ہیں...... لیکن مروان بعض دعائیں اتنی دیر سے کیوں قبول ہوتی ہیں کہ ان کی قبولیت کی خوشی آدھی رہ جاتی ہے۔ آپ بھی ہوتے یہاں تو یہ خوشی کتنی مکمل ہوتی۔

پتا ہے رات اماں نے میرے آنسو پونچھے، میرا سر دبایا...... نہیں، میں اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں روتی لیکن رات یوں لگتا تھا جیسے سارے زخموں کے ٹانکے ایک ساتھ کھل گئے ہوں۔ پتا ہے نوشیرواں نے کہا تھا کہ آپ مروان کو کیوں نہیں بلا لیتیں۔ آپ کو اور اماں کو ضرورت ہے ان کی اور تب نوشیرواں کی بات سن کر مجھے بہت رونا آیا تھا۔ اپنی بے بسی پر آپ کے نہ آ سکنے پر اور پھر آپ مجھے بہت یاد آ رہے تھے مروان۔ بہت زیادہ، جب میں نے نوشیرواں کی ٹیبل پر پڑے نقشے کو دیکھا تھا جس پر کارگل کے گرد ایک سرخ دائرہ لگا تھا اور میرا جی چاہا تھا میں بھی کارگل کے گرد ایک سرخ دائرہ لگا دوں۔ نوشیرواں بتا رہا تھا، یہاں برف سے ڈھکی پہاڑیاں ہیں اور یہ سائبیریا کے بعد سب سے زیادہ سرد ترین ملک ہے لیکن میں تو سفید برف کو خون میں نہاتے دیکھ رہی تھی۔

میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے کیپٹن حسام کو بھی دیکھا تھا۔ ماتھے پر دایاں ہاتھ رکھے سامنے دشمن کے سپاہیوں کی نقل و حرکت کو دیکھتا وہ سجیلا کپتان جس کے اِرد گرد نور کا ہالہ سا بنا تھا...... شہادت کا نور۔

کبھی کبھی میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں کیپٹن حسام کے گھر جاؤں، ان کی بیوی اور بچوں سے ملوں لیکن اکیلے کیسے جاؤں، آپ ہوتے تو......

اور میں تو کہیں بھی نہیں جاتی مروان سوائے یونیورسٹی کے اور وہ بھی حمنہ کے کہنے پر۔

حمنہ یاد ہے نا آپ کو جو من آباد والے اس گھر میں آنے کے بعد میری دوست بنی تھی۔ میری پہلی دوست...... اس نے میرے ساتھ ہی بی اے میں ایڈمیشن لیا تھا اور وہ آپ سے بہت متاثر تھی، جن دنوں آپ آتے تو وہ ہمارے گھر کے بہت چکر لگاتی تھی۔ اگرچہ اس نے کبھی کہا نہیں لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ آپ کو بہت زیادہ پسند کرنے لگی تھی اور میں نے بھی سوچا تھا کہ جب بھی گھر میں آپ کی شادی کا ذکر ہوا تو میں حمنہ کا نام لوں گی۔ حمنہ نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے مروان...... پہلے حمنہ اور اب میراں اماں اور نوشیرواں......

اور یہ جو نوشیرواں ہے، اس کا ایک ماموں زاد بھائی ہے جو لاپتہ ہے گیارہ مہینے

سے...... اور پتا نہیں یہ لاپتہ افراد کہاں ہیں؟ ایسے بہت سارے لوگ ہیں مروان جن کے گھر والے، بچے، مائیں، بیویاں اور بہنیں ہر رات دُعائیں مانگ کر سوتی ہیں کہ صبح کا سورج شاید ان کے لیے کوئی خوش خبری لے کر آئے۔ شاید بچھڑوں کے ملاقات کا سندیسہ ملے لیکن سورج پھر ایک نئی اُمید کی کرن انہیں تھما کر غروب ہو جاتا ہے۔ زندگی کچھ زیادہ ہی مشکل لگنے لگی ہے اور مجھے وہ نظم بہت یاد آتی ہے مروان جو اکثر آپ گنگنایا کرتے تھے۔ جب ہم سمن آباد والے اس گھر میں آئے تھے تو یہاں اس تخت پر ہاتھوں کا تکیہ بنائے آپ لیٹے ہوئے تھے اور آپ کے ہاتھوں میں ایک میگزین تھا۔ میں کچن سے باہر آئی تو آپ نے مجھے بلایا تھا۔ یاد ہے نا۔

"ارے سنو فرینڈ ایک بہت پیاری نظم ہے، محسن نقوی کی۔

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی ایسا شہر بساؤں میں
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں چاند ماند نہ ہو کبھی
ایک مکمل گھر، ایک پُرسکون، پُرامن ملک

ان دنوں کیسے خواب دیکھتے تھے ہم...... ایک "اٹوپیا" تھا جس میں ہم رہ رہے تھے"۔

مروان سے باتیں کرتے ہوئے اسے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ سورج سامنے دیوار کے اوپر سے جھانک رہا تھا اور اپنی کرنیں صحن میں پھیلا رہا تھا۔

"سیمل بچہ......" میراں اماں نے دیوار پر سے آواز دی تو اس نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔

"جی اماں!" وہ تخت سے اُتر کر صحن کی دیوار کے پاس گئی۔

"بچہ خیریت ہے! شیری بتا رہا تھا آج تم یونیورسٹی نہیں گئیں"۔

"ہیں! اب کیا اسے الہام بھی ہونے لگا ہے"۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

"وہ دہی لینے گیا تھا تو بتا رہا تھا کہ حمنہ اکیلی اسٹاپ پر کھڑی تھی"۔

"جی!" وہ حیرت کے جھٹکے سے باہر آئی۔ "بس یوں ہی سستی ہو رہی تھی"۔

"اچھا، اچھا...... شکر اللہ کا!" میراں اماں کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

"امینہ بہن بھی ٹھیک ہیں نا؟"

"جی، اماں سو رہی ہیں، بس جگانے ہی لگی تھی"۔ میراں اماں نے پیچھے مڑ کر دیکھا،

شاید نوشیرواں نے کچھ کہا تھا، پھر وہ اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بچہ شیری کہہ رہا ہے وہ کل امینہ بہن کو ڈاکٹر کی طرف لے جائے گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔

"لیکن ڈاکٹر نے تو اتوار کو آنے کا کہا تھا"۔

"ہاں لیکن پرسوں شیری نے جانا ہے کام سے، پھر وہ پیر کو ہی واپس آئے گا تو......"

"میں لے جاؤں گی خود ہی اماں کو"۔

"نہ بچے، جب شیری ہے تو تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے اور شیری نے بات کر لی ہے ڈاکٹر سے"۔ انہوں نے نوشیرواں کا پیغام نشر کیا، تب وہ خاموش ہو گئی۔

"چلو اچھا ہوا، کیا خبر وہ پھر وہاں آئے ہوں اور ان سے کچھ بعید بھی نہیں۔ میں شام کو جا کر نوشیرواں کو اماں کی فائل دے آؤں گی اور رات کو ان کی کیفیت بھی بتا دوں گی اور پھر نوشیرواں نے مجھ سے بات بھی تو کرنا تھی اور پتا نہیں کیا بات؟" ایک لمحے کے لیے اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ اس نے میراں اماں کی طرف دیکھا۔ میراں اماں دیوار کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ اس نے واپس مڑ کر اپنا سامان اُٹھایا، تب ہی دروازے پر بیل ہوئی۔ فضیلت آئی تھی۔

"تم نے اتنی دیر کر دی فضیلت، اگر مجھے یونیورسٹی جانا ہوتا تو اماں پیچھے اکیلے کیسے رہتیں؟"

"وہ جی بس کوئی ایمرجنسی تھی، میں نے سوچا تھا جی آپ...... اماں کو چھوڑ دیں گی میراں اماں کی طرف"۔

"تمہیں ہر مسئلے کا حل میراں اماں ہی نظر آتی ہیں"۔ وہ جھلائی تھی لیکن پھر فوراً ہی نارمل ہو گئی۔

"ٹھیک ہے جاؤ، کچن صاف کر کے اماں کے لیے ناشتہ بنا دو، ایک کپ چائے میرے لیے بھی بنا دینا"۔ بہر حال فضیلت کے دم سے اسے بڑا آسرا تھا اور یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ فضیلت دیر سے آئی تھی۔ ورنہ ابھی وہ تیار ہی ہو رہی ہوتی تھی کہ فضیلت آ جاتی تھی۔ تخت پر سے اپنی چیزیں سمیٹ کر وہ کمرے میں آئی تو اماں جاگ کر بیڈ پر بیٹھی کچھ پریشان سی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا ہو۔

"اماں جی! آپ جاگ گئیں؟" ان کے قریب جا کر پیشانی پر بکھرے ان کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے کرتے ہوئے اس نے بے حد محبت سے پوچھا۔ اماں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔ اماں کے اس عمل نے اسے حیران کیا

لیکن وہ مسکرادی۔

''اماں چلیں آپ کا منہ ہاتھ دھلوادوں، جب تک فضیلت ناشتہ بنا کر لاتی ہے...... پھر ہم دونوں اکٹھے ناشتہ کریں گے۔ آج میں نے یونیورسٹی سے چھٹی کی ہے۔ آج ہم خوب باتیں کریں گے''۔ اماں کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ انہوں نے بغیر اس کے کہے نیچے اُتر کر چپل پہنی اور واش روم کی طرف چل دی تھیں۔ وہ حیرت سے کھڑی انہیں واش روم کی طرف جاتے دیکھ رہی تھی پھر بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

''مروان...... مروان ڈاکٹر عرفان صحیح کہتے ہیں، اماں امپروو کررہی ہیں''۔ کتنے سال گزر گئے...... اماں نے کبھی خود سے اُٹھ کر کوئی کام نہیں کیا تھا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر واش روم لے جاتی تو چلی جاتیں۔ کھانا سامنے رکھ کر کھانے کو کہتی تب بھی بیٹھی رہتیں اور خالی خالی نظروں سے کھانے کو دیکھتی رہتیں۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے دیتی تو ایسے ہی پڑے رہتے جب تک خود نہ بدلواتی، وہ یونہی بیٹھی رہتیں۔

''تو...... تو کیا...... سچ مچ اماں...... یا اللہ تیرا شکر ہے، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کچھ اُمید تو بندھی، کچھ آس تو ہوئی کہ ایک دن اماں بالکل نارمل ہو جائیں گی''۔ وہ اماں کے بیڈ پر ہی بیٹھ کر ان کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

''آج سارا دن اماں سے خوب باتیں کروں گی اور رات کو پارک بھی لے کر جاؤں گی''۔ وہ اماں کے بیڈ پر بیٹھ کر پلان بناتی رہی اور اماں خود ہی منہ ہاتھ دھو کر آگئیں، پھر فضیلت ناشتہ لے آئی تو ناشتہ کر کے اس نے اماں کے کپڑے نکال کر انہیں چینج کرنے کے لیے دیئے۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اماں خود سے کپڑے بدلتی ہیں یا نہیں لیکن اماں ایک بار پھر چپ سی خالی خالی نظروں سے کپڑے دیکھ رہی تھیں۔

''اماں جی یہ کپڑے بدل لیں آپ''۔ اس نے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا لیکن اماں اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ اس کی بات نہ سمجھ رہی ہوں، بالکل پہلے کی طرح...... یک دم مایوسی نے اس کے دل میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑے تو اندر کہیں نمی پھیلتی گئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی اور مسکراتے لب بھینچ گئے۔ نہیں مجھے مایوس نہیں ہونا۔

اُس نے سر جھٹک کر اماں کی طرف دیکھا جو ابھی تک کپڑوں پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھیں۔

مرواں بھی تو کہتا تھا نا۔

سیمل کبھی مایوس نہ ہونا۔ تمہیں پتا ہے نا۔ مایوسی کفر ہے۔ تم دیکھنا، ایک دن سب ٹھیک

ہو جائے گا، بالکل پہلے کے جیسا، نیلی کے سوئیٹ ہوم کے جیسا۔

اور رات...... رات بھی تو مروان نے ایسی ہی بات کہی تھی۔ رات وہ کتنا ناراض ہو رہا تھا اُس سے۔

وہ یک دم چونکی۔

رات ہی تو اُس نے خواب میں مروان کو دیکھا تھا اور صبح اُسے لگ رہا تھا جیسے مروان گھر آیا تھا، یا شاید آنے والا تھا۔

تو یہ اس لیے تھا کہ رات اُس نے خواب میں مروان کو دیکھا تھا۔ وہ اُس سے ناراض تھا اور منہ موڑے کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے مروان؟''

اُسے پورا خواب تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد آگیا تھا۔ مروان کو وہ اکثر خواب میں دیکھتی تھی۔ جب بہت اُداس ہوتی...... جب وہ بہت یاد آتا۔

اور جب کبھی کوئی بات اُسے اَپ سیٹ کرتی تھی تو وہ خواب میں ضرور مروان کو دیکھتی تھی، لیکن اتنا طویل خواب تو اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس طرح تو مروان کبھی اُس سے ناراض نہیں ہوا تھا، جس طرح خواب میں ناراض تھا۔

تم نے بہت غلط بات کی۔ غلط بات سوچی۔ سیمل گڑیا تم نے حرام موت کا سوچا ہی کیوں۔

''یہ......!'' اماں نے دوپٹہ اُٹھا کر اسے دکھایا تھا۔ وہ چونکی۔

''ہاں، اماں جی یہ آپ کے کپڑے ہیں، آپ چینج کریں گی نا''۔ اماں کچھ نہیں بولی تھیں۔ تب اس نے ہمیشہ کی طرح ان کے کپڑے تبدیل کروائے، ان کی کنگھی کی اور ان کو میڈیسن دیں۔ دوا کھا کر وہ لیٹ گئیں اور کچھ دیر بعد وہ سو گئیں تو وہ باہر آگئی۔ فضیلت دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

''فضیلت سنو اماں سو رہی ہیں، ان کا دھیان رکھنا، میں ذرا میراں اماں کی طرف جا رہی ہوں، یہ اماں کی فائل دینے۔ وہ میراں اماں کے بیٹے ہیں نا، وہ کل اماں کو ڈاکٹر کی طرف لے کر جائیں گے، تم اماں کے کپڑے بدلوا کے انہیں تیار کر دینا۔ اگر وہ کہیں تو ساتھ بھی چلی جانا''۔ فضیلت کو ہدایات دے کر وہ کرسی پر چڑھ کر میراں اماں کے گھر میں اُتر گئی۔ جب وہ دوسری طرف سیڑھی سے اُتر رہی تھی تو اس کی نظر نوشیرواں پر پڑی۔ وہ برآمدے میں تخت کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی پشت دیوار کی طرف تھی۔ آہٹ پر اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور بے اختیار

مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا لیکن وہ بدستور فون پر بات کر رہا تھا مگر اس کی نظریں سیمل پر تھیں جو سیڑھی سے اُتر کر اب صحن میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے برآمدے کی طرف آ رہی تھی۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے فائل کو پیشانی کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ جب اس نے برآمدے میں قدم رکھا تو وہ کہہ رہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج سات آٹھ سالوں بعد لوگ کیوں یہ کہہ رہے ہیں کہ کارگل میں جو ہوا، وہ حماقت تھی اور یہ کون ہیں؟ میجر عثمان فارگاڈ سیک......'' اس کی آواز بلند ہوئی تھی۔ ''آپ تو اس طرح کے ریمارکس مت دیں۔ محض ایک ایسے صحافی کی تحریر پر جو اِدھر اُدھر سے سن کر اپنے کالم کا پیٹ بھرتا ہے، کاش......'' یک دم دُکھ اس کے لہجے میں اُتر آیا تھا۔

''کاش، ہمارے صحافی اتنے ایکٹو اور بولڈ ہوتے کہ کچھ لکھنے سے پہلے مکمل تحقیق کرتے......سمندر کی تہہ میں اُترے بغیر اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا میجر عثمان......لیکن ہم اتنے سہل پسند ہو گئے ہیں کہ ہم بغیر تحقیق کیے لکھ دیتے ہیں اور نشر کر دیتے ہیں۔ کارگل کی حقیقت سے آپ بے خبر تو نہیں میجر عثمان۔ کارگل کی برف کو رنگین بنانے والا خون حماقت نہیں تھی۔ کوئی کوشش اگر کامیاب نہ ہو سکے تو وہ حماقت تو نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کے لیے کچھ بہتر اور اچھا کرنے کی کوشش کو حماقت کہنے والے محب وطن ہرگز نہیں ہیں۔ پتا نہیں کن لوگوں نے ان کے ہاتھوں میں قلم تھما دیا ہے''۔ اس کی آواز پھر بلند ہو گئی تھی۔

''ان کے منہ میں زبانیں نہیں، زہر میں بجھے تیر ہیں......اور ہاتھوں میں قلم نہیں، خنجر ہیں۔ یہ سب لکھنے سے پہلے اس ظالم نے کیپٹن شیر خان، حوالدار لالک شہید اور ان جیسے بہت سے دوسروں کے خاندانوں کے متعلق نہیں سوچا، جنہیں اس فخر نے ان کی جدائی کا دُکھ برداشت کرنے کا حوصلہ دیا ہے کہ ان کے بیٹے شہید ہیں اور وطن کی خاطر انہوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ ان کشمیری مجاہدین کے لیے جن پر زندگی تنگ کر دی گئی تھی۔ کارگل کی جنگ کا مقصد ان کشمیری مجاہدین کو ظلم و بربریت سے نجات دلانا تھا۔ کیا یہ جرم تھا؟'' وہ وہیں برآمدے کے پاس ساکت کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے کانوں میں جیسے اِردگرد کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ٹی وی کی اسکرین پر چلنے والی پٹی تھی جس پر کارگل کے شہیدوں کے نام آ رہے تھے۔ فون بند کر کے نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک پاؤں برآمدے میں رکھے ساکت کھڑی تھی۔ برآمدہ صحن سے ذرا سا بلند تھا۔ سیمل کا ایک پاؤں صحن میں تھا اور دوسرا برآمدے کے کنارے پر۔

''سیمل!'' حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے نوشیرواں آگے بڑھا۔

''سیمل کیا ہوا؟''

''ہاں......'' وہ چونکی اور اس نے دوسرا پاؤں بھی برآمدے میں رکھا۔ ''میں یہ اماں کی فائل دینے آئی تھی''۔

''آپ ٹھیک ہیں نا؟'' نوشیرواں نے فائل اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

''ہاں''۔ اس نے سر ہلایا، اس کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پتا نہیں کیوں نوشیرواں کو لگا کہ اس کی بے حد خوب صورت غزالی آنکھوں کی سطح گیلی گیلی سی تھی۔

''کون ہے شیری؟'' میراں اماں کچن میں تھیں۔

''سیمل ہے اماں جان''۔

''اچھا، اچھا''۔ انہوں نے کچن کے کھلے دروازے سے جھانکا۔

''سیمل بچہ بیٹھو، میں یہ چاول بھگو کر آتی ہوں''۔

سیمل تخت پر بیٹھ گئی۔ نوشیرواں نے کھڑے کھڑے سرسری انداز میں فائل کھول کر دیکھی۔

''آپ نے کل یونیورسٹی جانا ہے؟''

''ہاں، حمنہ بہت ناراض ہو رہی تھی کہ آج کل اتنے اہم لیکچرز ہو رہے ہیں اور میں مِس کر دیتی ہوں۔ دو تین ماہ کی تو بات ہے پھر فائنل ہو جائے گا تو......''

''ہاں ٹھیک ہے سیم، آپ کو کلاسز مِس نہیں کرنی چاہیے''۔ وہ تخت سے کچھ فاصلے پر پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ''اور آپ کی اماں جان کیسی ہیں، رات ٹھیک رہیں؟''

اس نے صبح کا ان کا رویہ بتایا۔

''گڈ......'' وہ مسکرایا۔

''پھر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں سیم؟''

''نہیں تو......'' وہ دل میں جزبز ہوئی لیکن اس نے اس کے سیم کہنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

''آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں''۔ وہ مسکرا کر پھر سے فائل کھول کر دیکھنے لگا۔ ''ڈاکٹر عرفان سے پہلے یہ کوئی ڈاکٹر عمر تھے''۔

''ہاں، جب ہم گلبرگ میں رہتے تھے تو وہاں ڈاکٹر عمر تھے اماں کے معالج۔ انہوں نے پہلے Psycho Trauma ہی ڈائیگنوز کیا تھا لیکن پھر ان کی رائے بدل گئی تھی۔ ان دنوں اماں کافی بہتر ہو رہی تھیں بلکہ ڈاکٹر عمر کہتے تھے، بہت جلد وہ اپنی حالت میں پلٹ آئیں گی اور مجھے اور مردان کو بھی لگتا تھا کہ......'' اس نے تفصیل بتائی۔ ''پھر ہمیں یہاں آنا پڑا امن آباد تو

یہاں مروان، اماں کو ڈاکٹر عرفان سے چیک کروانے گئے"۔

نوشیرواں کا جی چاہا وہ پوچھے کہ ایسا کیا صدمہ پہنچا تھا اماں کو جو وہ برداشت نہیں کر سکیں لیکن پھر اس نے کچن سے باہر آتی میراں اماں کو دیکھا، جن کے سرخ و سپید چہرے پر صبر اور حوصلے کی تحریر رقم تھی۔ وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے آرہی تھیں اور یہ صبر، یہ حوصلہ اللہ کی دین ہے اور اللہ کے سوا کون ہے جو یہ صبر عطا کرے۔ ایک لمحے کو نوشیرواں کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔ کیسے، کس طرح اماں نے سب کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کیا ہوگا۔ خبریں سننا اور ذرا سی دیر کو افسوس کر لینا اور بات ہے۔ آج پندرہ، آج چالیس بندے دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ سننے والوں کے لیے یہ صرف ایک خبر ہے لیکن جن پر یہ واردات گزرتی ہے اور جو اپنے جگر گوشوں کو اپنے ہاتھوں مٹی کے سپرد کرتے ہیں...... کاش کوئی ان کا سینہ چیر کر دیکھتا۔ ان کے درد کو محسوس کرتا۔ یہ ٹی وی چینلز پر تبصرہ کرتے اینکرز، اُچھل اُچھل کر اور چیخ چیخ کر دہشت گردی کا احوال سناتے اگر صرف اور صرف میراں اماں کا دُکھ جان پاتے تو ان کی آواز ان کے حلق میں ہی گھٹ جاتیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سترہ لاشیں کفن میں لپٹی آرہی تھیں...... ایک، ایک چہرہ اور صبر کا پیکر، میراں اماں ایک ایک چہرے کو چومتیں اور تڑپتا، بلکتا، سر پٹختا گل......! اس نے جھرجھری سی لی۔ میراں اماں، یسمل کو پیار کر رہی تھیں۔ وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔ یسمل کو پیار کر کے میراں اماں نے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے بچے کھڑا کیوں ہو گیا، بیٹھ...... یسمل بچی سے باتیں کر تھوڑی دیر۔ میں تو بس اسے ملنے کے لیے کچن سے نکلی ہوں۔ ہانڈی چڑھا رکھی ہے بھون کر اُتار لوں...... پھر آتی ہوں، اتنے میں تم......"

"نہیں اماں جان، آپ کام کریں میں تو بس یہ فائل دینے آئی تھی انہیں، کل اماں کو اسپتال لے کر جانا ہے، اب چلتی ہوں"۔ وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

"نہیں بچے، کچھ دیر تو بیٹھ، اچھا چل میں ہانڈی اُتار آتی ہوں چولہے سے، اصل میں گرمی ہو جاتی ہے تو میں سویرے سویرے ہی کھانا بنا لیتی ہوں"۔

"جی...... فضیلت بھی ناشتے کے بعد ہانڈی چڑھا دیتی ہے۔ آپ کھانا بنا لیں، میں بیٹھتی ہوں"۔

"جانا نہیں بچے......" وہ اسے تاکید کر کے واپس کچن کی طرف مڑیں۔

"بیٹھ جائیں نا یسمل"۔ نوشیرواں کی آنکھیں یک دم سرخ ہو گئی تھیں۔ پتا نہیں کون

کون سے منظر آنکھوں کے سامنے آ کر انہیں لہو رنگ کر رہے تھے۔ یسمل خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میراں اماں کی شفقت و محبت اور یہ پُرخلوص اصرار...... نوشیرواں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"یسمل مجھے کچھ دنوں کے لیے جانا ہے۔ ہو سکتا ہے زیادہ دن بھی لگ جائیں۔ میں تھوڑا سا آپ کی طرف سے متفکر ہوں اس روز......"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" بے اختیار ہی یسمل کے لبوں سے نکلا تھا۔

"میں وزیرستان جا رہا ہوں، جنوبی وزیرستان سے تعلق ہے ہمارا...... میراں اماں نے بتایا ہوگا۔ جنوبی وزیرستان کا سرحدی علاقہ ہے انگور اڈا...... اس کے قریب ہی ایک گاؤں ہے تورہ جاور...... وہاں مجھے گل کے ایک دوست سے ملنا ہے۔ وہ اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ اتنا گہرا کہ اپنی بہت ساری باتیں جو وہ کسی سے نہیں کرتا تھا، اس سے شیئر کرتا تھا۔ مجھے لگتا ہے یسمل جیسے میں اپنی فیملی کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد اس سے دور ہو گیا تھا یا وہ مجھ سے دور تھا۔ ہماری بہت کم ملاقات ہوئی تھی۔ میں میراں اماں کو لے کر لاہور آ گیا تھا اور وہ پشاور چلا گیا تھا، اپنے ہاسٹل۔ آٹھ ماہ میں میری اس سے صرف دو بار ملاقات ہوئی تھی اور دونوں بار اس نے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ ان آٹھ ماہ میں وہ کیا کرتا رہا، اس کی سوچ اور فکر میں کیا تبدیلیاں ہوئیں، میں وہ سب جاننا چاہتا ہوں۔ میں اس کی تلاش کے لیے کوئی ٹھوس لائحہ عمل بنانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں اس کی ان آٹھ ماہ کی دلچسپیوں اور مصروفیات سے باخبر ہوں۔ میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں، ہر قیمت پر...... وہ باقی رہ جانے والا میرا واحد خونی رشتہ ہے۔ وہ مجھے بہت پیارا تھا اور ہے۔ اس کا دوست جان عالم تورہ جاور میں رہتا ہے۔

"تورہ جاور......" وہ چونکی تھی۔ "لیکن تورہ جاور میں تو کل رات......"

"ہاں مجھے علم ہے"۔

"تو...... تو آپ نہ جائیں......" بے اختیار یسمل کے لبوں سے نکلا تھا۔ "وہاں اتنا خطرہ ہے...... اور......" وہ یک دم پریشان ہو گئی تھی۔ نوشیرواں کی آنکھوں میں یک دم کوندا سا لپکا تھا۔

"تو......" اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ "ٹی وی پر ایک اور خبر...... اور کچھ دیر پٹی چلتی رہے گی کہ نوشیرواں عادل......"

"نہیں"۔ وہ یک دم چیخی اور پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"ارے، ارے آپ...... میں تو مذاق کر رہا تھا"۔ غیر ارادی طور پر اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹا دیے۔ یسمل کے نرم اور گداز ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں میں تھے

اور یسمل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"موت تو اپنے وقتِ مقررہ پر ہی آتی ہے یسمل۔ کارگل کی بلندیوں پر جب آس پاس گولیاں گر رہی تھیں اور شہادت کی تمنا نے دل میں ہلچل مچا رکھی تھی تب وقت نہیں آیا تھا تو موت چھو کر گزر گئی تھی، سو اب بھی اگر وقت نہیں آیا تو کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا اور اگر وقت آ پہنچا ہے تو یہاں اس جگہ کھڑے کھڑے بھی موت آ سکتی ہے"۔ یسمل نے آہستگی سے اپنے ہاتھ کھینچے تو نوشیرواں کو احساس ہوا کہ یسمل کے ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں ہیں۔

"سوری"۔ اس نے یسمل کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور یسمل کے بہتے آنسوؤں کو اپنی اُنگلیوں سے پونچھنے کی شدید خواہش کو دباتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"اب آنسو پونچھ لیں پلیز...... ورنہ اماں جان آ گئیں تو سمجھیں گی، میں نے آپ کو رُلایا ہے۔ بہت خفا ہوں گی وہ مجھ سے"۔ یسمل نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھ کر پھر دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"چلیں اب اگر میجر نوشیرواں عادل کو موت آ بھی گئی تو اتنی خوشی ضرور ہو رہی ہے کہ میراں اماں کے علاوہ بھی کوئی نوشیرواں کی موت پر رونے والا ہے"۔ یسمل نے ایک شاکی نظر اس پر ڈالی لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ لمحہ بھر دلچسپ نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر مسکرایا۔

"ایک بات کہوں سیم؟"

"جی نہیں، جب آپ کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے تو خاموش ہی رہیں اور یہ آپ مجھے سیم کیوں بلاتے ہیں...... یسمل کہا کریں"۔ بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"بات تو اچھی ہی تھی"۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "لیکن خیر پھر کبھی سہی شاید ابھی اس کا وقت نہیں...... اور رہی یہ بات کہ میں آپ کو سیم کہہ کر کیوں بلاتا ہوں تو مجھے اچھا لگتا ہے، اس طرح نام مختصر کر کے بلانا...... بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ویسے یسمل کہنا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت پیارا نام ہے"۔ میراں اماں ابھی تک کچن میں ہی تھیں۔ اس نے سوچا اب وہ چلی جائے کہ میراں اماں نے کچن سے آواز دی۔

"شیری بچے، میں یسمل کے لیے میٹھی لسی بنا رہی ہوں، تم پیو گے"۔

"جی اماں جان"۔ نوشیرواں نے جواب دے کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں جتنے دن وزیرستان رہا، یہاں اماں جان کے پاس حیدر کی بہن یا والدہ آ جائیں گی، آپ بھی خیال رکھیے گا ان کا...... اور یہ میرا موبائل نمبر بھی لے لیں، کبھی کوئی مسئلہ ہو

گیا تو مجھے فون کر دیجئے گا"۔ اس نے جیب سے بال پین نکال کر فائل کے گتے پر اپنا نمبر لکھ دیا۔

"تو اماں جان ہمارے پاس رہ جائیں، اماں بھی خوش ہو جائیں گی، کتنے تنہا ہوتے ہیں ہم، حیدر کے گھر سے کسی کو آنے کی کیا ضرورت ہے"۔

"یہ بھی صحیح ہے، میں اماں جان سے پوچھوں گا وہ کیا کہتی ہیں۔ ان کی مرضی ہوئی تو ٹھیک ہے اور ہاں میں آپ سے اس وقت پوچھنے لگا تھا آپ کس سے ڈر کر بھاگی تھیں اس روز"۔

یسمل نے ایک گہری سانس لے کر نوشیرواں کی طرف دیکھا۔

"ابا سے...... وہ میرے ابا تھے اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور وہ......" بات ادھوری چھوڑ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ میراں اماں کچن کے دروازے پر لسی کے گلاس لیے کھڑی اسے اشارہ کر رہی تھیں کہ وہ گلاس لے جائے۔

یسمل کچن کی طرف جا رہی تھی اور نوشیرواں حیرت زدہ سا بیٹھا، اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

حبیب خان نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور پھر نیچے اُتر کر پچھلا ڈور کھولا۔

"نیچے اُترو"۔ لیکن وہ وہیں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ اسے نیچے نہیں اُترنا تھا، اسے گھر واپس جانا تھا، اماں اور رومی کے پاس۔

"پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں، آپ کو اللہ کا واسطہ"۔ اس نے التجا کی۔ "اماں اور رومی بھائی پریشان ہو رہے ہوں گے"۔

"ہوتے رہیں"۔ انہوں نے بے پروائی سے شانے اُچکائے اور اسے پھر نیچے اُترنے کے لیے کہا لیکن وہ یونہی ٹس سی بیٹھی رہی، تب انہوں نے اسے بازو پکڑ کر کھینچا اور پھر یونہی کھینچتے ہوئے اندر آئے۔ لاؤنج کے وسط میں نازو کھڑی تھی۔ سیاہ اور سرخ بارڈر والی شال اوڑھے وہ عجب تمسخر بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ لاؤنج میں آ کر اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے وہ نازو سے مخاطب ہوئے تھے۔

"لے آیا ہوں اسے، اب دھیان رکھنا اس کا اور خبردار یہ نیچے اُترنے نہ پائے۔ جاؤ اپنے کمرے میں"۔

"ابا جی پلیز میں نہیں رہ سکتی اماں کے بغیر"۔ وہ پھر رونے لگی۔

"رہ لو گی خود ہی"۔ ان کا لہجہ بے حد سفاک تھا۔ "سمجھنا تمہاری ماں مر گئی ہے اور بھائی بھی"۔

"نہیں...... خدا کے لیے ایسا مت کہیں"۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

"نازو جاؤ اسے اوپر چھوڑ کر آؤ۔ سر میں درد ہونے لگا ہے"۔ نازو نے اس کے قریب آ کر اس کا بازو پکڑا تو اس نے اپنا بازو چھڑا لیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر اوندھی گر کر رونے لگی۔ کمرا وہی تھا اس کا اپنا، لیکن خالی خالی، اجنبی اور ویران لگ رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی پھر دروازہ کھلا تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ کوئی ملازمہ تھی جو اس کا کالج بیگ لے کر آئی تھی۔ ملازمہ کے ہاتھ سے کالج بیگ لے کر اس نے آنسو پونچھے اور ملازمہ کے جانے کے بعد جلدی جلدی اسے کھولا اور کچھ کتابیں نکال کر باہر رکھیں پھر موبائل نکالا۔ کالج میں موبائل فون لے جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن رومی نے کہا تھا، وہ اسے سائلنٹ پر رکھے، کبھی کوئی مسئلہ ہو جائے تو فون کر لیا کرے ورنہ اسے یوز نہ کرے۔ اس نے موبائل فون بیگ میں سب کتابوں کے نیچے رکھا ہوا تھا، حالانکہ لڑکیاں اِدھر اُدھر بریک میں پابندی کے باوجود فون کا استعمال کرتی تھیں لیکن اسے بہت ڈر لگتا تھا، کئی دفعہ سوچا تھا کہ وہ فون گھر ہی رکھ جائے۔ اتنا نزدیک تو اس کا گھر تھا۔ اس نے اُٹھ کر بیڈ روم کا دروازہ بند کیا اور رومی کو فون کیا۔

"ارے گڑیا، بیٹا کہاں ہو؟ ابھی خالہ جی کا فون آیا تھا کہ تم ابھی تک کالج سے نہیں آئی ہو۔ میں اب نکلنے ہی لگا تھا کہ تمہارے کالج سے پتہ کروں"۔

"بھائی......وہ"۔ اور آنسوؤں نے اس کا حلق سی لیا۔

"کیا ہوا گڑیا...... بیٹا بولو کیا ہوا ہے؟" رومی بے حد گھبرا گیا۔

"رومی بھائی، ابا مجھے کالج کے باہر سے زبردستی گھر لے آئے ہیں"۔ بہ مشکل بات ختم کر کے وہ پھر رونے لگی۔

"او کے......او کے تم حوصلہ رکھو اور رونا نہیں بالکل، میں آ رہا ہوں"۔ فون بند کر کے اس نے پھر بیگ میں رکھ کر اوپر کتابیں رکھ دی تھیں اور آنسو پونچھ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"نیچے آ کر کھانا کھا لو"۔ ملازمہ پھر آئی تھی۔

وہ خاموش رہی۔ اسے ابھی نیچے نہیں جانا تھا۔ اس کی بھوک پیاس اُڑ گئی تھی۔ اسے رومی کا انتظار تھا۔ میس سے یہاں تک آتے بھلا کتنا وقت لگے گا...... وہ دل ہی دل میں حساب لگاتی رہی اور جب وہ اپنا کالج بیگ کاندھے پر لٹکائے کمرے سے باہر نکل کر سیڑھی تک آئی تو باہر گیٹ پر بیل ہو رہی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس نے رومی کو لاؤنج میں آتے دیکھا۔

"رومی بھائی"۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگی۔ ابھی وہ آخری سیڑھی پر تھی کہ ڈائننگ روم سے حبیب خان نکل کر لاؤنج میں آئے، ان کے پیچھے نازو تھی۔

"تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی"۔ ابا دہاڑے تو وہ وہاں آخری سیڑھی پر ہی رُک گئی۔ رومی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس سے کہا۔

"آؤ گڑیا......" اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"وہیں رُک جاؤ، خبردار ایک قدم آگے بڑھایا تو...... گڑیا تمہارے ساتھ نہیں جائے گی"۔

"گڑیا میرے ساتھ ہی جائے گی، میں اسے لینے آیا ہوں، آؤ گڑیا"۔ اس نے گڑیا کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن ابا نے اس کا راستہ روک کر اسے دھکا دیا۔

"رومی شرافت سے چلے جاؤ ورنہ میں گارڈ کو بلا لیتا ہوں"۔ کچھ عرصے پہلے ابا نے گھر کی حفاظت کے لیے گارڈ رکھے تھے۔

"میں گڑیا کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا، ابا پلیز گڑیا یہاں خوش نہیں رہے گی"۔ رومی نے مصلحتاً اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی تھی۔ "اماں گڑیا کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ وہ مر جائیں گی"۔

"تو مر جائے میری بلا سے"۔

"ابا جی......"

"جاؤ یہاں سے"۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا۔ "نکل جاؤ، ورنہ مجھے گارڈ بلانے پڑیں گے اور آئندہ یہاں کبھی مت آنا"۔

"گڑیا......" رومی نے ابا کو نظر انداز کر کے سائڈ میں ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا جسے ابا نے بے دردی سے چھڑا لیا۔

"ابا جی میں گڑیا کو لیے بغیر نہیں جاؤں گا"۔

"تو ٹھیک ہے، میں تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا، ابھی اور اسی وقت"۔

"نہیں"۔ گڑیا کے لبوں سے سسکی نکل گئی تھی۔ بے شک وہ الگ رہ رہے تھے لیکن اُمید تو تھی ایک آسرا تو تھا۔ شاید اماں یہ شاک برداشت نہ کر سکیں۔ وہ ابھی تک پورے طور پر ٹھیک نہیں ہوئی تھیں۔ رومی کا بڑھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑا گڑیا کو دیکھتا رہا، پھر سر جھکا کر واپس مڑا۔ جانے سے پہلے اس نے گڑیا کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی لیکن گڑیا کی آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں اور جوں ہی رومی لاؤنج سے سر جھکا کر نکلا وہ تڑپ کر اس کی طرف لپکی۔

"پیچھے ہٹو"۔ ابا کا تھپڑ اس کے رُخسار پر پڑا تھا۔ وہ رُخسار پر ہاتھ رکھے ششدر سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ اسے ابا سے ڈر لگتا تھا۔ ابا اماں کو مارتے تھے، ان سے جھگڑا کرتے تھے لیکن

انہوں نے بچوں پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا۔ گڑیا جب سے بڑی ہوئی تھی تو ایک دو بار اماں کو بچاتے ہوئے اسے ایک آدھ ہاتھ لگ گیا تھا لیکن اس طرح ابا نے کبھی اسے نہیں مارا تھا۔ ابا اب نازو کی طرف متوجہ تھے۔

''چوکی دار کو کہلوادو اور گارڈز سے بھی کہہ دو کہ آئندہ اگر یہ یہاں آئے تو اسے دھکے دے کر نکال دیں، اندر مت آنے دیں اور اسے......'' انہوں نے مڑ کر گڑیا کو دیکھا۔ ''باہر مت نکلنے دو......اور چوکی دار کو بھی بتادو، ہماری اجازت کے بغیر کسی کو باہر جانے دے، نہ اندر آنے دے''۔ نازو نے ایک طنزیہ اور تمسخر بھری نظر اس پر ڈالی تھی اور اٹھلاتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

''سن لیا تو نے، جا اب اوپر اپنے کمرے میں جا۔ شاباش......'' گڑیا یک دم بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے سنا، نازو کہہ رہی تھی۔

''میں کہتی ہوں ملک صاحب طلاق دے دیتے اسے آپ، ٹنٹا ہی ختم''۔

''بک بک مت کر''۔ ابا کی آواز آئی تھی۔ وہ ابھی تک غصے میں تھے۔ وہ ایک بار پھر رو رہی تھی، دھاڑیں مار مار کر۔ لیکن اس کے رونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیا اب اسے ہمیشہ یہاں رہنا ہوگا، اماں اور رومی سے دور۔

''نہیں...... میں یہاں نہیں رہوں گی، ہاں''۔ اس نے کمرے میں آکر کالج بیگ اُٹھایا تو فون وائبریٹ کر رہا تھا۔ اس نے بے تابی سے فون باہر نکالا، دوسری طرف رومی تھا۔

''چند دن کی بات ہے گڑیا، میں آج ہی اماں کے ساتھ فیملی کورٹ میں جا رہا ہوں، اب میں قانونی طور پر تمہیں لے کر آؤں گا۔ ابا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تم بس حوصلہ رکھنا...... گھبرانا نہیں بیٹا، یہ اماں سے بات کرلو''۔ رومی نے فون اماں کو دیا۔

''اماں......'' اس سے کوئی بات نہیں کی گئی۔ دوسری طرف اماں بھی خاموش تھیں لیکن ان کی سانسوں کی آواز آرہی تھی۔

''اماں میں ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں......'' بہ مشکل اس نے خود کو سنبھال کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی، تب رومی نے اسے بہت ساری تسلیاں دینے کی کوشش کی تھی۔

''بہت جلد تم ہمارے پاس ہوگی گڑیا''۔ اور پھر کتنے سارے دن رومی اس کے لیے کوشش کرتا رہا اور یہ سارے دن اس نے بڑی مشکل سے گزارے تھے۔ ایک ایک لمحہ اذیت سے بھرا تھا۔ نازو کا رویہ، اس کے ساتھ انتہائی تحقیر آمیز تھا۔ کھانے اور ناشتے کی میز پر ابا کے برابر بیٹھی نازو اسے زہر لگتی تھی۔ اسے دکھانے کے لیے وہ بڑی لگاوٹ سے ابا سے باتیں کرتی، ان کی پلیٹ

میں خود کھانا ڈالتی۔ ابا کی عدم موجودگی میں گڑیا پر حکم چلاتی۔ اس کے آنے کے دو دن بعد وہ اپنے دو تین جوڑے اس کے پاس لے کر آئی۔

''لو گڑیا بی بی، یہ میرے کپڑے ہیں۔ میں تو انہیں پہنتی نہیں، تم پہن لینا۔ ویسے بھی خالی ہاتھ آئی ہو، ایک جوڑا کپڑوں کا بھی ساتھ نہیں لائی ہو، تین دن سے ایک جوڑا پہنے پھر رہی ہو''۔ وہ خود کہاں آئی تھی، اسے تو اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور اس کے لائے ہوئے کپڑے اُٹھا کر باہر پھینک دیئے اور خود دروازہ بند کر کے بے تحاشا رونے کے بعد اس نے رومی کو بیل دی تو فوراً رومی کا فون آگیا اور پھر گھنٹے بعد ہی چوکی دار نے اس کے کپڑوں کا بیگ اندر بھجوا دیا تھا۔ ابا اور نازو لاؤنج میں بیٹھے تھے، جب ملازمہ بیگ لائی تھی۔

''جی یہ چوکی دار نے بھیجا ہے، کوئی رومی صاحب دے گئے ہیں گڑیا بی بی کے کپڑے اور کتابیں ہیں''۔

''جاؤ اوپر گڑیا کو دے آؤ''۔ ابا ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ملازمہ بیگ اُٹھا کر جانے لگی تو نازو نے روکا۔

''ارے رُکو، دیکھنے تو دو کیا ہے اس میں''۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ اس میں ایٹم بم ہوگا؟'' ابا کا موڈ خراب تھا نہ جانے کیوں۔ اوپر والی سیڑھی کے پاس کھڑے کھڑے گڑیا نے سنا۔

''کہا تھا تم سے کہ اس کے لیے دو تین جوڑے کپڑے لے آؤ۔ تین دن سے ایک ہی جوڑا پہنے ہوئے ہے''۔

''دیئے تو تھے اپنے جوڑے، تمہاری صاحب زادی کو پسند ہی نہیں آئے''۔ وہ بے تکلفی سے ان کے کندھے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی، گڑیا واپس مڑ گئی۔ ملازمہ بیگ اوپر لے آئی تھی۔ رومی بھائی نے اس کا چارجر اور کچھ کتابیں بھی بھجوادی تھیں۔

یہ دن بہت مشکل تھے لیکن گزر گئے تھے۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے یہاں بلانے کی خواہش ابا سے زیادہ نازو کی تھی۔ وہ اس پر حکم چلا کر جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کرتی تھی۔ اس کی پڑھائی ختم ہوگئی تھی۔ وہ اماں اور رومی بھائی سے دور تھی۔ وہ بہت کم کھاتی تھی، بہت کم سوتی تھی۔ اس کی صحت کافی خراب ہوگئی تھی، جس روز فیصلہ اماں کے حق میں ہوا، اس روز اسے تیز بخار تھا۔ رومی بھائی لیڈیز پولیس کے ساتھ اسے لینے آئے تھے۔

''جاؤ دفع ہو جاؤ''۔ نازو نے اس کے کمرے میں آکر کہا۔ ''باہر تیرا بھائی آیا ہوا

ہے"۔ وہ تیر کی طرح اُٹھی تھی۔

جس روز عدالت میں اس کا بیان ہوا تھا، اس نے رومی کو دیکھا تھا۔ وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ اماں کو دیکھنے کے لیے اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اماں کہیں نہیں تھیں اور اب کیا سچ مچ وہ یہاں سے جا رہی تھی۔ رات ہی رومی نے اسے تسلی دی تھی۔

"انشاء اللہ صبح فیصلہ اماں کے حق میں ہو جائے گا۔ تم تیار رہنا"۔ اس کا سامان تو پہلے ہی بیگ میں تھا۔ اسے کون سا تیاری میں وقت لگنا تھا۔ وہ بیگ گھسیٹتے ہوئے نیچے آئی۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ابا شاید اندر اپنے کمرے میں تھے۔ شاید ان سے اپنی سبکی برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ لاؤنج سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا شاید اب وہ کبھی ابا کو نہیں دیکھ سکے گی تو کیوں نہ ابا سے مل لے۔ اس نے لاؤنج سے نکل کر گیسٹ روم کی طرف قدم بڑھایا تھا لیکن نازو نے جو اس کے پیچھے ہی آ رہی تھی، اسے ٹوکا۔

"اے کدھر جا رہی ہو؟"

"ابا سے ملنے"۔

"کوئی ضرورت نہیں، تمہیں اگر اپنے ابا کی چاہ ہوتی تو اماں کے پاس رہنے کے لیے بیان نہ دیتیں۔ دفع ہو جاؤ اور آئندہ اپنی شکل مت دکھانا"۔ اس نے حیرت سے نازو کو دیکھا تھا۔ یہ نازو تھی جو بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتی تھی۔ چھوٹی بی بی...... گڑیا بی بی کرتے اس کے ہونٹ سوکھتے تھے، مگر اب...... بے زاری سے اسے دیکھتے ہوئے وہ باہر چلی گئی۔ گیٹ کے باہر رومی بھائی کھڑے تھے، اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے۔

"رومی بھائی......" وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ آنسو جھرنوں کی طرح اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑے تھے۔ رومی کی آنکھیں بھی نم تھیں لیکن وہ ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکتا رہا، پھر اپنے ساتھ آنے والی لیڈیز پولیس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھے تھے۔ جب وہ گھر پہنچے تو اس نے اماں کو دیکھا، وہ لاؤنج میں مضطرب سی بیٹھی اپنی اُنگلیاں مروڑ رہی تھیں۔

"اماں جی میں گڑیا کو لے آیا ہوں"۔ اماں نے نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اماں کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

"اماں جی...... اماں جی"۔ اس کے آنسو ایک بار پھر آنکھوں سے جھرنوں کی صورت بہہ نکلے تھے۔ اماں کچھ دیر تو ساکت رہیں پھر ہولے ہولے ان کے ہاتھ اس کے گرد حمائل ہو گئے، پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ اب وہ رو رہی تھیں، زار و قطار، اسے لپٹائے، اسے

چومتے ہوئے۔ کچھ دیر بعد رومی نے انہیں الگ کیا تھا۔

"بس اماں جی اب گڑیا کو کوئی ہم سے دور نہیں کر سکتا۔ ہاں ایک بندہ......" وہ مسکرایا۔

"کون......؟" بے حد حیرت سے سیمل نے رومی کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے رُخسار ابھی تک بھیگے ہوئے تھے اور پلکیں نم تھیں۔

"تمہارا دولہا"۔

"رومی بھائی آپ......" ماحول کی اُداسی لمحے بھر کو ختم ہو گئی تھی۔ اماں کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ اماں اس گھر میں آنے کے بعد پہلی بار اس طرح روئی تھیں۔ وہ اس کی کمی محسوس کر رہی تھیں۔

"اماں انشاء اللہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائیں گی"۔ رومی نے رات میں اسے بتایا تھا۔

"ڈاکٹر عمر بہت پُر اُمید ہیں"۔

"آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں رومی بھائی اور اماں بھی"۔

"اور تم بھی تو بہت ویک ہو گئی ہو گڑیا، مجھے تمہاری بہت فکر تھی۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں تم ہمت نہ ہار بیٹھو"۔

"شاید میں ہمت ہار بیٹھتی اگر جو ہر رات آپ سے بات نہ ہوتی۔ رومی بھائی، ابا، نازو کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ وہ ان سے لڑتے بھی نہیں ہیں، حالانکہ اماں کے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں ہے"۔

"اماں کے ساتھ اس کا مقابلہ مت کرو۔ وہ بہت ہوشیار ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ ابا اور اماں کے درمیان اختلاف ہیں تو پتا نہیں کب اور کیسے ابا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کہ ہمیں پتا نہیں چلا۔ ایسے تعلق زیادہ دیر پا نہیں ہوتے، تم دیکھنا ایک روز ابا ہماری طرف ضرور لوٹیں گے"۔

"کیا ایسا ممکن ہے بھائی؟"

"ہمیشہ اچھی اُمید رکھنی چاہیے گڑیا"۔ اس روز اماں کے سونے کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہو گیا تھا۔ رومی نے اس کی میڈیکل لیو لے لی تھی۔ "کل سے تم کالج جاؤ گی"۔

"بہت سے لیکچر مس ہو گئے ہوں گے"۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"میں خود تمہیں پڑھا دیا کروں گا یا کسی ٹیوشن سینٹر یا اکیڈمی میں چلی جایا کرو"۔

"نہیں، میں کور کر لوں گی، کچھ جو سمجھ نہ آیا تو آپ سے سمجھ لوں گی"۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ رومی کی وہی روٹین تھی۔ وہ اکثر شام یا رات کو اماں اور گڑیا کو باہر گھمانے ضرور لے جاتا تھا اور کبھی اکیلے گڑیا کے ساتھ، پھر وہ انارکلی میں بانو بازار کی چاٹ کھا کر اور ملک شیک پی کر اُردو بازار کی خاک چھانتے پھرتے۔ حالانکہ اب پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا پھر بھی وہ حامو چاچا سے کتابیں ضرور خریدتے تھے۔ اس کے پاس اب کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہو گیا تھا۔ سکینڈ ایئر کے پیپرز دے کر وہ فارغ ہوئی ہی تھی کہ رومی نے بتایا، وہ گھر بدل رہا ہے۔

"آج کل میں میری پوسٹنگ ہونے والی ہے کہیں بھی۔ زیادہ امکان ہے اسکردو یا سیاچن میں"۔ رومی نے اسے بتایا۔"اور جانے سے پہلے میں کسی ایسی جگہ پر آپ لوگوں کو چھوڑنا چاہتا ہوں جہاں آپ یہاں کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہوں اور ابا کو بھی اس جگہ کا علم نہ ہو۔ یہ گھر ابا کے علم میں ہے، سو ہو سکتا ہے میری عدم موجودگی میں کسی روز وہ آکر تنگ کریں اماں کو اور تمہیں"۔ رومی نے گھر بدلنے کی وضاحت کی تھی۔

ابا اس ایک سال میں ایک بار بھی نہیں آئے تھے، حالانکہ کورٹ نے آرڈر دیا تھا کہ مہینے میں ایک بار اسے والد سے ملنے دیا جائے لیکن ابا نے پھر خبر ہی نہیں لی تھی۔

"ہو سکتا ہے وہ یہاں نہ آئیں لیکن احتیاط ضروری ہے" اور پھر وہ سمن آباد آگئے۔ یہ گھر اندر گلی میں تھا اور بہت سیف تھا۔ پرانے انداز کا گھر، صحن، برآمدہ، دو کمرے، ایک ڈرائنگ روم جس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور ایک اندر صحن میں۔ آس پاس سب لوگ اچھے تھے، ہمدرد اور مخلص۔ آس پاس کے کئی گھروں سے ان کے تعلقات ہو گئے تھے۔ سب ہی محبت اور شفقت سے ملتے تھے۔ ان کے گھر کے بالکل سامنے والی گلی میں حمنہ کا گھر تھا۔ حمنہ سے اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ اس نے بھی ایف اے کا امتحان دے رکھا تھا اور اب رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ ابھی تک رومی کی پوسٹنگ کے آرڈر نہیں آئے تھے۔ رومی نے ڈاکٹر عمر کے مشورے پر اماں کا ڈاکٹر تبدیل کر دیا تھا۔ ڈاکٹر عرفان کا کلینک سمن آباد میں ہی تھا اور رومی چاہتا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں گڑیا کے لیے اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا مشکل نہ ہو۔ ان دنوں وہ گڑیا کو ہر بات سمجھا رہا تھا۔ بینک کے معاملات اور دوسری باتیں۔ وہ پہلے روز جب رومی کے ساتھ بینک گئی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

"تم خالہ بی کے ساتھ یہاں آکر چیک کیش کروا لینا"۔ جس روز اس کا ایڈمیشن بی۔اے میں ہوا، اس روز اس کے سیاچن پوسٹنگ کے آرڈرز آگئے تھے۔ اماں کی حالت کے متعلق کچھ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر عرفان بھی ڈاکٹر عمر کی طرح پُراُمید تھے

لیکن کبھی کبھی وہ اردگرد سے بالکل بے خبر ہو جاتی تھیں، جیسے پورے ماحول سے کٹ کر کہیں اور کسی اور ماحول میں ہوں پھر ایک روز رومی کو جانا پڑا، وہ پوری رات چپکے چپکے روتی رہی تھی۔ صبح اس کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر رومی پریشان ہو گیا تھا۔

"گڑیا تمہیں خود کو بہادر بنانا ہے، تمہیں اماں کا خیال رکھنا ہے اور اپنا بھی۔ میں جب واپس آؤں گا تو تمہاری شاندار کامیابی سیلی بریٹ کریں گے۔ زبردست قسم کا ڈنر ہوگا"۔ وہ اس کا دل بہلا رہا تھا، وہ جانتی تھی۔

"میری خواہش تھی کہ تم بی ایس سی کرتیں، کسی پروفیشنل لائن میں جاتیں لیکن تم نے بی اے میں ایڈمیشن لے لیا"۔

"ہاں، میں پہلے اُردو میں اور پھر انگلش لٹریچر میں ایم اے کروں گی"۔ کہانیوں کی رسیا گڑیا نے بتایا تو وہ مسکرا دیا۔"اور پھر حمنہ بھی تو بی اے کر رہی ہے"۔

"اور یہ اصل وجہ ہے تمہارے بی اے میں ایڈمیشن لینے کی"۔ اس نے قہقہہ لگایا، وہ جھینپ گئی تھی، پھر وہ چلا گیا لیکن اس کا رابطہ گڑیا سے مسلسل رہا تھا۔ کبھی کبھار اس کا کوئی خط بھی آجاتا تھا جو کبھی کراچی سے، کبھی راولپنڈی سے اور کبھی کہیں اور سے پوسٹ کیا جاتا تھا۔ وہ اسکردو سے آنے والے کسی نہ کسی بندے کو دے دیتا تھا۔ کچھ ماہ بعد وہ سیاچن سے واپس آیا تھا اور اس کے پاس کرنے کے لیے بہت باتیں تھیں۔ وہ رات گئے تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ اسے صحن میں بیٹھنا بہت پسند تھا۔

"یہ گھر مجھے اس لیے اچھا لگتا ہے کہ یہاں سے آسمان نظر آتا ہے۔ بالکل گاؤں والے گھر کی طرح۔ میں جب ریٹائر ہو جاؤں گا تو پھر ہم تینوں گاؤں جا کر حویلی میں رہیں گے۔ کھلی فضاؤں میں رات کو آسمان پر چمکتے ستاروں تلے"۔ اس نے گڑیا کو سیاچن کے متعلق بتایا تھا۔ گڑیا بہت حیرت اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی تھی۔

"پتا ہے گڑیا سیاچن دنیا کا بلند ترین جنگی مقام ہے۔ وہاں جراٹ آرمی میس میں اکثر یہ باتیں ہوتی ہیں کہ ہم اگر کارگل کی کچھ چوکیوں پر قبضہ کر لیں تو ہم کشمیر کی طرف عالمی دنیا کی توجہ مبذول کروا سکتے ہیں، وہاں میس میں بہت جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ لوگ شہادت پانے کی تمنا کرتے ہیں۔ میرے دل میں بھی کبھی کبھی یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ اللہ مجھے بھی شہادت کا اعزاز دے لیکن پھر مجھے تمہارا اور اماں کا خیال آجاتا ہے، تم لوگ میرے بعد بالکل اکیلے ہو جاؤ گے۔ کبھی تمہاری محبت کا جذبہ غالب آجاتا ہے اور کبھی جذبۂ شہادت ہر جذبے سے بڑھ جاتا ہے"۔ ان

دنوں وہ خاصا سنجیدہ سا لگتا تھا اور اماں کے متعلق بہت متفکر۔

"میں سوچ رہا ہوں کسی اور ڈاکٹر سے بھی اماں کے لیے رائے لے لوں۔ اماں کی امپروومنٹ کی رفتار بہت سست ہے"۔ یہ اکتوبر کا مہینہ تھا اور ہلکی خنکی شروع ہو گئی تھی۔ وہ رات کو کافی پینے چلے جاتے تھے۔

وہاں کا سوچو گڑیا۔ پندرہ ہزار فٹ بلند چوٹیوں پر بیٹھے مجاہدین کا خیال کرو۔

"مجاہدین"۔

اُس نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں کشمیری مجاہدین۔

رومی نے اُسے تفصیل بتائی تھی۔

بھارتی فوج سردیوں سے قبل ہی کارگل کی بلند پوسٹیں چھوڑ کر کم بلندی کے علاقوں میں آ جاتی ہے۔ اس مرتبہ جب وہ نیچے آئے کشمیری مجاہدین نے ان بلند پوسٹوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ مجاہدین کے زیر قبضہ بلند پوسٹیں اتنی بلندی پر ہیں کہ ان پر نہ تو بھارتی فضائی حملے کارگر ثابت ہو رہے ہیں اور نہ کسی قسم کی گولہ باری اور اب انہوں نے ان کے ٹھکانوں پر نیپام اور کلسٹر بم گرانے شروع کر دیئے ہیں لیکن مجاہدین ڈٹے ہوئے ہیں اور وہاں چراٹ آرمی میس میں اُن دنوں بہت جوش و خروش پایا جاتا ہے۔

رومی نے اماں کو دو تین اور ڈاکٹرز کو بھی دکھایا۔ ایک ماہ رہنے کے بعد وہ پھر واپس اسکردو چلا گیا تھا، پھر اچانک وہ جنوری 1999ء میں واپس آ گیا تھا، صرف دو ہفتے کے لیے۔ اس دوران وہ خاصا مصروف رہا تھا۔ اس نے گڑیا کے اکاؤنٹ میں اپنی ساری رقم منتقل کروائی تھی۔

"تمہیں مالی پریشانی کبھی نہیں ہو گی گڑیا۔ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو گیا تو......" جانے سے پہلے اس نے کہا تھا۔ گڑیا رونے لگی تھی۔

"میں ایک اچھا گھر خریدنا چاہتا ہوں۔ کرائے کے گھر کا کیا اعتبار جب جی چاہے مالک خالی کروا دے"۔ پھر اس نے اقبال ٹاؤن میں ایک گھر خرید لیا جو گڑیا کے نام تھا۔

"وہاں جو کرائے دار رہ رہے ہیں، میں نے انہیں گھر خالی کرنے کو نہیں کہا۔ وہ بدستور رہتے رہیں گے اور کرایہ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ وکیل صاحب کو میں نے تمہارے اور اماں کے معاملات کا نگراں بنا دیا ہے۔ یہ جگہ سیف ہے، لوگ اچھے ہیں اس لیے تمہیں یہاں ہی رہنا ہے جب تک کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو وکیل صاحب کو بتا

دینا۔ دو ماہ کے نوٹس پر وہ گھر خالی کرا لیں گے"۔ وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"آپ ایسی باتیں مت کریں"۔

"یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں گڑیا اور تمہیں خود کو ان حقائق کا سامنا کرنے کے قابل بنانا ہے۔ میں جانتا ہوں ابھی تم بہت چھوٹی ہو...... ابھی تم کہانیوں کی دنیا میں رہتی ہو۔ تمہیں نیلی کا دُکھ رُلاتا ہے، تم روزلی کے لیے آنسو بہاتی ہو، تمہیں ایک مکان دو دیواریں کے امجد کا دُکھ راتوں کو جگا دیتا ہے لیکن بیٹا زندگی کی کہانی میں ایسے کئی دُکھ کبھی کبھی ہمیں بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں"۔

"لیکن اسے خود کو کسی اور دُکھ کے لیے تیار نہیں کرنا تھا۔ کیا یہ دُکھ کم تھا کہ اس کے ابا اور اماں کے درمیان علیحدگی تھی اور ابا نے ایک کمتر عورت کو اماں پر ترجیح دی تھی اور اماں ابھی تک صدمے کی کیفیت میں تھیں۔ "وہ بہت کم حوصلہ ہیں، بہت کمزور دل ہیں۔ میرے اللہ مزید اور کوئی دکھ نہیں"۔ اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں لیکن آنسو تھے کہ امڈے چلے آتے تھے۔ رومی نے خود اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"آپ آرمی چھوڑ دیں"۔ اس نے ضد کی۔

"سوچوں گا گڑیا"۔ اس نے اسے ٹالا تھا۔ "ابھی تو مجھے جانا ہے"۔ اس روز اماں بھی رات گئے تک ان کے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ ہیٹر جلا کر اس نے اماں کے قریب رکھ دیا تھا اور خود اپنے ہاتھوں سے مونگ پھلی اور چلغوزے چھیل چھیل کر کبھی اماں اور کبھی گڑیا کو دیتا رہا۔

اماں کو نیند نہیں آ رہی تھیں۔ وہ بار بار رومی کی طرف دیکھتی تھیں۔ ایک بار جب رومی نے چلغوزے چھیل کر ان کی طرف بڑھائے تو انہوں نے رومی کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور بہت دیر تک وہ رومی کا ہاتھ یونہی تھامے رہیں۔ شاید یہ ماں کا دل تھا ورنہ دوا کے زیر اثر وہ اس وقت سو چکی ہوتی تھیں۔ صبح رومی کی واپسی تھی پھر ہولے ہولے اماں کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو اس نے اماں کا ہاتھ تھام کر اُٹھایا اور بیڈ پر لیٹنے کے لیے کہا۔ اماں لیٹ تو گئی تھیں لیکن گڑیا نے دیکھا تھا، وہ بار بار بند ہوتی آنکھیں کھول کر رومی کو دیکھتی تھیں۔ کوئی اندرونی احساس تھا جو انہیں سونے نہیں دے رہا تھا لیکن پھر وہ سو گئیں۔ اماں کو اچھی طرح کمبل اوڑھا کر نائٹ بلب جلا کر وہ باہر نکلا...... خالہ جی اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔

"خالہ جی آپ ذرا اماں کے کمرے میں لیٹ جائیں، ہم ابھی آتے ہیں اور دروازہ ہم باہر سے بند کر جائیں گے۔ آپ آرام سے سو جانا"۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ گڑیا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"اس وقت کہاں جانا ہے؟"

"باہر روڈ پر چہل قدمی کریں گے، تم کوٹ پہن لو اور شال لے لو"۔ لاہور میں بھی جنوری کی اس رات کو کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ وہ دونوں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سمن آباد کی اندرونی گلیوں سے نکل کر باہر روڈ پر آ گئے تھے۔ گلیوں میں ویرانی تھی۔ اکا دکا لڑکے اپنی اپنی بائیک پر بیٹھے گھروں کی طرف جا رہے تھے لیکن روڈ پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

"ڈاکٹر عرفان کے کلینک کی طرف ایک کافی ہاؤس ہے جو تقریباً ایک بجے تک کھلا رہتا ہے، وہاں چل کر کافی پیتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں دل چاہ رہا تھا کہ باہر کھلی فضا میں گھوموں اور ان خنک ہواؤں کو اپنے اندر اُتار لوں"۔ گڑیا بے حد اُداس تھی صبح وہ جا رہا تھا اور پھر پتہ نہیں کب آئے گا۔

"اندازاً چھ ماہ تک چکر لگاؤں گا"۔ رومی نے اسے بتایا۔ "ہوسکتا ہے میری پوسٹنگ اسکردو کے بعد راولپنڈی میں ہو پھر میں تمہیں اور اماں کو ساتھ ہی لے جاؤں گا"۔

"اور آپ کی شادی بھی کرنی ہیں ہمیں"۔

"ہیں، یہ اچانک میری شادی کا خیال کیسے آ گیا تمہیں؟"

"وہ حمنہ کہہ رہی تھی کہ اب ہمیں...... بلکہ مجھے آپ کی شادی کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔ اماں کی طبیعت تو ٹھیک نہیں اور یہ کام مجھے ہی کرنا ہے۔ آپ جب اسکردو سے آ جائیں گے تو میں اور حمنہ مل کر آپ کے لیے لڑکی تلاش کریں گے۔ پتا ہے میں نے کالج کی ساری خوب صورت لڑکیوں کی فہرست بنالی ہے اور وہ حمنہ بدتمیز کہہ رہی تھی کہ میں اس کا نام بھی فہرست میں شامل کرلوں کیونکہ اس کے خیال میں وہ بھی خاصی خوب صورت ہے"۔

"ہاں تو کرلو...... پھر ایک سوئمبر رچانا"۔ رومی کا موڈ ایک دم ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔

"لیکن ایک بات ہے۔ اپنی شادی سے پہلے مجھے تمہارے لیے ایک عدد دولہا تلاش کرنا ہوگا"۔

"جی نہیں، آپ مجھ سے پورے گیارہ سال بڑے ہیں"۔ وہ یونہی باتیں کرتے کرتے کافی شاپ تک آ گئے تھے۔ کافی شاپ پر رش نہیں تھا، صرف چند لڑکے کھڑے تھے اور اندر بینچوں پر ایک فیملی بیٹھی تھی، بچوں سمیت...... شاید وہ بھی ان کی طرح کے کوئی سر پھرے تھے۔ وہ کافی پی کر واپس لوٹے تو ان کے چہرے خنک ہوا سے ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے رومی نے آہستگی سے کہا تھا۔

"گڑیا، آج میں نے ابا کو فون کیا تھا"

"پھر؟" گڑیا کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"میرا جی چاہ رہا تھا ان سے بات کرنے کو لیکن انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں سیاچن میں ہوں اور وہاں دشمن کی جو سرگوشیاں ہو رہی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عنقریب کوئی نیا محاذ کھلنے والا ہے۔ گڑیا میں ان سے معافی مانگنا چاہتا تھا اپنی گستاخی کی، اگرچہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا لیکن پھر بھی وہ باپ ہیں اور میں نے سوچا ان سے معافی مانگ لوں اور ان کی آواز سن لوں"۔ گڑیا دم بخود سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بے حد شاندار نظر آنے والے ابا آ گئے تھے۔

"پھر؟" گڑیا نے پوچھا، رومی نے ایک گہری سانس لی۔

"انہوں نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا وہ کسی رومی کو نہیں جانتے اور فون بند کر دیا"۔ گڑیا بھی افسردہ ہو گئی تھی۔

دروازہ کھول کر وہ گھر میں آئے تھے۔ اماں اور خالہ جی سو رہی تھیں لیکن گڑیا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ خالہ جی کارپٹ پر میٹرس بچھائے سو رہی تھیں۔ گڑیا بیڈ پر لیٹ گئی...... کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اُٹھ کر رومی کے کمرے میں جائے اور دیکھے کہ اگر وہ سو نہیں رہا تو اس سے باتیں کرے لیکن پھر یہ سوچ کر چپکی لیٹی رہی کہ صبح اس نے واپس جانا ہے۔ خوامخواہ ڈسٹرب نہ کروں، پھر پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی اور جب خالہ جی نے صبح اسے جگایا تو رومی جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ باہر ڈرائیور جیپ کے ساتھ موجود تھا۔

"خالہ جی آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں جگایا"۔ وہ ناراض ہوئی۔

"میں نے منع کیا تھا، رات دیر سے سوئی تھیں نا تم"۔ رومی نے کہا تو وہ چپ کر گئی۔ اماں سے مل کر وہ اس کی طرف آیا تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ جب بھی کہیں جاتا تھا، چاہے ایک دن کے لیے کیوں نہ جانا ہوتا تو وہ رو پڑتی تھی، جب وہ کاکول میں تھا تب سے لیکن اب وہ ہونٹ بھینچے کھڑی تھی۔

"گڑیا......" اس کے پاس رُک کر اس نے آہستگی سے کہا۔ "ایک بات جو میں جب سے یہاں آیا ہوں تمہیں بتانا چاہتا ہوں اور بتانے کی ہمت نہیں پا رہا...... وہ یہ ہے کہ ایک آپریشن کی تیاری ہو رہی ہے۔ گڑیا جب میں جاؤں گا تو ہوسکتا ہے میں بھی اس آپریشن کے لیے جانے والوں میں شامل ہوں...... ہمارے ی۔ جی۔ ایس دوسرے کور کمانڈروں اور لائن آف کنٹرول پر جوٹن کور ہے، اُس کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل کے ساتھ مل کر یہ تیاری ہو رہی ہے۔ جنگ میں کچھ

پتا نہیں ہوتا گڑیا کہ کون غازی بنے گا اور کس کی قسمت میں شہادت لکھی جائے گی۔ ایسا کچھ ہوا گڑیا تو تم نے حوصلے سے کام لینا ہے۔ اماں کا خیال رکھنا ہے اور اگر کبھی ابا تمہیں اور اماں کو لینے آئیں تو تم چلی جانا ان کے ساتھ...... عورت کو ہمیشہ مرد کے سائبان کی ضرورت ہوتی ہے گڑیا اور انہیں معاف کر دینا۔ وہ جیسے بھی ہیں ہمارے ابا ہیں اور اماں کے شوہر ہیں لیکن اگر وہ نہ لینے آئیں تو تم نے ہی اماں کا خیال رکھنا ہے"۔ وہ بھلا اماں کا اکیلے خیال کیسے رکھ سکے گی۔ اس نے سوچا تھا لیکن تب وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے اکیلے ہی اماں کا خیال رکھنا ہے اور آج کے بعد وہ کبھی رومی کو نہیں دیکھ سکے گی اور کبھی اس کی باتیں نہیں سن سکے گی، یہ آخری بار تھی جب وہ اسے دیکھ رہی تھی لیکن پھر بھی وہ چپ ہوا تو گڑیا کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگی تھی۔ رومی نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور پھر تیزی سے جا کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ پھر بہت دن بیت گئے...... رومی کا کبھی کبھی فون آجاتا۔ اس نے بتایا تھا کہ انہوں نے برف پوش چوٹیوں کی طرف پیش قدمی کر دی ہے اور بلندیوں پر تہس نہس چوٹیاں قائم کر دی ہیں اور یہ ایک عسکری عجوبہ ہے گڑیا۔

پھر کئی دن گزر گئے، رومی کا فون نہیں آیا۔ وہ ہر لحہ اس کی سلامتی اور بحفاظت واپسی کی دُعائیں مانگتی رہی۔ یہ مئی کی 26 تاریخ تھی جب رومی نے آخری بار اس سے بات کی تھی۔ وہ بہت پُر جوش تھا۔ اس نے کیپٹن حسام کے متعلق بتایا تھا۔ وہ کیپٹن شیر کے متعلق بھی بات کرتا رہا تھا اور پھر اس کے بعد گڑیا کی اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ یہ سولہ جون تھی جب وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ اماں اس کے پاس ہی بیٹھی خالی خالی نظروں سے سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔

"اتنے دن ہو گئے ہیں اماں رومی بھائی کا فون نہیں آیا۔ آپ دعا کریں نا...... میرا دل بہت گھبرا رہا ہے"۔ سامنے ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں۔

"آج کارگل کے محاذ پر کیپٹن احسن اور کیپٹن مروان حبیب خان دشمن کی گولہ باری سے شہید ہو گئے، تاہم وہ دشمن کو ایک پوسٹ پر جارحیت سے روکنے اور بھگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کیپٹن احسن آرٹلری اور کیپٹن مروان حبیب پنجاب رجمنٹ یونٹ نمبر......" نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا اور وہ سکتے کے عالم میں ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

نوشیرواں کو گئے بہت دن ہو گئے تھے۔ اس دوران اس نے صرف دو تین بار ہی رابطہ کیا تھا۔ میراں اماں اس کے لیے پریشان تھیں، گو وہ ظاہر نہیں کرتی تھیں لیکن سیمل جانتی تھی کہ وہ اندر سے بہت پریشان ہیں۔ خود اس نے بھی کتنی بار دُعا کی تھی۔

"یا اللہ! میراں اماں کو مزید کوئی دُکھ نہ دینا۔ ان کا سینہ تو پہلے ہی چھلنی ہے۔ اللہ جی نوشیرواں کو کچھ نہ ہو"۔ وہ اخبار پڑھتی تو دہل جاتی۔ آج باجوڑ پر حملہ، اٹھارہ بچے ہلاک میرانشاہ میں مدرسے پر میزائل حملہ، رزمک جاتے ہوئے۔

میراں اماں کی نظریں اس پر ہوتیں۔

"اُدھر کی کوئی خبر بچہ؟"

"نہیں اماں جان کوئی خبر نہیں ہے سب ٹھیک ہے"۔ وہ ان سے نظریں چرا لیتی، حالانکہ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ نوشیرواں کے جانے کے بعد وہ میراں اماں کو گھر میں لے آئی تھی۔ اماں خوش تھیں تو فضیلت بھی خوش تھی۔ اسے سب کام کرنے والیوں کی طرح باتوں کا چسکا تھا، وہ کام کرتے ہوئے میراں اماں سے دُنیا جہاں کی باتیں کرتی رہتی اور خود سیمل کو لگتا تھا جیسے سالوں بعد گھر میں زندگی لوٹ آئی ہو۔ میراں اماں کے آنے سے جیسے گھر میں ایک دم برکت اور رونق آگئی تھی۔ کبھی کبھی نوشیرواں کے پرانے بیٹ مین حیدر کی بیوی آجاتی تو میراں اماں اسے لے کر گھر جاتیں اور گھر کی صفائی وغیرہ کروا کے واپس آجاتیں۔

"اچانک نوشیرواں آجائے تو گھر مٹی سے اَٹا پڑا ہو، وہ ناراض ہوگا"۔ وہ حیدر کی بیوی کو تاکید کرتی تھیں کہ تین چار روز بعد وہ ضرور چکر لگایا کرے۔

"اماں جان آپ کا لہجہ اتنا صاف ہے جیسے ہمارا لہجہ...... حالانکہ قبائلی اس لہجے میں بات نہیں کرتے۔ آپ کے لہجے سے تو بالکل پتا نہیں لگتا کہ آپ کا تعلق قبائلی علاقے سے ہے"۔ ایک روز اس نے پوچھا تھا۔

"اس لیے بچہ کہ میری ماں پنجابی تھیں، میرے والد آرمی میں میجر تھے اور میری والدہ ان کے جی سی او کی بیٹی تھیں۔ شیری کی دادی بھی پنجابی تھیں۔ میری والدہ نے ہی یہ شادی کروائی تھی، ان کی کزن تھیں وہ۔ ہمارے خاندان کے سب مرد آرمی میں رہے ہیں۔ شیری کے پڑنانا پاکستان بننے سے پہلے برٹش آرمی میں صوبیدار تھے۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں کو فوج میں ہی بھیجا۔ شیری کے نانا آرمی میں کرنل تھے۔ میں ایک فوجی کی بیوی اور ایک فوجی کی بیٹی ہوں۔ میرے دونوں بیٹے بھی آرمی میں ہی تھے، اس لیے ہم اپنے علاقے میں بہت کم گئے۔ میرا بچپن، لڑکپن اور پھر شادی کے بعد زندگی بھی زیادہ تر پنجاب، سندھ وغیرہ میں گزری۔ پاکستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں پوسٹنگ رہی۔ گل کا چچا اور میرا چھوٹا بیٹا 71ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کے محاذ پر شہید ہو گیا تھا"۔ وہ فخریہ انداز میں بتا رہی تھیں۔

''گل کے ابا نے آرمی سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ اسے گردوں کا کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔ تب ہم اپنے علاقے میں کئی سالوں بعد گئے تھے۔ میری دونوں بیٹیاں وہاں تھیں۔ شیری تو زیادہ تر ہمارے پاس ہی رہا۔ تعلیم حاصل کی پھر کمیشن مل گیا''۔ میراں اماں نے اسے تفصیل بتائی تھی لیکن وہ تو میراں اماں کے روشن چہرے کو دیکھتے ہوئے ایک ہی بات سوچ جا رہی تھی کہ وہ میراں اماں سے پوچھے جب انہیں اپنے بیٹے کی شہادت کی خبر ملی تھی تو انہوں نے کیا سوچا تھا۔ کیا انہیں فخر محسوس ہوا تھا یا ان کا دل چھلنی ہو گیا تھا۔ وہ روئی تھیں یا انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ وہ ایک شہید کی ماں ہیں۔ وہ تو مہینوں روتی رہی تھی، تڑپ تڑپ کر مچل مچل کر...... خالہ جی اور حمنہ اسے بہ مشکل سنبھالتی تھیں۔ اماں بس ایک جگہ بیٹھی ٹکر ٹکر اسے روتے دیکھتی تھیں اور پھر دیوانہ وار اُٹھ کر پورے گھر میں چکراتیں۔ ہر کمرے میں ان کی آنکھیں کسی کو کھوجتی تھیں اور پھر مایوس سی ہو کر وہ تخت پر بیٹھ جاتیں اور یسمل کو روتے مچلتے دیکھتی تھیں، خاموش اور چپ......

وہ کوئی بلند حوصلہ لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو بہت کمزور، عام اور معمولی لڑکی تھی اور اس کا دل بھی اتنا چھوٹا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مروان کی شہادت پر فخر محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے اس فخر کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے مروان کی ضرورت تھی۔ مروان جو اس کا بھائی تھا۔ اس سے پورے گیارہ سال بڑا، لیکن جب اس نے یسمل کو دوست بنایا تھا تو اس نے کہا تھا۔

''گڑیا، رومی تمہارا بڑا بھائی ہے اور مروان تمہارا دوست''۔ اور جب سے ان کے درمیان دوستی کا رشتہ بنا تھا، وہ اسے جب کبھی اپنی کوئی بات شیئر کرنا ہوتی مروان کہہ کر بلاتی...... ورنہ عام دنوں میں وہ اس کا رومی بھائی تھا۔ وہ بھائی بھی تھا اور دوست بھی تھا۔ حمنہ سے پہلے واحد دوست تھا، وہ اس کی شہادت پر فخر نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کے بچھڑ جانے پر بلکتی تھی۔ اللہ سے شکوہ کرتی تھی۔ کیا ضروری تھا کہ کارگل کی جنگ میں شہید ہونے والوں میں مروان بھی شامل ہوتا۔ اتنے سارے لوگوں نے جانیں دی تھیں ایک مروان نہ ہوتا تو کیا فرق پڑتا...... وہ ان کا واحد سہارا تھا اور پھر اس جنگ سے حاصل حصول تو کچھ ہوا نہیں، بس بہت سارے گھروں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ شاید وہ سب ان کی شہادت پر فخر کرتے ہوں لیکن وہ نہیں کر سکتی تھی۔ کبھی نہیں...... وہ میراں اماں کے پاس سے اُٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی اور مروان سے باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ ہر رات سونے سے پہلے ڈائری میں مروان کو مخاطب کر کے روز کی روداد لکھتی تھی۔ کتنے سال ہو گئے تھے اسے ایسا کرتے ہوئے۔ کتنی ڈائریاں بھری پڑی تھیں جب وہ لکھتی تو اسے لگتا جیسے وہ سچ مچ مروان سے باتیں کر رہی ہو۔ اگر وہ یوں

مروان سے ہر روز باتیں نہ کرتی تو شاید غم سے اس کا دل پھٹ جاتا۔ کتنے سال ہو گئے تھے مروان کو بچھڑے...... وہ سولہ جون 1999ء کا نو بجے والا خبرنامہ تھا جب اس نے وہ خبر سنی تھی اور پھر 17 جون کو اس کا جسدِ خاکی لاہور لایا گیا تھا۔ اسے حمنہ نے بتایا تھا جب وہ پاگلوں کی طرح ہر اس نمبر پر فون کر رہی تھی جو مروان نے اسے دیے تھے، تب حمنہ روتے ہوئے اس کے پاس آئی تھی اور اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''یسمل...... یسمل، بھائی کہہ رہا ہے کہ مروان بھائی اور کیپٹن احسن کے تابوت اسکردو سے آ گئے ہیں، ابھی ابھی ٹی وی پر دکھایا ہے اور وہ انہیں ملک ہاؤس میں لے گئے ہیں۔ تمہارے ابا کے گھر''۔ حمنہ اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ وہ مروان کو وہاں کیوں لے گئے تھے۔ کیا مروان نے وہاں کا ایڈریس لکھوایا ہوا تھا کہ...... وہ بہت سمجھ دار تھا۔ جانتا تھا ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے یا پھر مروان کی کوئی اور مصلحت تھی لیکن مروان کے تابوت کو ابا نے وصول کیا تھا۔ اس کا جنازہ وہاں سے اُٹھا تھا، اس گھر سے جسے وہ خود چھوڑ آیا تھا۔ وہ، خالہ جی، حمنہ، اماں اور محلے کی بہت ساری دوسری عورتوں کے ساتھ ملک ہاؤس گئی کتنے سالوں بعد...... وہ وہاں ملک ہاؤس میں لونگ روم سے ملحقہ بڑے ہال میں مروان کے تابوت کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے شیشے میں سے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس نے اماں کو ٹکر ٹکر تابوت کو دیکھتے دیکھا تھا۔ اس نے ابا کو دو تین بار اندر آتے اور تابوت پر جھک کر مروان کا چہرہ دیکھتے دیکھا تھا۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں اُٹھی تھی۔ وہ یونہی اماں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے حمنہ کے کندھے پر سر رکھے لکڑی کے تابوت کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے انہیں دیکھا تھا مروان کو لے جاتے، پھر پورے فوجی اعزاز کے ساتھ اسے دفن کر دیا گیا۔ وہ جن عورتوں کے ساتھ وہاں گئی تھی، انہی کے ساتھ واپس آ گئی۔ وہاں کیا تھا جو رُکتی۔

''تم اِدھر رُکو گی؟'' حمنہ نے پوچھا لیکن وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ابا پتا نہیں کہاں تھے۔ شاید باہر لان میں جہاں شامیانے لگا کر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ سمن آباد سے پاس پڑوس کے سب ہی مرد جنازے میں شامل ہوئے تھے۔ وہ اندرونی گیٹ سے نکل رہی تھی جب نازو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ان گزرے سالوں میں خاصی موٹی ہو گئی تھی۔

''سنو اب تمہارا بھائی مر گیا ہے تو کہیں اس پاگل عورت کو ساتھ لے کر اِدھر نہ آ جانا۔ دھکے مار کر نکلوا دوں گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا باپ اپنی بے عزتی بھول گیا ہے کہ تم نے عدالت میں کہا تھا، تم باپ کے ساتھ نہیں، ماں کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔ یہ تو میں ہوں جس نے اسے روکا ہوا

ہے ورنہ اب تک وہ تمہیں قتل کر چکا ہوتا"۔حمنہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔
"ہاتھ پیچھے کرو"۔اور پھر یہ حمنہ ہی تھی جو اسے، خالہ جی اور اماں کو گھر لے کر آئی تھی۔
اسے کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ کتنے سارے دن آس پاس کی عورتیں ان کی دل جوئی کے لیے آتی رہیں، کتنے ہی دن آس پاس کے گھروں سے کھانا پک کر آتا رہا، پھر خالہ جی نے منع کر دیا۔مروان صحیح کہتا تھا کہ یہ سب اچھے اور ہمدرد لوگ ہیں۔حمنہ تو ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی لیکن وہ تو جیسے خود سے بیگانہ ہو رہی تھی۔دن میں کئی کئی بار وہ مروان کے نمبر پر فون کرتی اور جواب نہ ملنے پر اس کے فون کے انتظار میں بیٹھ جاتی۔
اماں ایک بار پھر پہلی پوزیشن میں چلی گئی تھیں۔خاموش سپاٹ نظروں سے اپنے سامنے دیکھتی رہتیں۔اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ کسی اور ماحول اور منظر میں گم......حمنہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔اس نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔اس نے اماں کا خیال رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا، بس خالہ جی تھیں جو اماں کا بھی اور اس کا بھی خیال رکھ رہی تھیں۔اماں کو دوائی دینا، ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا، سارے کام خالہ جی کے تھے، تب ایک روز اماں کی سانس اُکھڑنے لگی۔انہیں دمے کی تکلیف ہو گئی تھی۔خالہ جی ڈاکٹر عرفان کو لے کر آ گئی تھیں۔ڈاکٹر عرفان نے اماں کا چیک اپ کر کے دوائی دی تھی اور اسے جھڑکا تھا۔
"آپ بالکل بھی اپنی اماں کا خیال نہیں رکھ رہی ہیں سیمل بی بی......جتنی امپروومنٹ ان کے کیس میں ہوئی تھی، وہ سب ختم ہو گئی ہے، وہ پھر زیرو پر آ گئی ہیں۔ایسا رہا تو آپ اپنی ماں کو بھی کھو دیں گی۔اکثر ایسے مریضوں کا رجحان خودکشی کی طرف ہو جاتا ہے"۔
"نہیں"۔وہ ساری جان سے کانپ گئی تھی۔وہ اماں کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔مروان کیا کہے گا، اس نے اماں کا خیال نہیں رکھا۔وہ ناراض ہو گا۔اس نے سوچا اور اماں کا اور زیادہ خیال رکھنے لگی۔ان کی کنگھی کرنا، انہیں وقت پر دوائیں دینا...... کپڑے تبدیل کرنا......ان کے کھانے کا خیال رکھنا، سارے کام اس نے ایک بار پھر اپنے ذمے لے لیے تھے۔تب پہلی بار اس نے ڈائری میں لکھا۔
"سوری مروان ناراض مت ہونا، میں اب اماں کا بہت خیال رکھوں گی"۔اس نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔حمنہ نے بی اے کر لیا تھا اور اس کے ابو نے اسے مزید پڑھنے سے منع کر دیا تھا لیکن وہ بی اے نہیں کر سکی تھی۔حمنہ اسے اُکساتی رہتی تھی۔
"پرائیویٹ بی اے کر لو سیمی، پڑھائی زندگی میں بہت کام آتی ہے"۔تب حمنہ کے

بے حد اصرار پر پورے پانچ سال بعد اس نے بی اے کیا تھا۔پرائیویٹ کیا تھا اور اس کا اے گریڈ آ گیا تھا اور انہی دنوں خالہ جی چلی گئی تھیں۔وہ بیٹے سے ملنے گئی تھیں، ہمیشہ کی طرح۔سال میں ایک بار وہ ضرور جاتی تھیں ملنے اور دو دن بعد واپس آ جاتی تھیں لیکن اس بار واپس آئیں تو دوبارہ جانے کے لیے۔وہ بہت رو رہی تھیں۔
"میرا بیٹا بہت بیمار ہے اور میں اسے بیمار چھوڑ کر یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے، اس بار وہ کہہ رہا تھا مجھے معاف کر دو اور میرے پاس آ جاؤ"۔سیمل انہیں روک نہیں سکتی تھی۔وہ چلی گئیں تو حمنہ نے فضیلت کو لگوا دیا۔
"ایماندار ہے اور محنتی بھی، اس کی ماں زمانوں سے ہمارے گھر کام کرتی ہے"۔
شروع میں فضیلت کام کر کے چلی جاتی تھی۔پھر حمنہ نے یونیورسٹی میں داخلے کا پروگرام بنا لیا۔
"تم بھی میرے ساتھ ایڈمیشن لے لو تو ابو مجھے آسانی سے اجازت دے دیں گے"۔
حمنہ سے بڑی دو بہنیں تھیں، ابھی ایک کی منگنی ہوئی تھی، دوسری کے لیے اچھے رشتے کا انتظار تھا۔
"اب کیا میں اپنی شادی کے انتظار میں فارغ بیٹھی رہوں۔اتنے سال تو ہو گئے فارغ بیٹھے"۔حمنہ نے اپنی اماں کو قائل کر لیا تو اس کے ابو بھی راضی ہو گئے اور حمنہ اپنے ساتھ سیمل کو بھی گھسیٹ لے گئی تھی۔
"مروان چاہتا تھا کہ تم بہت پُر اعتماد بنو، تو اس لیے ضروری ہے کہ تم گھر سے باہر نکلو"۔حمنہ نے ہی فضیلت کو اس کے یونیورسٹی سے واپس آنے تک گھر رہنے پر راضی کر لیا تھا۔
سیمل اسے اچھی تنخواہ دیتی تھی۔فضیلت نے انکار نہیں کیا تھا اور اب تو دونوں فائنل ایئر میں تھیں۔
اتنے سال بیت گئے تھے ابا نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔تین سال پہلے جب وہ حمنہ اور اس کے بھائی کے ساتھ قبرستان گئی تھی تو اس نے قبرستان سے نکلتے ہوئے ابا کی جھلک دیکھی تھی، اسے لگا تھا کہ جیسے ابا نے اسے آواز دی ہو۔وہ بھاگ کر روڈ پر آئی تھی اور پھر اسی لمحے روڈ پر ایک رکشا آ کر رُکا تو وہ حمنہ اور اس کے بھائی کے ساتھ رکشے میں بیٹھ گئی تھی اور جب رکشا روانہ ہوا تو اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ابا اسے لے جاتے، اسے قتل کر دیتے تو اماں کا کیا ہوتا......اماں کی خاطر اسے زندہ رہنا ہے اور ابا سے بچنا ہے۔اس نے سوچا۔
رات وہ بہت دیر سے سوئی تھی، اس لیے صبح نماز پڑھ کر ایک بار پھر سو گئی تھی۔میراں اماں نے اسے اُٹھایا نہیں تھا۔فضیلت نے اماں اور میراں اماں کا ناشتہ بنا دیا تھا اسے اُٹھانا چاہا تو منع کر دیا۔

"نہ پوری رات جاگ کے گزاری ہے اس نے، سونے دو"۔

"کیوں جی طبیعت خراب تھی کیا؟"

"بس کبھی کبھی زخموں کے ٹانکے کھل جاتے ہیں فضیلت"۔ میراں اماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ فضیلت ان کی بات کو نہ سمجھنے پر کندھے اُچکاتے ہوئے کچن میں چلی گئی تھی۔

سیمل جب سو کر اُٹھی تو میراں اماں باہر تخت پر بیٹھی تھیں اور حیدر کی بیوی سے باتیں کر رہی تھیں۔

"سیمل بچہ ناشتہ کر لو"۔

"آپ نے کر لیا اماں جان!" وہ ہاتھوں سے بال پیچھے کرتے ہوئے ان کے پاس آ کر تخت پر بیٹھ گئی۔

"ہاں بچے، یہ حیدر کی بیوی آئی ہے میں اس کے ساتھ جا کر ذرا گھر کی صفائی کروا لوں، کیا پتا آج کل میں نوشیرواں آ جائے اتنے دن ہو گئے اسے گئے"۔

"اماں جان آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں، رات بھی بخار تھا، میں چلی جاؤں گی حیدر کی بیوی کے ساتھ"۔ اس نے ان کی کلائی پکڑ کر نبض دیکھی۔

"ارے اماں جان آپ کو اب بھی بخار ہے۔ پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں"۔

"نہ بچہ یہ بخار ایسے ہی ہو جاتا ہے، کبھی کبھی جب دل بہت بوجھل ہوتا ہے، خود ہی اُتر جائے گا جب درد ڈھلے گا کچھ"۔ یہ دکھ چھوڑے کا تپ ہے بچہ۔ سیمل ایک دم چپ کر گئی...... رات اس نے میراں اماں کو کیا کیا کچھ یاد دلایا تھا۔ پتا نہیں رات اس کی طرح میراں اماں بھی سوئی تھیں یا نہیں۔

"اچھا آپ دوا تو لے لیجیے گا"۔

"فضیلت......" اس نے آواز دی۔ "میرا ناشتہ اور آپا کے لیے چائے لے آؤ یہیں"۔ ناشتہ کر کے وہ حیدر کی بیوی کے ساتھ میراں اماں کے گھر آ گئی تھی۔ کمروں کی صفائی کر کے حیدر کی بیوی کچن دھونے لگی تو وہ باہر تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ دھوپ پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ آج چودہ جون تھی اور سورج صبح ہی صبح آگ برسا رہا تھا۔ "پتا نہیں نوشیرواں کب آئے گا"۔ اس نے تخت پر بیٹھے بیٹھے سوچا۔

"میراں اماں کتنی اُداس اور افسردہ ہو گئی ہیں، اس کے جانے کے بعد"۔ وہ تخت پر بیٹھے بیٹھے نوشیرواں کو سوچ رہی تھی کہ صحن کا دروازہ کھلا اور نوشیرواں بیگ اُٹھائے اندر داخل ہوا۔ وہ بے حد تھکا تھکا اور نڈھال لگ رہا تھا۔

"آپ آ گئے"۔ سیمل یک دم کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ یک دم روشن ہو گیا تھا اور اسے لگا جیسے آگ برساتے سورج کے سامنے کوئی ٹھنڈا سرمئی بادل آ گیا ہو۔ کچھ دیر پہلے جو دھوپ آنکھوں کو چبھ رہی تھی، اب یکا یک جیسے اس کی چبھن ختم ہو گئی تھی۔ بیگ تخت پر رکھ کر وہ نڈھال سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیمل نے دیکھا، وہ کچھ کمزور ہو گیا تھا اور رنگت بھی کچھ زیادہ سنولا گئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ سیمل، کھڑی کیوں ہو"۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے تھے۔ "تم ٹھیک ہو نا سیمل اور اماں جان کیسی ہیں؟" اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔ سیمل کو بھی اس کا تم کہنا برا نہیں لگا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں"۔ حیدر کی بیوی نے کچن سے باہر آ کر اسے سلام کیا تو نوشیرواں نے اس کا بھی حال احوال پوچھا۔

"آپا آپ اماں جان کو بتا دیں کہ نوشیرواں آ گئے ہیں"۔ حیدر کی بیوی چلی گئی تو سیمل نے دیکھا، وہ سر جھکائے پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔

"آپ نے بہت دن لگا دیے، اماں جان اُداس ہو گئی تھیں"۔

"ہاں، دن کچھ زیادہ ہی لگ گئے"۔ اس نے بغور سیمل کی طرف دیکھا۔

"وہ میں آپا کے ساتھ اِدھر صفائی کروانے آئی تھی"۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر سیمل نے وضاحت کی۔

"میں نے آپ سے یہاں ہونے کی وضاحت تو نہیں مانگی سیمل...... بلکہ مجھے اچھا لگا آپ کو یہاں دیکھ کر، جیسے کوئی خواب تعبیر پا جائے۔ جیسے مدتوں بعد کوئی مسافر گھر آئے تو گھر میں وہی اس کا منتظر ہو، جس کے منتظر ہونے کی اس نے چاہ کی ہو۔ سارے سفر کے دوران اسے سوچا ہو"۔ سیمل نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ بہت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تپش سے گھبرا کر سیمل نے نگاہیں جھکا لیں۔

"گل...... گل کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں"۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سیمل کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

"میں جان عالم سے ملا...... وہ کہتا ہے گل کسی بھی قسم کی سرگرمی میں ملوث نہیں تھا۔ ہاں اپنے خاندان کے اتنے افراد کی موت نے اسے بالکل چپ کر دیا تھا۔ وہ پشاور آنے کے بعد کئی دن تک بالکل چپ رہا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا تھا پھر ایک دن وہ ایک تنظیم کے دفتر میں جا کر رائفل چلانا سیکھنے لگا۔ وہ ایک ایسا قبائلی تھا سیمل جس نے کبھی بندوق نہیں پکڑی تھی۔ وہ ایسا

کیوں کر رہا تھا، جان عالم نہیں جانتا تھا لیکن پھر ایک دن اس نے بندوق پھینک دی۔

"نہیں، میں یہ نہیں کر سکتا"۔ اس روز وہ ہاسٹل کے کمرے میں دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ بس وہ چند دن وہاں گیا تھا، ابھی تو اسے صحیح طرح سے نشانہ لگانا بھی نہیں آیا تھا۔ وہ بندوق نہیں اُٹھا سکتا تھا، میں جانتا ہوں۔ وہ لفظوں، پھولوں، رنگوں اور تتلیوں سے محبت کرنے والا تھا۔ شاعر...... نازک دل شاعر۔ وہ آرمی میں نہیں گیا...... اس نے ماموں کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ آرمی میں نہیں جا سکتا۔ جان عالم کہتا ہے اس روز کے بعد وہ پھر چپ ہو گیا تھا۔ وہ تھا اس کا کمرا اور اس کی کتابیں، پھر ایک روز پتا نہیں کیوں کس شعبے میں......" وہ خاموش ہو گیا تو سیمل نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہاں اخباروں میں اچھی خبریں نہیں آتیں۔ ہر روز حملے...... ہر روز مرنے کی اطلاع...... ہاں ایسا ہی ہے۔

میں وادیِ شوال میں تھا جس روز وہاں شدید بمباری ہوئی اور میرانشاہ میں جس روز مدرسے پر میزائلوں سے حملہ ہوا۔ میں اُس مدرسے میں بہادر شاہ سے ملنے گیا ہوا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ بہادر شاہ کا بھی ایک بھائی لاپتہ ہے۔ میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس کے بھائی کا کوئی پتا ملا۔ مجھے کوئی گائیڈ لائن چاہیے تھی، گل کو ڈھونڈنے کے لیے۔ وہ نہیں ملا۔ وہ اُس مدرسے میں پڑھاتا تھا لیکن وہ بھائی کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔

ہمارے علاقے سے تین چار سے زیادہ لوگ لاپتہ نہیں ہوئے اور ان میں گل کے علاوہ بہادر شاہ کا بھائی بھی ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا سیمل مدرسے میں بچے تھے۔ نو سے چودہ پندرہ سال تک کی عمر کے بچے، یا پھر اُن کے کچھ اُستاد۔ وہ دہشت گرد نہیں تھے اور وہ سب مر گئے، چالیس کے چالیس تم نے اخبار میں پڑھا ہو گا۔

سیمل نے سر ہلا دیا۔

وہ کہتے ہیں یہاں طالبان چھپے ہوئے ہیں۔

افغانستان الزام لگاتا ہے کہ القاعدہ کے لوگ بھاگ کر اِدھر آئے ہیں اور اَب یہاں سے کارروائیاں کرتے ہیں۔ کون خرید رہا ہے، کون بک رہا، کچھ پتا نہیں چلتا۔ تو پھر......

سیمل پوچھنا چاہتی تھی کہ۔ ہاں پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے اور نوشیرواں جیسے اس کے دل کی بات جان گیا۔

"ہاں، پتا نہیں کون لوگ ہیں اور ان کی پشت پر کون ہیں۔ کوئی غدار...... بکے ہوئے

لوگ۔ قبائلیوں کی ساٹھ سالہ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی حکومت کے خلاف کچھ نہیں کیا، پھر اب یکایک وہ کہتے ہیں یہاں دہشت گرد چھپے ہوئے ہیں۔ سرکاری اہل کار مارے جاتے ہیں۔ حملہ کرنے والے کون ہیں۔ دہشت گرد...... لیکن یہ دہشت گرد اچانک کہاں سے ہماری زمینوں پر اُگ آئے ہیں"۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے اور بے حد اُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ تب ہی دروازہ کھلا اور میراں اماں اور ان کے پیچھے پیچھے فضیلت ہاتھ میں روح افزا کا جگ لیے آ رہی تھیں۔ نوشیرواں کھڑا ہو گیا۔ میراں اماں بے تابی سے اس کی طرف بڑھیں، نوشیرواں نے انہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا۔

"ارے بچہ گرمی سے گھبرا کر نہانے چلی گئی تھی میں، کب آیا؟" وہ اس کی پیشانی چوم رہی تھیں۔

"میں نے کہا گرمی سے آئے ہیں میجر صاحب تو فٹافٹ ٹھنڈا شربت بنا لوں"۔

فضیلت نے جگ تخت پر رکھا۔ فضیلت نے اپنی کارکردگی جتائی تو سیمل مسکرا دی۔

"یہ تم نے اچھا کیا۔ اب فٹافٹ کچن سے گلاس بھی لے آؤ"۔

"یہاں تپش ہے بچہ اندر کمرے میں چلو"۔ نوشیرواں بیٹھنے لگا تو میراں اماں نے کہا۔

"میں اب چلتی ہوں اماں جان، کھانا اُدھر سے بھجوا دوں گی"۔ سیمل کھڑی ہو گئی تھی۔

نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ فریش ہو جائیں تو پہلے چائے بھجوا دوں"۔ وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔ نوشیرواں کو لگا جیسے اندر دور تک کوئی مٹھاس سی گھل گئی ہو۔

"نہیں، میں کھانے کے بعد ہی چائے پیوں گا"۔ وہ مسکرایا تھا اور سیمل دیوار پر سے دوسری طرف کود گئی تھی۔ جاتے جاتے اس نے سنا تھا، میراں اماں کہہ رہی تھیں۔

"سیمل بہت اچھی بچی ہے۔ شیری بہت محبت کرنے والی...... میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ......" اور سیمل ان کی پوری بات نہیں سن سکی تھی، پھر کتنے ہی دن تک وہ اس نامکمل بات کو مکمل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

جبکہ میراں اماں نے بات مکمل کی ہی نہیں تھی اور ریوالونگ چیئر پر جھولتے ہوئے نوشیرواں عادلی سوچ رہا تھا کہ کاش اماں جان بات مکمل کر دیتیں تو میں بھی اپنے دل کی خواہش ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتا اور کیا ہی اچھا ہو کہ میری اور اماں جان کی خواہش ایک ہو اور اس بے رنگ زندگی میں رنگ اُتر آئیں۔ بلاشبہ سیمل خان بہت پیاری تھی اور پہلی نظر میں ہی وہ اس

کے دل میں اُتر گئی تھی۔ اس روز وہ بہت دیر تک سیمل کے متعلق سوچتا رہا تھا، حتیٰ کہ شام گہری ہو گئی اور میراں اماں نے مغرب کی نماز پڑھ کر اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ چیئر پر بیٹھا کمپیوٹر کی خالی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ میراں اماں نے لائٹ جلائی۔

"مغرب ہوگئی اور تم اندھیرے میں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں اماں جان"۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"بچہ تم نے مغرب کی نماز بھی نہیں پڑھی"۔

"جی"۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ "مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ مغرب ہو گئی"۔

"کیا سوچ رہے تھے بچے؟" انہوں نے اس کی کشادہ پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کیے۔

"اماں جان دل بہت اُداس ہے، کتنے گہرے سناٹے اُتر آئے ہیں ہماری زندگی میں...... اندر باہر، ہر جگہ سناٹا ہے اور اب کیا یہ سناٹے ہمیشہ کے لیے ہمارا مقدر ہو گئے ہیں، جو چلے گئے وہ تو چلے گئے اور جو ہے وہ نہ جانے کہاں ہے۔ پتا نہیں ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو جانے کس اذیت، کتنی تکلیف میں ہے، میں تو گیارہ ماہ سے اسے کھوج کھوج کر تھک گیا ہوں، کہیں سے کوئی خبر، کوئی پتا نہیں"۔ اس کی خم دار پلکیں بھیگ رہی تھیں اور آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ اماں جان اس کی کرسی کے پیچھے سے ہٹ کر اس کے سامنے پڑی چیئر پر بیٹھ گئیں۔

"شیری بچے ایسا کیا ہو گیا ہے جب سے علاقے سے ہو کر آیا ہے، اتنی نا اُمیدی، اتنی مایوسی......"

"اب ہونے کو اور کیا رہ گیا ہے اماں جان"۔

"نہ بچہ ایسا نہیں کہتے، اُٹھ کے دو نفل پڑھ کے اللہ سے صبر و استقامت مانگ۔ اللہ ہمارے گل کو ہم سے ملائے۔ وہ ہے نا ہمارے لیے اُمید کی کرن، آس کا تارا، جینے کا آسرا"۔

"اماں جان"۔ اس نے تھوڑا سا ان کی طرف جھکتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں آپ جیسا حوصلہ اور صبر کہاں سے لاؤں۔ میرا دل پھٹ جانے کو ہے، وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ صرف ملبے اور اینٹوں کا ڈھیر۔ ویران، بے آباد، آدھی گری، آدھی کھڑی دیواریں، ٹوٹی چھتیں، صرف ڈیڑھ سال پہلے وہاں ایک گھر تھا، ایک چار دیواری تھی جہاں زرمینے کی معصوم کھلکھلاہٹیں تھیں، جہاں زینے کدکڑے بھرتی تھی اور آپ کی ڈانٹ کھا کر ہنستی تھی، جہاں چاندنی راتوں میں چبوترے پر بیٹھ کر گل اپنی غزلیں اور نظمیں سناتا تھا اور سب اسے چھیڑتے تھے اور اب وہاں صرف دلدار ہے جو کسی ٹوٹی دیوار پر بیٹھ کر سارا دن روتا ہے اور آوارہ کتے ہیں جو اس کھنڈر

میں دلدار کے پتھر کھا کر چلاتے ہیں"۔

"بس کر بچہ...... بس کر، کیوں ماں کا صبر آزماتا ہے اور اس کا سینہ چھلنی کرتا ہے"۔

نوشیرواں عادل نے ان کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا تو میراں اماں کا دل جیسے پانی بن کر آنکھوں سے بہنے کو بے تاب ہوا۔

"تُو تو میرا بہادر فوجی بچہ ہے، پھر کیوں اتنا دل ڈھا لیا ہے تُو نے"۔

اور نوشیرواں عادل نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا تھا، ورنہ اُس کا جی چاہتا تھا، وہ بولتا رہے اور یہ جو یکایک اُس کے اندر اتنا حبس اور گھٹن پیدا ہو گئی ہے، ختم ہو جائے لیکن اُس نے میراں اماں کی طرف دیکھا تھا جن کی آنکھیں چھلک جانے کو بے تاب تھیں اور جو بے حد پریشان ہو کر اُسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ زبردستی مسکرایا تھا۔

"Sorry، اماں جان۔ کبھی کبھی انسان کا دل ہارنے بھی تو لگتا ہے۔ دلدار آپ کو بہت یاد کرتا تھا"۔

"لے آتے اُسے، بے چارا لڑکا چھوٹا سا تھا تو ہمارے گھر آیا تھا۔ زرمینے بہت رونی بچی تھی۔ تیرے بابا نے اُسے زری کے لیے ہی رکھا تھا۔ ہر وقت گود میں اُٹھائے رکھتا تھا تو خوش رہتی تھی۔ زرمینے بڑی ہو گئی، پر دلدار اسی گھر کا ہو گیا۔

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے اُس سے کہا تھا اماں جان کہ وہ میرے ساتھ چلے لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔ تب بھی جب میں سارے خاندان کو مٹی تلے دبا کر آپ اور گل کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا تھا اور اب بھی بہت کہا۔ پتا ہے اماں جان وہ تو صبح سویرے ہی وہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے اور روتا رہتا ہے۔ اُس خالی بھنڈار جگہ کو دیکھ کر۔ کسی کو اینٹ تک اُٹھانے نہیں دیتا۔ یہ بھی وفا کا کیسا رنگ ہے اماں جان، حالانکہ وہ دماغی طور پر کچھ کمزور ضرور ہے لیکن ہمارے خاندان کے ساتھ اُس کی محبت اور رشتہ کمزور نہیں ہے۔ وہاں لوگ کہتے ہیں، رات کو اُس کا باپ زبردستی اُٹھا کر لے جاتا ہے ورنہ وہ تو رات بھی وہاں گزار دے۔

ایک دلدار ہے جو ملبے اور اینٹوں کے ڈھیر کی بھی حفاظت کرتا ہے اور ایک وہ ہیں جو وطن کو اینٹوں کا ڈھیر بنانے پر تلے ہیں، جن کے ہاتھ لہو میں رنگے ہیں، جو دہشت گرد ہیں یا کسی کے ایجنٹ، غدار ہیں یا ملک دشمن، یہ معمہ کب اور کیسے حل ہو گا، شاید کبھی نہیں۔

نوشیرواں نے سوچا اور ایک گہری سانس لے کر اُٹھ گیا۔ مغرب قضا ہو گئی تھی اور اب

عشا کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ وضو کر کے آیا تو میراں اماں کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اُن کے رُخسار بھگو رہے تھے۔ پتا نہیں کیا کچھ یاد دلا دیا تھا اُس نے جو زخموں کے ٹانکے اُدھڑ گئے تھے۔

وہ چپکے سے جائے نماز اُٹھا کر باہر نکل آیا۔ اُس نے نماز برآمدے میں پڑھی تھی۔ نماز پڑھ کر اُس نے مڑ کر سیمل کے گھر کی طرف دیکھا اور اُس کے دل نے شدت سے خواہش کی کہ سیمل دیوار کے اُس طرف سے چھلانگ لگا کر ادھر آ جائے لیکن دیوار ویران تھی اور دوسری طرف کوئی نہیں تھا۔ دوسری طرف کے برآمدے میں جلنے والی لائٹ کی روشنی اُن کے صحن میں آ رہی تھی لیکن دوسری بالکل خاموشی تھی، شاید سیمل اور اُس کی اماں اندر کمرے میں تھیں، ورنہ اگر وہ برآمدے یا صحن میں ہوتی تو اپنی اماں سے مسلسل باتیں کرتی رہتی تھی اور وہ صحن میں بیٹھا اُس کی مدھم آواز سنتا۔ اُس کی باتیں بہت کم سمجھ آتی تھیں لیکن جو لفظ کان میں پڑتے، اُن میں مردان کا نام زیادہ ہوتا تھا۔ سیمل کو مردان سے بہت محبت تھی اور شاید سب بہنوں کو بھائیوں سے اتنی ہی اور ایسے ہی محبت ہوتی ہے۔

شائل کو بھی تو اُس سے ایسی ہی محبت تھی۔ جب وہ چھوٹی سی تھی تو لالہ لالہ کر کے ہر وقت اُس کے گرد چکراتی رہتی۔

اُس کے سر میں درد ہوتا تو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُس کا سر دباتی اور اب جب وہ اٹھارہ انیس سال کی تھی تب بھی وہ یوں لالہ لالہ کرتی، اُس کے گرد چکراتی رہتی تھی۔ وہ جب بھی چھٹی پر آتا تو وہ اُس کی شادی کے پروگرام بناتی۔ اُس کے لیے لڑکیاں منتخب کرتی اور وہ اُس کی پسند کی ہوئی لڑکیاں پسند نہ کرتا تو ناراض ہوتی، منہ پھلا لیتی۔

بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ میں تو خاندانی روایات پر چلتے ہوئے اپنے کسی کرنل جنرل کی بیٹی سے شادی کروں گا۔

"اچھا...... سچ کیسی ہے وہ

وہ فوراً مان جاتی

یہ بہنیں بھی کتنی پیاری ہوتی ہیں اور کتنی عزیز۔

گلابی رنگت، سنہری آنکھیں، نازک سراپا۔

اماں اُسے شہزادی کہتی تھیں۔

"ارے اماں جان! یہ بھلا کہاں کی شہزادی ہے۔ ہاں شہزادی کی کنیز ہو سکتی ہے۔

وہ اُسے چھیڑتا تھا۔

اور اب جب وہ اُن سب کو رخصت کرنے کے لیے لاہور سے آیا تھا تو سب کو دیکھتا بے تابی سے اُس کو تلاش رہا تھا۔

"شمو...... شمو کہاں ہے؟"

سترہ کفن میں لپٹے وجودوں میں، لیکن وہ بھی تو تھی اُس کی لاڈلی بہن۔ تب اماں جان نے اُسے روک دیا تھا۔

"نہ...... نہ بچہ نہیں دیکھ سکے گا اُسے، ساری عمر تڑپے گا شیری۔

وہ اُسے کھینچ کر لے گئی تھیں، وہاں جہاں دلدار بیٹھا پتھروں سے سر پٹخ رہا تھا۔

شمو آپا کے تو سر پر بم کا ٹکڑا لگا تھا اور...... اور یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ اُس نے شائل کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے تصور میں شائل ایسے ہی تھی، ہنستی، مسکراتی، شرارتیں کرتی۔

وہ بالکل سیمل جیسی ہی تو تھی۔

لیکن نہیں سیمل کی آنکھیں تو اُداسی لٹاتی ہیں۔ اُس کا وجود تو کسی دُکھ کے بادل میں گھرا لگتا ہے جبکہ شائل تو......

اور پتا نہیں سیمل اتنی اُداس کیوں رہتی ہے۔ شاید اپنی اماں کی وجہ سے، یا پھر مردان کی وجہ سے، جو پتہ نہیں کہاں تھا۔ امریکہ، انگلینڈ، کینیڈا جو شاید کئی دوسرے پاکستانی لڑکوں کی طرح دور دیسوں میں جا کر وہاں کا ہی باسی بن گیا تھا۔

سیمل آخر اُسے بلاتی کیوں نہیں، روز اُس سے باتیں کرتی ہے تو اُسے یہ کیوں نہیں بتاتی کہ اماں اُسے کھوجتی ہیں۔ کیا خبر اُس کے آنے سے وہ ٹھیک ہو جائیں۔ میں کہوں گا سیمل سے وہ مردان سے کہے کہ ایک بار تو وہ آئے۔

وہ اُٹھا، اُس نے جائے نماز تہہ کر کے تخت پر رکھی اور دیوار کی طرف دیکھا۔

دیوار کے اس طرف اب بھی خاموشی تھی اور پتا نہیں یہ سیمل کل سے کہاں چھپی ہوئی ہے، حالانکہ دن میں ایک دو بار تو ضرور دیوار سے جھانک کر اماں کو آواز دیتی تھی۔ اندر کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ پھر سوچ رہا تھا۔ کل کے بعد وہ پھر نظر نہ آئی تھی اور اُس کا دل اُسے دیکھنے کو مچلتا تھا۔

☆☆☆

اور سیمل اپنے بیڈ پر لیٹی اماں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا رُخ اماں کی طرف تھا۔ اماں اپنے بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ دونوں ہاتھ دُعا کے انداز میں ایک دوسرے سے جوڑے وہ انہیں غور سے دیکھ

رہی تھیں۔ کیا اماں اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنی قسمت دیکھ رہی تھیں۔

"اماں کیا دیکھ رہی ہیں؟" کہنی کے بل ذرا سا اونچا ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"یہ......" اماں نے اس کی طرف دیکھا۔ "اِدھر آ"۔ وہ اُٹھ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے اماں نے دل کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں ہاتھوں کی لکیریں مل کر خوب صورت 'ب' بنا رہی تھیں۔ اماں کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور تب اچانک اسے یاد آیا کہ اسکول میں لڑکیاں یونہی ایک دوسرے کے ہاتھ جوڑ کر 'ب' بناتی تھیں جس کی 'ب' خوب صورت بنتی، وہ کہتیں اس کا شوہر خوب صورت ہوگا اور اماں کے شوہر خوب صورت تھے اور کیا وہ واقعی خوب صورت تھے؟ اس نے سوچا اور واپس اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ کل سے اس کا دل بہت اُداس تھا۔ آج صبح وہ یونیورسٹی بھی نہیں گئی تھی۔ حمنہ نے بھی چھٹی کر لی تھی۔ اس نے میراں اماں کا حال بھی نہیں پوچھا تھا اور ......اور نوشیرواں...... وہ پتا نہیں گھر پر ہے یا...... ایک لمحے کے لیے اس نے نوشیرواں کو سوچا تھا، دوسرے لمحے وہ پھر اماں کو دیکھنے لگی تھی، جو ہتھیلیاں جوڑے ابھی تک اپنے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھیں۔

"اماں آپ کو پتا ہے کل سولہ جون ہے، سولہ جون"۔ اس نے دل ہی دل میں انہیں مخاطب کیا۔ کاش سولہ جون کبھی نہیں آتی۔ وہ سولہ جون کو کیلنڈر کے صفحات سے نکال سکتی۔ اس نے آنکھوں کی نمی کو ہتھیلیوں کی پشت سے صاف کیا اور کھڑی ہو گئی۔

"اماں چلیں باہر چلتے ہیں۔ یہاں اندر بہت گھٹن ہے"۔ اماں نے دونوں ہاتھ نیچے کیے اور نفی میں سر ہلایا، تب وہ خود ہی اُٹھ کر باہر آ گئی۔ اوپر آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔

"مجھے یہ گھر اس لیے پسند ہے کہ یہاں صحن میں سے اوپر آسمان نظر آتا ہے اور آسمان پر جگ مگ، جگ مگ کرتے ستارے بالکل دادا جان کی حویلی کی طرح وہاں سے بھی آسمان ایسا ہی نظر آتا ہے لیکن......" قریب سے ہی مردان کی سرگوشی سنائی دی تھی، اس نے برآمدے میں کھڑے کھڑے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

"مردان"۔ اس کے لبوں سے سسکی نکلی اور وہ تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ آنسو اس کے رُخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اس نے دونوں پاؤں تخت پر رکھ لیے تھے اور گھٹنوں پر سر رکھے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ ہولے ہولے اس کی سسکیاں بند ہو گئی تھیں۔

نوشیرواں اماں کو نماز میں مشغول دیکھ کر پھر باہر آ گیا، اب وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔ جون کے اس تپتے دن کی رات خوشگوار تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور ہوا میں تپش بھی نہیں تھی۔ آٹھ

سال پہلے وہ پندرہ جون کی رات تھی جب وہ ایک ماہ سیکٹر بٹالک پر ڈیوٹی دینے کے بعد کارگل سیکٹر میں آیا تھا۔ وہ نومبر سے جنوری تک سیاچن محاذ پر موجود تھا۔ سردی کی شدت چار سو برف ہی برف فضا میں آکسیجن کی شدید کمی کے باوجود وہ ان برف زاروں پر ڈیوٹی دیتا رہا تھا۔ اس کے پاؤں Frostbite کا شکار ہو چکے تھے لیکن ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود وہ رضا کارانہ طور پر پھر آ گیا تھا۔ پندرہ جون کی اس رات جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں ہوا تیز چلتی تھی۔ دشمن کی سنسناتی گولیاں، بارود اُگلتی توپیں......اور زمین کے اندر چھپے مائنز کی پروا کیے بغیر وہ دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے، کیپٹن خان کی قیادت میں سب کئی دنوں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس نے کیپٹن خان کے جذبے کو دل ہی دل میں سراہا تھا، کیپٹن خان سے اس کی دوستی اسکردو میں ہوئی تھی۔ کیپٹن خان بہت پُر جوش تھے، پھر انہوں نے کئی اہم چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا اور جب بھارتی فوجی چوکیوں سے فرار ہو رہے تھے تو کسی فوجی نے دستی بم پھینکا تھا اور بم کے کئی ٹکڑے اس کی ٹانگ میں گھس گئے تھے۔ جب وہ اسے کیمپ میں لے جا رہے تھے تو کیپٹن خان نے وکٹری کا نشان بنایا تھا اور اس نے بھی اُنگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا تھا اور نیچے عارضی قائم کیے اسپتال میں جب اس کی ٹانگ سے بم کے ٹکڑے نکالے جا رہے تھے تو اس نے سنا کہ دشمن نے گن شپ ہیلی کاپٹروں سے گولیوں اور بموں کی بارش کر دی تھی اور یہ سولہ جون تھی جب اسے راول پنڈی بھجوانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں جب کسی نے بتایا کہ کیپٹن خان شہید ہو گئے۔ یقیناً کیپٹن خان نے ابدی زندگی پا لی تھی لیکن پچھلے ایک سال سے ان کا ساتھ تھا۔ اسکردو میں، چراٹ آرمی میس میں لجپال پوسٹ پر ہر جگہ وہ ساتھ تھے۔ اسٹریچر پر لیٹے لیٹے نوشیرواں نے کیپٹن خان کے لیے بہت سارے آنسو بہائے تھے۔ جب اسے ہیلی کاپٹر میں منتقل کیا جا رہا تھا، وہ تب رو رہا تھا۔

صحن میں ٹہلتے ٹہلتے نوشیرواں کو لگا جیسے اس کے رُخسار گیلے ہو رہے ہوں۔ اس نے ہاتھ رُخسار پر رکھے تو وہ بھیگ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شہادت اس کا نصیب کیوں نہیں بنی......تب اس نے سوچا تھا لیکن جب وہ ایک ایک کر کے سترہ بندے دفنا کر کھڑا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ شاید اللہ نے اس دن کے لیے اسے بچایا تھا کہ اسے ان پیاروں کو اپنے ہاتھوں سے مٹی تلے دبانا تھا اور میراں اماں اور گل کو سہارا دینا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رُکا۔ وہ بالکل سیمل کے گھر کی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ فضا میں موتیے کے پھولوں کی مہک تھی اور سناٹے میں کسی کی سسکیاں سنائی دی تھیں اور یہ سسکیاں دیوار کے اُس طرف سے آ رہی تھیں۔

"کیا سیمل......؟" وہ بے قرار سا ہو کر دیوار کے قریب چلا گیا۔ خاموشی اور سناٹے

میں سسکیاں بہت واضح تھیں۔
''پتا نہیں یسمل اُتنا روتی کیوں ہے؟ ہمیشہ اس کی پلکیں بھیگی دکھتی ہیں اور غزال آنکھوں میں شکاریوں کے... سے بھاگنے والی ہرنی کا سا ڈر اور ساتھیوں سے بچھڑ جانے کا ملال ہوتا ہے۔
''کیا وہ مروان کو یاد کر کے روتی ہے اور کیا اسے اپنے ابا کا خوف ہے لیکن اس نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ اسے اپنے ابا سے کیا خوف ہے''۔ وہ بے چین سا مڑا تو اس نے دیکھا میراں اماں نماز سے فارغ ہو کر اس کے کمرے سے باہر آ رہی تھیں۔ برآمدے میں آ کر انہوں نے نوشیرواں کی طرف دیکھا۔
''شیری بچہ دو پھلکے پکا لوں تیرے لیے''۔
''ابھی نہیں اماں جان''۔ وہ برآمدے میں آ گیا۔
''دس تو بجنے والے ہیں بچہ، پھر کس وقت کھائے گا، میں پھلکے ڈال لیتی ہوں تو اتنے میں مائیکرو میں سالن گرم کر لے''۔
''اماں جان''۔ ان کی بات کا جواب دیئے بغیر اس نے بے قراری سے کہا۔ اماں جان اُدھر سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ شاید یسمل رو رہی ہے''۔
''ہاں، وہی روتی ہو گی''۔
''کیوں اماں جان، وہ کیوں روتی ہے اتنا۔ کیا مروان کے لیے؟''
''ہاں بچہ''۔ میراں اماں تخت کے کونے پر ٹک سی گئیں۔ ''نازک ہے، کمزور دل ہے اور دُکھ اس کی طاقت اور ہمت سے زیادہ ہے، جب ہمت جواب دے دیتی ہے تو...... میں نے اکثر راتوں کو اسے روتے اور مروان سے باتیں کرتے دیکھا ہے''۔
''تو اماں جان''۔ وہ بھی وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ ''وہ کیوں نہیں مروان سے کہتی کہ وہ آ جائے''۔ یسمل کے آنسو اس کے دل پر گرتے تھے اور سسکیاں سماعت کو اذیت دیتی تھیں۔
میراں اماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''پاغلا (پاگل) بھلا اُدھر سے بھی کوئی آ سکتا ہے''۔
''اماں جان''۔ ان کی بات کا مطلب سمجھے بغیر نوشیرواں جھنجلایا۔ ''آج کل فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ کینیڈا ہو یا دُنیا کا آخری کنارہ، جس نے آنا ہو وہ آ جاتا ہے''۔ اماں جان نے ایک گہری سانس لی۔
''پر اُدھر سے کب کوئی آیا ہے، آ سکتے تو ہم زینبیے، شمو، خانیاں، زبیر سب کو نہ بلا

لیتے پاغلا''۔
''کیا مروان......؟'' نوشیرواں کا منہ کھلا رہ گیا۔
''ہاں بچے''۔
''نہیں''۔ وہ ابھی تک حیرت سے اماں جان کو دیکھ رہا تھا۔ ''پر وہ تو ایسے بات کرتی ہے مروان کی جیسے وہ زندہ ہو اور اس سے بات کرتا ہو۔ اس کی بات سنتا ہو''۔
''ہاں، اس نے اپنے اندر اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ اپنی ڈائری میں لکھ کر اس سے باتیں کرتی ہے، جس صبح تو آیا تھا اس کی تو پوری رات وہ جاگی ہے، میں دیکھ رہی تھی اس کی بے چینی اور تڑپ اور اب آج رات بھی کہاں سو پائے گی، کل سولہ جون ہے۔ سولہ جون کو ہی مروان شہید ہوا تھا۔ ادھر کارگل سیکٹر میں......تو بھی تو اُدھر رہا شیری، جانتا ہو گا اسے''۔ 16 جون، مروان کیپٹن مروان خان شہید، لاہور۔ وہ چونکا تھا۔
مروان خان جسے وہاں سب کیپٹن خان کہتے تھے اور چراٹ آرمی میس میں کچھ ایسے بھی تھے جو اسے رومی کہتے تھے۔ وہ جواں سال کیپٹن حسام اسے ہمیشہ مولانا رومی کہتا تھا۔ رومی اس کا نک نیم تھا اور کیپٹن حسام اس کا کالج کا ساتھی۔ کیپٹن خان جو اسکردو میں اور جو سیاچن کی برف پر بیٹھ کر کھلے آسمان تلے اپنی گڑیا کی باتیں کرتا تھا، جو اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی، اس کے پاس گڑیا کے علاوہ اور کوئی موضوع ہوتا نہیں تھا۔ وہ گڑیا کے ساتھ حامو چاچا سے پرانی کتابیں خریدتا تھا۔ اسے کہانیاں سناتا تھا، کتنی ہی باتیں اس نے نوشیرواں سے شیئر کی تھیں۔
''حامو چاچا ہمارے لیے اچھی کتابیں الگ کر کے رکھ دیتا تھا''۔ 14 جون کی صبح کارگل محاذ کے متعلق باتیں کرتے کرتے اچانک اس نے کہا تھا۔
''اور شاید اب گڑیا کبھی حامو چاچا سے کتابیں خریدنے نہیں جا سکے گی۔ وہ اکیلی تو کبھی گئی ہی نہیں اور حامو چاچا ہمارا انتظار کرتا رہے گا۔ تم کبھی لاہور جاؤ شیری تو حامو چاچا کو ضرور بتا دینا''۔ اس نے کیپٹن خان کو ٹوکا نہیں تھا، وہاں سب ہی شہادت سے گلے ملنے کو تیار بیٹھے تھے۔
''مجھے شہادت کی خواہش تو ہے لیکن مجھے اماں اور گڑیا کا خیال آتا ہے''۔ پندرہ جون کو جب اسے اسٹریچر پر لٹایا جا رہا تھا تو اس نے کہا تھا۔ وہ کبھی حامو چاچا کے پاس انارکلی نہیں جا سکا تھا۔ کیا پتا وہ اب بھی یسمل اور مروان کا انتظار کرتا ہو اور ان کے لیے اچھی اچھی کتابیں چھانٹ کر رکھتا ہو۔ میراں اماں اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔
''اچھا میں اب روٹیاں بنا لوں؟'' انداز سوالیہ تھا۔ اس نے سر ہلا دیا تھا، حالانکہ اس کا

کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اور اگر وہ نہ کھاتا تو پھر میراں اماں بھی بھوکی ہی سو جاتیں۔ میراں اماں کچن میں چلی گئی تھی اور وہ اُٹھ کر پھر صحن میں آ گیا تھا۔ دیوار کے اس پار سے اب بھی سسکیاں سنائی دے رہی تھی، وقفے وقفے سے اور اس کا دل دیوار سے ادھر کرلاتا تھا۔ کاش وہ سیمل کے آنسو اپنی اُنگلیوں کی پوروں سے چن سکتا۔ اس کے اس غم پر اسے گلے لگا کر تسلی دے سکتا۔ سسکیاں تھم گئی تھیں، شاید وہ اُٹھ کر اندر چلی گئی تھی، اس نے سوچا اور میراں اماں کی طرف دیکھا جو کچن سے نکل کر روٹیاں پکنے کا بتا رہی تھیں۔ اس نے صحن میں پھیلی موتیے کی مہک کو سانس کے ذریعے اندر اُتارا اور برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔

سیمل روتے روتے تھک گئی تھی، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کیا اور برآمدے میں لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو کر سوج گئی تھیں۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ برآمدے میں دائیں طرف لگے بیسن کی طرف بڑھی۔ منہ ہاتھ دھو کر دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھتے ہوئے جب وہ کمرے میں آئی تو اماں ایک بار پھر ہاتھ جوڑے دل کی لکیروں کو ملا رہی تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے مسکراتی تھیں اور پھر ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتی تھیں۔ وہ آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گئی پھر اسے خیال آیا کہ اماں نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا اور کھانے کے بعد اماں کو دوا بھی کھانی ہے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اماں جی کھانا لاؤں، کھائیں گی؟'' اماں نے چونک کر اسے دیکھا اور ہاتھ نیچے کر لیے تھے۔ اب وہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ سیمل اُٹھ کر ان کے قریب آ گئی تھی۔

''تو اتنا روتی کیوں ہے؟'' انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''میں کیوں روتی ہوں اماں جی!'' سیمل کی آنکھیں پھر جل تھل ہونے لگی تھیں۔

''آپ کو نہیں پتا، میں کیوں روتی ہوں۔ اماں مجھے مروان یاد آتا ہے۔ میں اس کے چلے جانے پر روتی ہوں۔ کیا وہ آپ کو یاد نہیں آتا؟ کیا آپ کو پتا نہیں چلتا کہ وہ آٹھ سال سے ہمارے پاس نہیں آیا۔ اس گھر نے اس کے قدموں کی دھمک نہیں سنی، فضاؤں نے اس کی گنگناہٹیں نہیں سنیں۔ اس نے آپ کو نوالے بنا بنا کر نہیں کھلائے۔ اماں یہاں اس کمرے میں بیٹھ کر کسی نے آپ کی گڑیا کو آٹھ سالوں سے کوئی کہانی نہیں سنائی۔ آپ کی آنکھیں بھی تو اسے ہی ڈھونڈتی ہیں، پھر آپ کیوں نہیں روتیں، کیوں نہیں اسے پکارتیں کہ آپ کی پکار سن کر ہی وہ آ جائے''۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں اور سیمل بولے جا رہی تھی۔

''لیکن وہ نہیں آئے گا اماں جی، کبھی نہیں آئے گا۔ ہم اسے اب کبھی نہیں دیکھ سکیں

گے۔ وہ اب کبھی آپ کو اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر نہیں کھلائے گا۔ وہ اب مجھے کہانیاں نہیں سنائے گا۔ اماں ہوم سویٹ ہوم کی نیلی کا بھائی ایک گھر بنانے کی چاہ میں مشقت کرتے کرتے خون تھوکنے لگا اور پھر مر گیا...... اور گڑیا کا بھائی بھی اس کے لیے ایک پُرامن، محبت بھرا گھر تلاشتے تلاشتے مر گیا۔ اماں مروان مر گیا، شہید ہو گیا۔ کارگل کی برف پوش چوٹی کو اس کا خون رنگین بنا گیا''۔ آٹھ سالوں بعد مروان کی موت پر وہ اماں کے گلے لگے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

''ہمارا رومی مر گیا، اماں جی ہمارا رومی مر گیا''۔ اماں نے اسے اپنے کمزور بازوؤں میں دبوچ لیا تھا اور اب اسے اپنے ساتھ بھینچے وہ بھی اسی طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ مروان کی شہادت پر آٹھ سالوں بعد وہ سیمل کو گلے لگائے رو رہی تھیں اور ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔

''میرا بچہ، میرا رومی''۔ اچانک روتے روتے سیمل کو لگا جیسے ان کی گرفت کمزور پڑ گئی ہو۔ ان کے بازو اس کے اطراف میں لٹک گئے تھے۔

''اماں جی''۔ اس نے جلدی سے لٹایا، وہ نڈھال ہو رہی تھیں۔ اپنے دوپٹے کے پلو سے ان کا چہرہ صاف کر کے اس نے جلدی سے انہیں پانی پلایا۔

''یا اللہ، یہ میں نے کیا کیا...... میں نے کیوں...... یا اللہ میری اماں کو کچھ نہ ہو''۔ اس نے سکون والی ٹیبلٹ نکال کر اماں کو دی۔

''کسی بھی قسم کا ہیجان ان کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر کبھی ایسا محسوس ہو تو انہیں فوراً یہ دوا دے دیجئے گا''۔ ایک بار ڈاکٹر عرفان نے کہا تھا۔ دوا کھانے کے کچھ دیر بعد ہی اماں سو گئی تھیں لیکن اسے بالکل نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے وہ آخری رات یاد آ رہی تھی جب کڑکتی سردی میں وہ اور مروان سڑک پر واک کر رہے تھے اور جھاگ اُڑاتی کافی پیتے ہوئے مروان بڑی سنجیدگی سے اسے تک رہا تھا۔ مروان کو سوچتے سوچتے وہ جانے کب سو گئی تھی۔

صبح ابھی وہ ناشتہ کر رہی تھی کہ حمنہ آ گئی اور یہ پچھلے سات سالوں سے حمنہ کا معمول تھا۔ ان بالکل غیر لوگوں نے اسے کتنی اپنائیت دی تھی۔ ''ابو نے سب جگہوں پر کھانا بھجوانے کو کہہ دیا ہے اور بھائی نے مسجد میں دعا اور قرآن خوانی کے لیے کہہ دیا ہے''۔ حمنہ بتا کر خود قرآن لے کر پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔

''اس بار میں نے اِدھر جھگیوں میں بھی ایک دیگ بھجوانے کا کہا تھا''۔

''ہاں میں نے ابو کو بتا دیا تھا''۔ حمنہ قرآن پڑھ رہی تھی، وہ کمرے میں آئی تا کہ اگر اماں جاگ رہی ہوں تو انہیں ناشتہ دے سکے۔ اماں کمرے کے وسط میں کھڑی تھیں اور ان کے

ہاتھ میں مروان کی تصویر تھی۔ اس نے دیکھا اس کی ڈائری زمین پر گری تھی، شاید بیڈ سے اُٹھتے ہوئے گر گئی ہوگی۔ یہ تصویر ہمیشہ اس کی ڈائری میں ہوتی تھی۔ اماں تصویر کو دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''اماں جی......'' وہ ان کے قریب آئی تھی۔

''تو نے کیا کہا تھا ابھی؟'' انہوں نے یسمل کی طرف دیکھا۔

''میں نے تو کچھ نہیں کہا اماں جی''۔

''نہیں تو کہہ رہی تھی کہ رومی...... رومی چلا گیا''۔ وہ بلک بلک کر رونے لگیں''۔ حمنہ ان کے رونے کی آواز سن کر اندر آ گئی تھی۔

''حمنہ...... حمنہ اماں کو آٹھ سال بعد احساس ہوا ہے رومی بھائی...... حمنہ اماں شاید......'' وہ رونے لگی۔ حمنہ نے اسے اماں کے گلے لگے روتے دیکھا۔

''یسمل...... یسی اس وقت اماں کو ڈاکٹر کی سخت ضرورت ہے، میں بھائی سے کہتی ہوں ڈاکٹر عرفان ابھی گھر میں ہی ہوں گے، انہیں بلا لائیں۔ میرا خیال ہے یسمل اماں ٹھیک ہو رہی ہیں۔ اماں پلٹ رہی ہیں واپس......'' ڈاکٹر عرفان نے اماں کو چیک کر کے انجکشن لگایا تھا۔

''انہیں اس حالت میں سکون کی سخت ضرورت ہے، یہ جب جاگیں تو مروان کا ذکر مت کیجئے گا''۔ ساری بات سن کر انہوں نے کہا تھا۔ ''اچانک صورتِ حال بگڑ بھی سکتی ہے''۔ وہ یسمل کو ہدایت دے کر چلے گئے۔ دن میں میراں اماں بھی آئی تھیں اور بہت دیر تک اس کی دل جوئی کرتی رہیں۔ انہیں دیکھ کر اسے حوصلہ ملتا تھا۔

''شیری صبح صبح ہی دفتر چلا گیا تھا۔ جب سے آیا ہے وہاں سے بہت اَپ سیٹ ہے''۔ انہوں نے اسے بتایا تھا۔ وہ فوج سے فارغ ہونے کے بعد فوجی فاؤنڈیشن کے کسی ادارے میں کام کر رہا تھا۔

''کارگل میں اس کی ٹانگ میں بم کے ٹکڑے گھس گئے تھے۔ دو تین بار آپریشن ہوا، ایک بار تو اس کے بابا بہت مایوس نظر آنے لگے تھے، انہوں نے مجھ سے کہا۔ اماں شاید وہ اس کی ٹانگ کاٹ دیں گے لیکن پھر اللہ کا کرم ہوا''۔ اس روز میراں اماں نے اسے بتایا تھا۔

''کارگل کے محاذ پر...... مروان بھی تو وہاں ہی تھا''۔ اس نے سوچا۔ میراں اماں اسے صبر اور حوصلے کی تلقین کر کے چلی گئی تھیں۔ شام کو وہ اُٹھیں تو پُرسکون تھیں۔ انہوں نے مروان کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ان کے لیے چائے کے ساتھ کباب اور کیک لے کر آئی تھی۔ رات سے

انہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ رغبت سے کباب کھاتی رہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے انہوں نے اس طرح رغبت سے کبھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ خود ہی انہیں کھلاتی تھی تو وہ ایک روبوٹ کی طرح کھا لیتی تھیں۔

''اماں اگر آپ کو بھوک لگی ہو تو کھانا لے آؤں''۔ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا، پھر اس نے ان کے کپڑے تبدیل کروائے، ان کی کنگھی کی اور ان کو باہر لے آئی تھی۔ باہر موسم اچھا تھا۔ ہوا میں مٹی کی خوشبو اور نمی تھی، شاید کہیں بارش ہوئی تھی۔ اماں کو تخت پر بٹھا کر وہ خود بھی تخت پر بیٹھ کر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ یونیورسٹی کی، حمنہ کی، میراں اماں کی لیکن آج ان باتوں میں وہ جان بوجھ کر مروان کا ذکر نہیں کر رہی تھی۔ ورنہ اماں کے ساتھ اس کی باتوں میں صرف مروان کا ہی ذکر ہوتا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا، اماں ٹھیک ہو جائیں گی۔ بالکل پہلے جیسی لیکن سب کچھ پہلے جیسا تو نہیں ہوگا۔ مروان نہیں ہوگا۔ اس نے افسردگی سے اماں کی طرف دیکھا جو بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں اور اب اسے چپ دیکھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''کیا دیکھ رہی ہیں اماں؟'' یسمل نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''کچھ نہیں''۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا لیکن وہ کچھ اُلجھی اُلجھی سی نظر آ رہی تھیں اور یہ بھی تو مثبت تبدیلی تھی کہ اماں اس کی بات کا جواب دے رہی تھیں پھر وہ یکا یک اُٹھیں، تخت سے اُتر کر چپل پہنی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ یہ سب جو اماں کر رہی تھیں، پچھلے کئی سالوں کی روٹین سے مختلف تھا۔ وہ ان کے پیچھے ہی کمرے تک گئی تھی، وہ اپنے بیڈ پر لیٹ رہی تھیں۔

''کیوں اماں، آپ تھک گئی ہیں۔ سوئیں گی کیا؟''

''ہاں!'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کروٹ بدل کر رُخ دیوار کی طرف کر لیا۔ اب ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ یسمل کچھ دیر کھڑی ان کی پشت دیکھتی رہی پھر واپس باہر آ گئی۔ باہر شام کی اُداسی پھیل رہی تھی۔ سورج کا سرخ گولا اُفق کے کنارے پر تھا اور بس کوئی دیر میں غروب ہونے والا تھا۔ سارا دن گزر جاتا ہے لیکن شام اتنی اُداس، اتنی افسردہ کیوں ہوتی ہے۔ وہ ایک بار پھر تخت پر بیٹھ گئی تھی۔ شامیں اسے ہی اُداس لگتی ہیں یا پھر ہوتی ہی اُداس ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پرندوں کی قطاریں اپنے گھونسلوں کی طرف جا رہی تھیں۔ صبح ہوتے ہی یہ جانے کہاں کس تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ شاید رزق کی تلاش میں اور پھر شام ہوتے ہی گھروں کی طرف۔ صبح سفر پر جانے والے سارے پ[illegible]دں میں شاید کوئی ایسا بھی ہوتا

ہوگا جو گھر واپس نہ پلٹ پاتا ہو۔ وہ یونہی اوٹ پٹانگ اُلٹی سیدھی باتیں سوچ رہی تھی۔ یک دم اس کی نظر میراں اماں کے گھر کی دیوار پر پڑی تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دیکھوں میراں اماں کیا کر رہی ہیں۔ وہ غیر ارادی طور پر چلتے ہوئے صحن کی دیوار کے پاس آئی اور کرسی پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھا۔ میراں اماں تو کہیں نہیں تھیں، ہاں نوشیرواں دیوار سے ٹیک لگائے تخت پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر یونہی کھڑی نوشیرواں کو دیکھتی رہی۔ برآمدے میں اب ملگجا سا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن نوشیرواں پڑھ رہا تھا اور اسے لگا جیسے وہ بہت اُداس ہو۔ وہ واپس اُترنے لگی تھی جب نوشیرواں کو اس کی جھلک نظر آئی تھی۔

"سیمل......" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا اور وہ اُٹھ کر صحن میں آ گیا تھا، اس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کی ڈائری تھی شاید۔ سیمل نے اسے دیکھا اور سلام کیا۔ وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کہاں تھی آپ؟ نظر ہی نہیں آئیں"۔

"گھر پر ہی تھی"۔

"اماں جان سے کوئی کام تھا کیا؟"

"نہیں تو بس ایسے ہی"۔ وہ گھبرائی۔

"اماں جان صبح آئی تھیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جی، اب کہاں ہیں وہ؟"

"سامنے آمنہ آپا کے گھر گئی ہیں، ان کے بیٹے کو بخار تھا"۔

"اچھا"۔ وہ مڑی۔

"سنیں"۔ اب وہ صحن کی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔

"اماں جی کیسی ہیں؟"

"بہت بہتر"۔ اس کی آنکھیں یک دم چمکنے لگیں اور وہیں کرسی پر کھڑے کھڑے اس نے صبح اور رات کی کیفیت بتا ڈالی۔

"تو مجھے بتاتیں میں ڈاکٹر کی طرف لے جاتا"۔

"جی وہ حمنہ کا بھائی ہے نا، وہ لے آیا تھا ڈاکٹر عرفان کو"۔

"اچھا"۔ نوشیرواں یک دم ہی سنجیدہ ہو گیا اور واپس مڑ گیا...... مسجد میں مغرب کی اذان شروع ہو گئی تھی۔ وہ کرسی سے نیچے اُتری اور حیرت سے سوچا، یہ یک دم نوشیرواں کو کیا ہو گیا

تھا۔ کیا اسے برا لگا کہ حمنہ کا بھائی ڈاکٹر عرفان کو گھر کیوں لایا۔ پہلے بھی تو وہی...... جب نوشیرواں اس گھر میں نہیں تھا تو......اور پھر بھلا اس میں برا ماننے کی کیا بات تھی، ایسے ہی مجھے وہم ہوا۔ اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا، اب بھی پرندوں کی قطاریں نیچی پرواز کرتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہی تھیں۔ اس نے برآمدے میں آ کر بلب جلایا اور وضو کرنے چلی گئی۔

یہ رات بھی پچھلی رات کی طرح بے چین ہی گزری تھی پھر بھی وہ وقت پر اُٹھ گئی تھی۔

آج اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ ایک دو روز میں یونیورسٹی گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے بند ہو رہی تھی اور پھر اگست میں ان کے فائنل پیپرز ہونے تھے۔ 18 جون لاسٹ ورکنگ ڈے تھا۔ حمنہ نے اسے بتایا تھا، پریویس والے فیرویل پارٹی بھی دے رہے تھے۔ پتا نہیں اب یا چھٹیوں کے بعد، یہ آج ہی پتا چلنا تھا۔ فضیلت کو اماں کے متعلق سمجھا کر وہ صرف ایک کپ چائے پی کر گھر سے نکل آئی تھی۔ گلی عبور کر کے اس نے حمنہ کے دروازے پر دستک دی۔ حمنہ تیار ہی تھی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے اسٹاپ کی طرف جا رہی تھیں جب اس نے ایک گلی سے نوشیرواں عادل کو آتے دیکھا۔ ایک پاؤں پر زور دیتا وہ بے حد تھکا تھکا سا چل رہا تھا۔ حمنہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"ابو بہت تعریف کرتے ہیں نوشیرواں کی اور میراں اماں تو خیر ہیں ہی پورے محلے کی جان"۔ سیمل، نوشیرواں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کے پیکٹ تھے۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رُکا تھا۔ حمنہ اور سیمل نے ایک ساتھ سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دے کر سیمل کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے رات بھر جاگتا رہا ہو۔

"اماں جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ رات یک دم تیز بخار ہو گیا تھا۔ رات بھر پٹیاں رکھتا رہا۔ ابھی بخار کم ہے کچھ"۔ سیمل یک دم پریشان نظر آنے لگی تھی۔ نوشیرواں نے اس کی طرف دیکھا۔

"پریشانی والی کوئی بات نہیں، ابھی کلینک کھلتا ہے تو ڈاکٹر سے میڈیسن لے لوں گا"۔

وہ اسے تسلی دیتا ہوا چلا گیا تو حمنہ نے رائے ظاہر کی۔

"اب میراں اماں کو اپنے نواسے کی شادی کر دینی چاہیے"۔ سیمل خاموش رہی، وہ میراں اماں کے لیے سچ مچ پریشان تھی۔ یونیورسٹی سے آ کر وہ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر میراں اماں کی طرف گئی۔ وہ سو رہی تھیں اور نوشیرواں ان کے پاس ہی کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی براؤن ڈائری تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب اماں جان کی؟" وہ دروازے پر کھڑی پوچھ رہی تھی۔

نوشیرواں چونک کر یک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ حسب معمول دیوار پھلانگ کر آئی تھی۔

"اب بہتر ہیں"۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا؟" اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کچھ نہیں، موسمی بخار ہے"۔ وہ بہت گہری نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "آجائیں، پلیز وہاں ہی کیوں کھڑی ہیں"۔

"نہیں، چلتی ہوں اماں جان تو سو رہی ہیں، شام کو آجاؤں گی"۔ وہ مڑی اور ابھی وہ برآمدے میں ہی تھی کہ وہ بھی باہر آ گیا، ہاتھ میں وہی ڈائری تھی۔

"سیمل"۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ سیمل نے مڑ کر دیکھا، وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھیں نا پلیز، کچھ دیر تو...... آپ سے کچھ باتیں کرنا تھیں"۔ سیمل نے صحن میں پھیلی دھوپ کو دیکھا۔ پانچ بج رہے تھے لیکن باہر تپش تھی اور دھوپ آنکھوں میں چبھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ سیمل مسکرائی اور تخت پر بیٹھنے لگی تھی کہ بے اختیار نوشیرواں نے کہا۔

"یہاں بہت تپش ہے، اندر آجائیں پلیز۔ میرے روم میں"۔ سیمل بنا کچھ کہے، ہولے ہولے قدم اُٹھاتی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا تھا اور دروازہ کھول دیا۔ سیمل نے دیکھا، اس کے بیڈ پر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کمپیوٹر ٹیبل پر کچھ سی ڈیز پڑی تھیں۔ سیمل نے بیڈ پر سے کتابیں ایک طرف کیں اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ ذرا سا شرمندہ ہوا۔

"دراصل میں کل سے اپنے کمرے میں نہیں آیا"۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اماں جی کیسی ہیں اب؟"

"بہت بہتر ہیں، ابھی سو رہی تھیں، فضیلت ہے ان کے پاس"۔

"سیمل مجھے آپ سے مروان کے متعلق بات کرنا تھی"۔

"جی......!" سیمل چونکی۔

"مجھے کل ہی اماں جان نے بتایا کہ مروان......" سیمل نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

"مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ آپ کیپٹن مروان خان کی سسٹر ہیں۔ میں سمجھتا تھا شاید مروان کہیں کینیڈا یا امریکہ گیا ہوا ہے۔ وہ تو اماں جان نے بتایا کہ مروان کارگل میں سولہ جون

کو...... سیمل، میرا اور مروان کا تقریباً چھ سات ماہ ساتھ رہا، اسکردو میں سیاہ چن پر اور پھر کارگل میں...... جس صبح وہ شہید ہوا، اس رات بھی کارگل کے محاذ پر ہم اکٹھے تھے۔ مجھے زخمی ہو کر نیچے آنا پڑا اور وہ...... وہ بہت پیارا شخص تھا اور آپ کے متعلق بہت باتیں کرتا تھا۔ جب بھی ہم فارغ بیٹھتے، وہ آپ کا ذکر کرتا...... آپ کا شوق، آپ کی دلچسپیاں، آپ کی باتیں کرتے کرتے وہ تھکتا ہی نہیں تھا"۔ سیمل کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تب ہی یہ شخص اپنا اپنا لگتا تھا کہ یہ مروان کا دوست تھا۔ اس کا جی چاہا، وہ اس سے مروان کے ایک ایک لمحے کی تفصیل پوچھے جو لمحے اس نے نوشیرواں کے ساتھ گزارے تھے لیکن وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تو نوشیرواں نے مضطرب ہو کر کہا۔

"پلیز سیمل روئیں نہیں۔ مروان کو اللہ نے بہت بڑا اعزاز عطا کیا۔ شہادت کا اعزاز"۔

پتا نہیں اب یہ اعزاز بڑا تھا یا اس کا دُکھ بڑا تھا۔ مروان کے بچھڑ جانے کا دُکھ، اسے پھر کبھی نہ دیکھ سکنے کا دُکھ۔ ان آٹھ سالوں میں ایک بار بھی اس نے اس کی شہادت پر فخر نہیں کیا تھا۔ ہاں صرف دُکھ تھا اندر باہر ہر جگہ دُکھ...... وہ تو بہت معمولی، بہت عام سی لڑکی تھی وہ اپنے بھائی کے بچھڑ جانے پر روتی تھی۔ وہ بھائی جو ہمیشہ اس کا سائبان بنا رہا تھا جس نے ہمیشہ اس کے آنسو پونچھے، اس کے درد دور کیے، جو صرف اس کی خاطر گھر چھوڑ آیا کہ وہ ڈسٹرب نہ ہو، وہ جنوری میں آخری بار ملنے آیا تھا پھر...... جنوری سے جون تک کے ہر دن، ہر لمحے کی باتیں وہ جاننا چاہتی تھی، پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ کیسا تھا، ان پانچ ماہ میں اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی تھی۔ وہ کمزور ہو گیا ہوگا، اتنی سردی میں جب وہاں برف پڑتی تھی اور...... وہ یہ سب پوچھنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اندر ہی کہیں گم ہو گئے تھے۔

"سیم پلیز......" نوشیرواں نے پھر التجا کی تو اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھ کر حسب معمول دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"ہم میں سے وہاں سب ہی شہادت کے تمنائی تھے لیکن قدرت جسے منتخب کر لے"۔

"کاش ان میں سے کسی کو یہ اعزاز مل جاتا جو اس کا تمنائی تھا اور مروان کو کچھ نہ ہوتا"۔ اس نے دل گرفتگی سے سوچا تھا۔

"اور کیا ضروری تھا یہ جنگ لڑی جاتی۔ لاحاصل، رائیگاں"۔ اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ نوشیرواں کا رنگ لمحہ بھر کو تبدیل ہوا اور اس نے بے حد سنجیدگی سے سیمل کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا۔ اس کی بے حد خوب صورت ناک سرخ ہو رہی تھی اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"بہت سارے لوگ نہیں جانتے سیمل لیکن......"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ رول کیا ہوا نقشہ ٹیبل پر پھیلایا، یہ وہی کارگل کا نقشہ تھا۔ ''یہ دیکھ رہی ہو؟'' اس نے اشارے سے سیمل کو قریب بلایا۔ ''یہ کارگل کی پہاڑیاں......'' سیمل اس کے قریب کھڑی خاموشی سے نقشے کو دیکھ رہی تھی۔

''پاکستان کے نقطۂ نظر سے اس علاقے کی اہمیت ایک اور وجہ سے بھی ہے کہ دریائے سندھ کا آغاز کارگل کے آس پاس کی پہاڑیوں سے ہی ہوتا ہے۔ آپ جانتی ہو کارگل کی جنگ کیوں ہوئی؟'' اس کے بعد اس نے اپنا رُخ موڑ کر سیمل کی طرف دیکھا تو سیمل نے نفی میں سر ہلایا۔

''کارگل کا منصوبہ زبردست دفاعی اہمیت کا حامل تھا۔ ہم نے یہاں بہت قیمتی جانیں قربان کیں سیمل......ایک مقصد تھا کہ کشمیر کا ذکر عالمی سطح پر واضح کیا جائے لیکن......شاید ہم......''

وہ جیسے کسی گہرے دُکھ میں ڈوب گیا اور رُخ موڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیمل ابھی تک ٹیبل کے پاس کھڑی نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اب بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ کارگل کی جنگ کیوں ہوئی تھی۔

''تم بیٹھو سیمل، میں آتا ہوں''۔ پھر وہ یک دم اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ سیمل وہیں کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ٹیبل پر وہ براؤن ڈائری اُلٹی پڑی تھی۔ اس نے یونہی بے خیالی میں اسے اُٹھالیا اور پھر وہ چونک گئی۔

☆☆☆

کھلے صفحے پر محسن نقوی کی نظم تھی۔ وہی نظم جو نوشیرواں کو پسند تھی۔

''کوئی شہر ایسا بساؤں میں
میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں
جہاں سچ کو سچ سے ہو واسطہ
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں چاند ماند نہ ہو کبھی
جہاں خوشبوؤں کو بدلتی رت سے مسئلہ نہ ہو
جہاں خواب آنکھوں میں جگمگائیں تو
جسم و جان کے کبھی دریچوں میں تیرگی کا گزر نہ ہو
کوئی رات ایسی بسر نہ ہو
کہ بشر کو اپنی خبر نہ ہو

جہاں داغ داغ سحر نہ ہو
جہاں کشتیاں ہوں رواں دواں
تو سمندروں میں بند نہ ہو
جہاں برگ و بار سے اجنبی کوئی شاخ کوئی شجر نہ ہو
میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی ایسا شہر بساؤں میں

ڈائری اس کے سامنے کھلی پڑی تھی اور اسے مروان یاد آ رہا تھا۔ مروان کو یہ نظم کتنی پسند تھی۔ وہ اکثر اسے سناتا تھا اور کہتا تھا ''کیا ایسا ممکن ہے گڑیا کہ کوئی ایسا شہر ہو جہاں کوئی غم کوئی دکھ نہ ہو۔

جہاں سب خوش اور مطمئن ہوں۔ نوشیرواں جوس کا گلاس لیے اندر آیا اور گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ یہ گل کی ڈائری ہے مجھے عالم نے دی تھی۔ ''سیمل ہمارا گل اندر سے ایک نازک دل شاعر تھا''

وہ اپنا گلاس اٹھا کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس میں اس کی اپنی شاعری بھی ہے اور دوسروں کی بھی'' ''مروان کو بھی یہ نظم بہت پسند تھی'' اتنی دیر میں پہلی بار سیمل نے کچھ کہا تھا۔

''اور اسے بھی عالم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈرونز حملوں سے ملک میں آئے دن ہونے والی دہشت گردی سے بے گناہ لوگوں کے مرنے سے کرپشن سے ہر چیز سے نالاں تھا وہ کہتا تھا اگر اس کے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہوتی تو اسے گھما کر سب کچھ ٹھیک کر دیتا۔

یہ وہ آخری نظم ہے جو اس نے اپنی ڈائری میں نوٹ کی ہے اس کے بعد صفحے خالی ہیں۔ بتائیں کہاں چلا گیا وہ......اور کون سا شہر بسانے نوشیرواں نے سر جھکا لیا تھا اور ہاتھ میں پکڑا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ سیمل تم گل کے لیے بھی دعا کیا کرو۔ بس وہ مل جائے کہیں سے ایک بار آ جائے تو پھر میں اسے اس طرح چھپا کر رکھوں کہ کوئی اسے کچھ نہ کہہ سکے۔ اسے کچھ ہو گیا سیم تو میرے نانا کی نسل ختم ہو جائے گی۔ سیمل کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھ وہ یونہی ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی رہی تھی۔ ارے تمہارا جوس گرم ہو جائے گا پی لو نا۔ اس نے کہا تو سیمل نے چونک کر جوس کا گلاس اٹھا لیا اگرچہ اس کا پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جوس پی کر وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ بہت دیر ہو گئی ہے فضیلت نے گھر جانا ہو گا۔ کچھ دیر تو رکو...... میں تمہیں وہ جگہ دکھانا چاہ رہا تھا جہاں ہم میں اور مروان۔ اور بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر نقشے کے پاس کھڑا تھا۔ نقشہ اس طرح

ٹیبل پر پھیلا ہوا تھا۔ سیمل بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ ''یہ کارگل
کی پہاڑیاں ہیں'' اس نے سٹک سے اشارہ کر کے بتایا۔ لداخ اور سیاچن کے محاذ پر تمام سپلائی
انہیں پہاڑی سلسلوں سے گزر کر جاتی ہے اور کارگل کو ان پہاڑیوں کے درمیان جو سڑک گزرتی
ہے اسے لیہ روڈ کہتے ہیں۔ یہ سڑک سری نگر کو کارگل، دراس، بٹالک، لیہ، لداخ اور سیاچن کو باہم
ملاتی ہے۔ اگر کارگل کی بلند چوٹیوں پر قبضہ کر لیا جاتا تو بھارت کی سپلائی لائن کو باآسانی کاٹا
جا سکتا تھا اور کارگل سے آگے جتنے بھی علاقے بھارتی قبضے میں تھے ان کا زمینی رابطہ بھارت سے
کٹ جاتا۔

سیمل اس کے قریب کھڑی خاموشی سے نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا
کہ کارگل کا منصوبہ زبردست دفاعی اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن بھارتی فوج کی شدید گولہ باری کے
باعث ہم لوگ دراس پل تک بھی نہیں پہنچ سکے تھے......اور ادھر تولانگ کی چوٹیاں مجاہدین کے
قبضے سے نکل گئیں۔

''اس نے نقشے میں لداخ کو دیکھا'' یہ لداخ ہے اس کا بڑا حصہ بنجر پہاڑوں اور ننگی
چٹانوں پر مشتمل ہے لیکن عسکری اعتبار سے یہ بہت اہم علاقہ ہے جانتی ہو دنیا کا بلند ترین محاذ
جنگ اسی علاقے کے شمال میں واقع ہے۔

سیمل نے سر ہلایا۔ مروان نے بتایا تھا مجھے۔

''سیمل ایسا ہر گز نہیں ہے جیسا لوگ سمجھتے اور کہتے ہیں۔ یکا یک وہ بے حد تھکا ہوا سا
نظر آنے لگا تھا۔

کارگل کی پہاڑیوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا تحریک آزادی
کشمیر روز بروز کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ کشمیر کی وادی میں بھارتی فوج اور اس کے غدار ساتھی
کشمیریوں کی کشمیر پر گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ خدشہ تھا کہ اگر یہی صورتحال رہی تو پھر تحریک
آزادی کشمیر دم توڑ دے گی۔ علاوہ ازیں ''اعلان لاہور'' کے بعد پاکستان اور بھارت کے روابط کا
بڑھنا ناگزیر تھا اور اس سے تحریک آزادی کشمیر کو ناکافی نقصان پہنچا اس لیے کارگل اپریشن
پاکستان کی مجبوری تھا۔ اور ہمیں یقین تھا کہ سری نگر لیہ سڑک کو مئی سے اگست تک بند کر کے
بھارت کی سیاچن میں موجود فوج کو آزمائش سے دوچار کر دیں گے۔ ادھر مجاہدین نے جن پہاڑی
چوٹیوں پر قبضہ کیا وہ دراس کارگل، بٹالک کے اردگرد واقع ہیں۔ یوں سری نگر، کارگل روڈ بند ہونے
کی وجہ سے بھارت کے لیے سیاچن اور لداخ کا دفاع خطرے میں پڑ گیا تھا۔

وہ تفصیل بتا رہا تھا۔ سیمل بہت دھیان سے سن رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے نوشیرواں
خاموش ہوا تو سیمل نے پوچھا۔ اس سب کے باوجود ایسا کیا تھا کہ ہاں اس سب کے باوجود ہم
اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

نوشیرواں نے گہری سانس لی۔

بھارت کی بے بسی امریکہ سے برداشت نہ ہو سکی امریکہ کی دلداری، ہماری ناکام
سفارت کاری، مالیاتی اداروں کا دباؤ ان سب کا نتیجہ اعلان واشنگٹن کی صورت میں نکلا جس پر
پوری قوم کو دکھ ہوا تاہم ہماری فوج اور مجاہدین کی جرات اور قربانی بے مثل ہے۔ خود بھارتی فوج
کے افسروں نے ان سب کا اعتراف کیا کہ مجاہدین جذبے سے سرشار ہیں اور ان کے پاس کوئی
آپشن نہیں ہے فتح یا موت......کیپٹن کرنل شیر خان اور حوالدار لالک جان کی جرأت اور بہادری
بے مثل ہے اور مروان یقین کرو سیمل جب وہ میس میں ہوتا تھا تو ایک بالکل مختلف شخص اپنی فیملی
کے لیے فکر مند اور محبت کرنے والا لیکن محاذ پر اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا سوائے اپنے ٹارگٹ کے وہ
اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھا۔

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم

میں جانتا ہوں سیمل تم مروان سے بہت اٹیچڈ تھیں۔ تم نے اس کی شہادت کو ذہنی
طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ مروان کی موت کا دکھ اس کے بچھڑ جانے کا غم ہمیشہ تمہارے دل میں زندہ
رہے گا سیمل۔ لیکن اس کی شہادت کا فخر بھی ایک تمغے کی طرح ہمیشہ تمہارے دل میں سجا رہیگا۔

شہادت ہر ایک کا نصیب نہیں ہوتی۔ مروان خوش نصیب تھا۔ سیمل نے صرف سر ہلایا
تھا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں تھیں۔ بھیگی پلکوں کے ساتھ وہ بنا کچھ کہے باہر نکل آئی۔ نوشیرواں
بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکلا تھا۔

دھوپ صحن سے رخصت ہو کر اب دیواروں سے لپٹی کھڑی تھی۔ برآمدے میں ایک لمحہ
رک کر اس نے نوشیرواں کی طرف دیکھا۔

''اب چلتی ہوں''

نوشیرواں نے سر ہلا دیا اور وہ صحن کی طرف بڑھ گئی۔ نوشیرواں وہاں ہی برآمدے میں
کھڑا اسے سیڑھی پر چڑھتے اور پھر دیوار پر پاؤں رکھ کر اترتے دیکھتا رہا اور دل نے بڑی شدت
سے خواہش کی کہ کیا ہی اچھا ہوا گر سیمل اس کی زندگی میں شامل ہو جائے۔ تو اس کی ہمراہی میں

دکھوں کا بوجھ اٹھانا سہل ہو جائیگا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی کتنی خاموشی اور ویرانی تھی۔
ایک لمحہ کے لیے اس کے ذہن میں وہ گھر آیا تھا جہاں چھٹی پر جب وہ جاتا تو ایک دم بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ بہنیں، کزنیں، چھوٹے بھائی، چچازاد، ماموں زاد سب اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے...... اور یہ صرف اس کی آمد پر ہی نہیں ہوتا تھا۔ جو بھی چھٹی پر گھر آتا۔ اس حویلی نما گھر میں رونقیں اتر آتی تھیں۔

وہ گھر جو اب ملبے کا ڈھیر بنا اپنے مکینوں کو روتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی تو وہ وہاں سے ہی تخت پر بیٹھ گیا۔ کاش میں کوئی ایسا شہر بسا سکتا گل جہاں ہم زندگی بغیر کسی خوف اور ڈر کے گزار سکتے۔

میں تم میراں اماں اور......اور یسمل

میراں اماں کمرے سے باہر آئیں تو وہ تخت پر ہاتھوں کا تکیہ بنائے لیٹا ہوا تھا۔

"ارے بچہ یہاں کیوں لیٹے ہو اتنی تپش میں"

انھوں نے گھبرا کر اسکی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

یونہی اماں جان آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ اس نے ان کی کلائی تھام کر ان کی نبض دیکھی "بخار تو نہیں ہے اب"

"ہاں اس وقت طبیعت کچھ ٹھیک لگ رہی ہے"

وہ تخت پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ دھوپ اب دیواروں پر سے بھی غائب ہو گئی تھی۔ سورج غروب ہونے کی تیاریوں میں تھا لیکن فضا میں تپش اور حبس تھی۔ ہوا کا نام ونشان تک نہ تھا۔ نوشیرواں نے اٹھ کر برآمدے کا پنکھا آن کیا۔

"شیری بچہ"

جی اماں جان

"شادی کر لے بچہ۔ اپنا گھر ہوگا بچے ہوں گے تو جینے کو جی چاہے گا۔ زندگی کا ایک مقصد مل جائے گا۔ میں نہ رہی تو بالکل اکیلا ہو جائے گا۔

"اللہ آپ کو بہت لمبی زندگی دے اماں جان"

جو جوان تھے جو بچے تھے جنہیں بہت زیادہ جینا تھا۔ جن کے ہاتھوں، جن کے کندھوں پر سوار ہو کر ہم نے اپنے آخری سفر پر جانا تھا وہ چلے گئے تو ہم کب تک رہیں گے۔ دل تیرے لیے بڑا دکھا ہوتا ہے شیری بچہ۔ تجھے ہنستا بستا دیکھ لوں کل سے بس یہی خواہش ہے جو بار

بار چٹکیاں لیتی ہے دل میں۔ میری بات مان لے شیری۔

کوئی لڑکی ڈھونڈ رکھی ہے آپ نے وہ مسکرایا۔

تو ماں لے تو پھر لڑکی بھی ڈھونڈ لونگی۔ وہ دلدار کا چاچا ہے نا ادھر وادی شوال میں رہتا ہے چھ ماہ پہلے جب آیا تھا نا تو بتا رہا تھا باپ کے کسی دوست کے متعلق جو آرمی سے ریٹائر ہو کر اپنے علاقے میں چلے گئے ہیں کرنل تھے۔ دلدار کی چاچی بتا رہی تھی۔ بڑی پیاری سی بیٹی ہے ان کی تعلیم یافتہ سلجھی ہوئی تو اگر کہے تو دلدار کی چاچی کو بلوا بھیجوں اور کسی روز دیکھ آؤں جا کر بچی کو۔

نوشیرواں یکدم چپ ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار کی طرف اٹھی تھیں اور میراں اماں جیسے اس کے دل کی بات جان گئی تھیں۔

"یسمل مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ کئی دفعہ میں نے بھی سوچا کہ اسے تمہارے لیے مانگ لوں لیکن کس سے نہ یسمل کا باپ نہ بھائی اور ماں کی نہ حالت۔ یسمل سے بھی تو بات کی جا سکتی ہے نا۔ اس نے آہستگی سے کہا تھا لیکن اماں کہہ رہی تھیں اور اگر وہ ہوتے تو بھی تو شاید ہم اجنبی لوگوں کو وہ رشتہ نہ دیتے۔ یہاں تو برادری کے باہر رشتہ نہیں دیتے لوگ اور ہم تو ہیں ہی دوسرے علاقے کے، ہمارے خاندان کے مردوں نے بھی تو پنجاب میں شادیاں کی تھیں۔ ہاں لیکن تب اور بات تھی۔ آرمی میں اکٹھے رہے۔ آرمی میں ہی شادیاں ہو گئیں۔ وہ چپ ہو گئی تھیں لیکن ان کے چہرے اور آنکھ سے ملال جھلک رہا تھا جیسے یسمل کو نوشیرواں کیلئے نہ مانگنے کا دکھ ہو۔ نوشیرواں یکدم کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنا اماں جان جب تک گل نہیں مل جاتا۔

"گل کب ملے گا۔ تو جانتا ہے شیری...... پتا نہیں ملے گا بھی یا نہیں...... اس آس میں بوڑھا ہو جائے گا۔"

نوشیرواں نے جواب نہیں دیا تھا۔ مغرب کی اذان شروع ہو گئی تھی۔ آپ نماز پڑھ لیں تو میں آپ کے لیے چائے بنا لیتا ہوں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میراں اماں وہیں تخت پر بیٹھے اسے جاتے دیکھ رہی تھیں۔ کیا وہ نہیں جانتی تھیں کہ یسمل کے ذکر پر کیسے نوشیرواں کی آنکھیں جگمگا اٹھتی ہیں۔ "ماں سے بھی کبھی اولاد کے دل کا حال چھپا ہے بچہ" انھوں نے آہستگی سے کہا اور سوچا۔

اس سے پہلے کہ چنگاری شعلہ بنے انھوں نے نوشیرواں کو زنجیر کرنے کا سوچا تھا۔

پہلے تھوڑے زخم لگے ہیں دل پر جو......

لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ چنگاری تو کب کی شعلہ بن چکی تھی۔ اور یہ بات خود

نوشیرواں کو بھی ابھی ابھی معلوم ہوئی تھی کہ یسل اس کے لیے کتنی اہم ہو چکی ہے اور یہ کہ وہ یسل سے محبت کرنے لگا ہے اور اس نے یسل کے علاوہ کسی اور کو زندگی میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں منافقت بھری زندگی نہیں گزار سکتا"

وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

یسل کو دل میں بسا کر کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنا اس کو دھوکا دینا ہے اور نوشیرواں عادل نے زندگی میں کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔

جائے نماز بچھاتے ہوئے اس نے سوچا اور اس روز جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی دعاؤں میں ایک اور دعا کا اضافہ ہو چکا تھا۔ عمر بھر کے لیے یسل کی رفاقت اور ساتھ کی دعا۔ اور ادھر یسل نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دعا مانگتے ہوئے جھجک گئی۔ کتنے سالوں سے وہ ایک ہی دعا مانگے جا رہی تھی اماں کی صحت اور مروان کی واپسی کی دعا کیا آخرت کے مسافر بھی کبھی پلٹ کر آ سکتے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ نہیں لیکن پھر بھی وہ یہ دعا مانگ کر اتنے سالوں سے خود کو کیوں دھوکا دے رہی تھی وہ شرمندہ سی ہاتھ بلند کئے بیٹھی تھی۔ تب بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"اے اللہ مروان کو مغفرت عطا فرما" اس کے درجات کو بلند کر۔ اور اس کی شہادت کو قبول فرما۔ وہ دعا مانگ رہی تھی اور اسے آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گر رہے تھے۔

"یا اللہ ابا کا دل موم کر دے۔ ان کے دل سے اماں کے لیے نفرت ختم کر دے۔ یا اللہ ابا کا دل موم کر دے۔ یا اللہ انہیں میرے حق میں اور اماں کے حق میں ایسا ہی کر دے جیسا باپ اور شوہر ہونے کا حق ہے۔ آج پہلی بار وہ ابا کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ دعا مانگ کر اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور جائے نماز تہہ کر کے رکھی اور اماں کی طرف دیکھا جو ایک رسالہ کھولے بیٹھی تھیں۔ جب وہ میراں اماں کے گھر آئی تھی تب بھی ان کے ہاتھ میں رسالہ تھا شاید انھوں نے اس کے بیڈ سے اٹھایا تھا اور اس وقت بھی انھوں نے وہی رسالہ اٹھایا ہوا تھا۔

"اماں جی مغرب کا وقت ہے۔"

اس نے انھیں متوجہ کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے فوراً رسالہ بند کر کے رکھ دیا تو وہ مسکرا دی۔

اماں جی باہر چلیں اندر گھٹن اور حبس ہو رہی ہے میں چائے بناتی ہوں آپ باہر صحن میں بیٹھنا فضیلت نے جانے سے پہلے چھڑکاؤ کیا تھا۔

اماں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہیں برآمدے میں بچھے تخت پر بٹھا کر اس نے موتیے کی چند ادھ کھلی کلیاں توڑ کر دیں تو وہ بالکل پہلے کی طرح انہیں کان میں ڈالنے لگیں۔ وہ چائے بنا کر لائی تو وہ کانوں میں موتیے کے پھول ڈالے بیٹھی تھیں اس نے تخت کے سامنے چھوٹی ٹیبل رکھ کر چائے کا سامان اس پر رکھا اور پھر برآمدے کی لائیٹ جلائی اور پھر چائے پیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح ان سے باتیں کرنے لگی میراں اماں کی۔

نوشیرواں کی حمنہ کی اور یونیورسٹی کی۔

آج چائے پیتے ہوئے اماں نے بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سنیں اور جب وہ چائے کے برتن رکھ کر واپس آئی تو وہ کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

باہر مچھر آ گئے ہیں۔

انھوں نے مڑ کر اسے بتایا تھا۔

ٹھیک ہے اماں آپ جائیں۔ میں کھچڑی پکانے لگی ہوں۔ صبح فضیلت کریلے گوشت پکا گئی تھی لیکن میرا جی نہیں چاہ رہا اس وقت کھانے کو۔ آپ بھی کھائیں گی نا کھچڑی۔

"ہاں کھا لوں گی۔"

انھوں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

"اماں ٹھیک ہو رہی ہیں۔ ان کے رویے میں تبدیلی آ رہی ہے۔ اس طرح کا Responce انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں ایک بار بھی نہیں۔ ڈاکٹر جو بھی ہیں لیکن ایک اور ہستی بھی تو ہے۔ سب سے ماورا سب سے بلند چاہے تو مردے کو زندہ کر دے چاہے تو آسمان الٹ دے زمین پلٹ دے۔ کیا وہ ہستی اماں کو صحیح نہیں کر سکتی۔

کیا میرا رب کریم میری دعاؤں کو قبولیت نہیں بخش سکتا کیا اماں بالکل پہلے جیسی نہیں ہو سکتیں۔

اور اس رب کریم نے شاید اس کی دعا سن لی تھی۔ کھچڑی پکاتے ہوئے اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ رات وہ بہت دیر سے سوئی تھی کیونکہ یونیورسٹی تو بند ہو چکی تھیں اور یونیورسٹی جانا نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی آنکھ فجر کے وقت کھل گئی تھی۔ اس نے دیکھا تھا اماں جائے نماز پر بیٹھی تھیں اور ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے وہ بڑی خوشی سے آنکھیں نیم وا کیے انہیں دیکھتی رہی جب وہ جائے نماز تہہ کر رہی تھیں وہ اٹھ بیٹھ گئی۔

وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں جب اماں جائے نماز اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں

رکھ کراس کی طرف مڑیں۔اور انھوں نے بہت پہلے کی طرح اس کے قریب آکر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر پھونک ماری تھی اور پھر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔اس نے بے اختیار ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیے اور پھر انہیں آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

یا اللہ تیرا شکر ہے۔لاکھ لاکھ شکر ہے تو اپنے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے۔وہ نم آنکھوں کے ساتھ واش روم چلی گئی۔

وہ یقیناً اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے۔

جب وہ صدق دل سے اسے پکاریں۔

اس نے مشیت ایزدی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔اس نے تسلیم کرلیا تھا کہ مروان اب نہیں رہا وہ جو دنیا میں آتا ہے اسے ایک روز جانا بھی ہوتا ہے اور اللہ نے مروان کو شہادت کی موت سے سرفراز کیا تھا۔

اس نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا تو اللہ نے بھی اس کے لیے در قبولیت کھول دیا تھا۔

لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کل جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے تو وہ کوئی لمحہ قبولیت تھا اور اس کی دعائیں مستجاب ہوگئی تھیں۔وہ نہیں جانتی تھی پھر بھی وہ سرشاری ناشتہ بناتی رہی اور جب اماں باہر تخت پر بیٹھی ناشتہ کررہی تھیں تو وہ بار بار کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں لیکن جب وہ نگاہ اٹھا کر یسمل کی طرف دیکھتیں تو ان کی نگاہوں میں وہ خالی پن نہیں ہوتا تھا۔

آج فضیلت نے دیر سے آنا تھا۔لیکن چونکہ وہ گھر پر ہی تھی اس لیے اسے کوئی فکر نہ تھی

آج موسم اچھا تھا۔آسمان پر بادل تھے اور فضا میں مٹی کی باس تھی جیسے رات کہیں بارش ہوئی ہو۔

دھوپ ابھی صحن میں نہیں آئی تھی۔وہ ناشتے کے خالی برتن سنک میں رکھ کر اپنی کتابیں اٹھا کر باہر ہی آگئی۔کتابوں کا ڈھیر اس نے تخت پر رکھا تھا اور خود کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگی تھی۔

"اماں جی میں ماسٹر کر کے پھر پبلک سروس کمیشن کی تیاری کروں گی اور جاب کروں گی۔"

ضروری پوائنٹس کو مارک کرتے ہوئے اس نے اماں سے کہا تھا۔اماں اس کی کوئی کتاب کھولے یوں ہی اس کی ورق گردانی کررہی تھیں۔پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی وہ اپنے نوٹس بنانے میں مگن تھی کہ اماں نے اسے ہلایا۔

گڑیا

اس نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔

کتاب اب بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔

جی اماں جی

بیٹا وہ رومی

وہ ابھی ابھی سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

رومی کہاں ہے وہ اتنے دنوں سے گھر کیوں نہیں آیا۔

"اماں جی"

اس کی آواز اس کے حلق میں ہی پھنس گئی تھی۔

اماں جی وہ رومی

اس نے بتانے کی کوشش کی تب ہی دروازے کی بیل بج اٹھی

مسلسل جیسے کوئی بیل پر ہاتھ رکھ کر اٹھانا ہی بھول گیا ہو۔اوہ یہ فضیلت بھی بس۔

اس نے اماں کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔برآمدے سے اتر کر صحن میں آئی اور دروازہ کھولا۔تم بھی نا فضیلت دروازے پر۔

اور پھر لفظ اس کے ہونٹوں میں ہی رہ گئے تھے۔وہ ایک دم پلٹ کر بھاگ اٹھی۔

"سنو......سنو گڑیا"

حبیب خان نے اندر قدم رکھا تھا اور اسے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے آرہے تھے۔

"نہیں"

اس نے مڑ کر انہیں دیکھا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

اماں......ابا۔

اماں یکدم کھڑی ہوگئی تھیں اور انھوں نے اسے اپنے پیچھے چھپا لیا تھا اور وہ ان کے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"گڑیا بیٹا ڈرو نہیں۔کیوں ڈر رہی ہو مجھ سے"

وہ صحن عبور کر کے برآمدے میں قدم رکھ چکے تھے اور اماں حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔اپنے دونوں بازو پیچھے کیئے وہ یسمل کے گرد حمائل کیئے ہوئے تھیں اور یسمل ان کی پشت سے چپکی ہوئی تھی۔

یا اللہ میراں اماں اوپر سے جھانک لیں اور نوشیرواں آکر اسے ابا سے بچالے۔آج اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ مروان کہیں سے آکر اسے ابا سے بچالے۔آج اس نے نوشیرواں کو سوچا تھا۔وہ خود ہی حیران ہوئی تھی۔

"کہاں چھپ گئے تھے آپ لوگ میں آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔ کہاں کہاں نہیں میں نے آپ کو تلاشا"

ان کی آواز میں لرزش تھی۔

جب ان وکیل صاحب کا خیال آیا جو آپ کے معاملات کی نگرانی کرتے تھے تو وہ ملک سے باہر جا چکے تھے۔ کتنے چکر لگائے ان کے دفتر کے۔ پھر ایک بار گیا تو دفتر کو تالا لگا ہوا تھا۔ پتا چلا اسلام آباد شفٹ ہو گئے ہیں۔ کہاں۔ کس جگہ۔ فون نمبر کچھ نہ معلوم ہو سکا۔

گڑیا نے اماں کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا اسے لگا تھا جیسے وہ رو رہے ہیں۔ لیکن وہ تو اسے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سر فوراً پیچھے کر لیا۔ کتنا تڑپا ہوں میں تمہارے لیے دو بار تم نظر آئیں اور غائب ہو گئیں میں ہفتوں ان جگہوں پر جاتا رہا۔ گاڑی پارک کر کے گلیوں میں چکراتا پھرتا کہ شاید تم نظر آ جاؤ۔

یہ وہ ابا تو نہ تھے۔ جنہیں سیمل جانتی تھی اتنی نرمی سے اتنی حلیمی سے بات کرنے والے۔ ابا کی آواز کی گرج سے تو جیسے گھر ہل جاتا تھا۔ اس لگتا تھا لیکن آج۔

اماں ابھی تک حیران کھڑی تھیں اور ان کے بازو سیمل کے گرد سے ہٹ کر ان کے پہلوؤں میں آ گرے تھے۔

"مینا...... مینا مجھے معاف کردو"

ان کی آواز بھر گئی تھی۔

سیمل اب اماں کے پیچھے سے ہٹ کر ان کے قریب کھڑی حیرت سے ابا کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انھوں نے اماں کو ان کے نام سے بلایا تھا۔

وہ پہلی بار ان کے لبوں سے اماں کا نام سن رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ابا کی آواز گونج رہی تھی۔

احمق عورت، جاہل عورت، یہ عورت اور مروان ان کے اس طرز تخاطب سے کتنا چڑتا تھا۔

اگر وہ ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔ کتنی حسرت تھی اسے کہ ابا بھی احترام سے عزت سے اماں کا نام لیں۔

چلیں عزت و احترام سے نہ سہی یوں ہی بس نام لے کر بلا لیں۔

کاش...... اے کاش روحی ہوتا اس وقت اپنی پلکوں کو جھپک کر اس نے ابا کو دیکھا۔

میں نے تمہیں بہت ستایا۔ مینا...... بہت گنہگار ہوں تمہارا...... اور ان شریف اور نیک لوگوں کا

جنہوں نے مجھے...... مجھ گندی نالی کے بے نام ونشان شخص کو اپنا نام دیا۔

پستی سے اٹھا کر بلندی تک پہنچایا۔ مجھے محبت دی تحفظ دیا...... زندگی کی ہر آسائش

اور وہ سب کچھ دیا جس کی خواہش کوئی بھی شخص کر سکتا ہے۔

اور میں نے سوائے اذیت کے انہیں کچھ نہ دیا۔

ابا نے جن نظروں سے آخری بار مجھے دیکھا تھا...... ان نظروں کا دکھ میرے دل میں گڑ

گیا ہے مینا۔

آنسو ان کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

ابا رو رہے تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ رلایا تھا۔

اسے

اماں کو، روحی کو

میں راتوں کو سو نہیں پاتا ہوں مینا آنکھیں بند کرتا ہوں تو ابا میرے تصور میں چلے آتے

ہیں۔ اماں کی وفات پر میں نے انہیں اکیلا وہاں چھوڑ دیا تھا...... کتنی بیدردی سے میں نے کہہ دیا

تھا۔ کہ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔

ابا بول رہے تھے اور وہ اماں کے بازو سے لگی اب بھی حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

مجھے معاف کردو مینا۔

انھوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

پھر یکدم ان کے پاؤں ایک طرف جھکے۔ میں تمہارے پاؤں پکڑتا ہوں مینا اماں

یکدم پیچھے ہٹی تھیں

"ابا ملتجی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے" ںا گنا

اماں پیچھے ہٹتے ہٹتے تخت سے جا لگی تھیں۔

"بہت زیادہ ناراض ہو مجھ سے مینا۔ ایک بار مجھے معاف کردو۔"

سیمل اماں کو دیکھ رہی تھی۔ جو ساکت سی تخت کے ساتھ جڑی کھڑی اباوس کیا تھا۔

پتا نہیں اماں ابا کو پہچان بھی رہی ہیں یا نہیں۔ ہر نہیں کرتا تھا۔

پتا نہیں وہ ابا کی بات کو سمجھ بھی رہی ہیں یا نہیں۔ سیمل نے اماں کو دو کو گڑیا کو تمہیں یاد

بتانے کے لیے منہ کھولا کہ "اماں ٹھیک نہیں ہیں" اور یہ کہ اماں کی یہ حالت برسو

لیکن اماں نے حیران کردیا وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔ ں۔ اس لیے روحی کی

"میں تو کبھی بھی آپ سے ناراض نہیں ہوئی تھی۔ بس آپ پر ترس آتا تھا ڈر لگتا تھا کہ آپ کی یہ خود پرستی آپ کو نقصان نہ پہنچا دے۔"

وہ آنکھیں پھاڑے اماں کو اتنا زیادہ بولتے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں نقصان تو اتنا بڑا ہو گیا کہ کبھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔" اللہ نے مجھے سب سکھانے کے لیے میرا بیٹا مجھ سے لے لیا اور اس بچ بچ کی جاہل عورت کو مجھ پر مسلط کر دیا۔

"کون بیٹا"

اماں کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور ان آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔

ابا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

ہمارا بیٹا رومی...... ہمارا مردان۔

اماں، ابا کا لاڈلا شہزادہ

اماں، ابا کو کتنا پیار تھا اس سے اور میں نے کتنا ترسایا انہیں......

وہ فون کرتے میں رومی سے بات نہ کرواتا وہ اسے بلاتے۔ میں نہ بھیجتا......

اور اب میں خود اس کے لیے ترستا ہوں۔ پورے گھر میں اوپر نیچے پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پکارتا ہوں۔ لیکن وہ کہیں نہیں دکھتا مینا۔

کہیں نظر نہیں آتا

مجھے نظر آ جائے...... بھلے مجھ سے جھگڑے، ناراض ہو، میں ایک بار اسے سینے سے لگا کر اس کے جوان جسم کی حرارت سے خود کو مضبوط سمجھوں۔ بس ایک بار مینا...... لیکن وہ نہیں ہے۔

وہ کہیں نہیں ہے

اماں نے بھی تو آخری بار فون کیا تھا۔

ایک بار...... آخری بار حبیب خان مجھے رومی سے ملوا دو اور خود بھی مل جاؤ۔

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

اگر ابا جی"

اماں کا نام لیں ماں تڑپ کر اماں کے قریب سے ان کی طرف بڑھی تو انہوں نے اپنے بازو وا کر
چلیں [illegible] کے جانے کے آٹھ [illegible] بعد ابا کے سینے سے لگی رو رہی تھی بلک رہی تھی۔
کاش رومی بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ رومی کے لیے سینکڑوں بار روئی تھی اکیلے، تنہا،
میں نے تمہیں بہر۔ لیکن ابا کے گلے لگ کر پہلی بار رو رہی تھی لیکن ان کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

پھر ابا ہولے ہولے اسے تھپکنے لگے۔

حوصلہ کر چندا، گڑیا بیٹا بس کر اب اللہ کی امانت تھی...... اس نے اپنی امانت لے لی۔

اللہ نے اسے سرخرو کیا۔

ایسی موت جس کی تمنا سب کریں۔ اور پہلی بار مردان کی موت کے بعد ہیسل کو لگا تھا جیسے اس کے دل پر کسی نے مرہم رکھا ہو۔ ابا سے الگ ہو کر اس نے اماں کی طرف دیکھا۔ وہ سہمی سہمی سی کھڑی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"اماں" وہ ان سے لپٹ گئی۔ اور اب وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے رو رہی تھیں۔ جیسے آج ابھی رومی کی شہادت کی اطلاع آئی ہو۔

بہت دیر بعد جب وہ تینوں سنبھلے تو ہیسل بھاگ کر کرسی اٹھا لائی تھی۔ اماں تخت پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو گود میں دھرے دیکھ رہی تھیں اور ہیسل اماں سے جڑی بیٹھی ابا سے ان آٹھ سالوں کی روداد سن رہی تھی۔

میرے بیمار ذہن نے مجھے نازو سے شادی پر اس لیے اکسایا تھا کہ میں تمہیں اور رومی کو اذیت دے سکوں۔ میں کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی کرتا تو شاید تمہیں اتنی اذیت نہ ہوتی جتنی نازو سے شادی پر تمہیں اور رومی کو اذیت ہوئی تھی۔

مجھے کیا خبر تھی مینا کہ رومی میرا دامن تہی کر کے چلا جائے گا۔ جب مجھے فون آیا کہ میں اپنے بیٹے کی ڈیڈ باڈی وصول کر لوں تو ایک لمحہ کو تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔

آخری رومی کی ڈیڈ باڈی مجھے کیوں وصول کرنے کو کہا جا رہا ہے...... پھر مجھے ادراک ہوا کہ

میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے...... وہ اذیت جو میں رومی کو دینا چاہتا تھا اس سے کئی گنا زیادہ اذیت وہ مجھے دے کر چلا گیا تھا۔

میں رومی کے لیے تڑپتا تھا تو نازو مجھے تڑپنے نہیں دیتی تھی۔

رومی میرا بیٹا تھا۔ جو جب پیدا ہوا تھا تو میں نے اس کی پیدائش پر فخر محسوس کیا تھا۔

جس کی کامیابیوں پر میں دل میں مسرور ہوتا اور فخر محسوس کرتا تھا گو ظاہر نہیں کرتا تھا۔

وہ اس بیٹے کی دائمی جدائی پر مجھے رونے نہیں دیتی تھی وہ مجھے رومی کو گڑیا کو تمہیں یاد کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میں تمہیں اور گڑیا کو گھر لانے کی بات کرتا تو وہ فساد کھڑا کر دیتی تھی۔ اس لیے رومی کی

شہادت کے چھ ماہ بعد ہی میں نے اسے طلاق دے دی۔ اور میرا ایک ہی کام رہ گیا تمہیں ڈھونڈنا۔ میں آفس سے اٹھتا تو سڑکوں پر گلیوں میں چکراتا پھرتا کہ شاید کہیں کسی جگہ پر تم نظر آ جاؤ۔ کل رات وکیل صاحب اچانک مجھے نظر آ گئے وہ اپنے کسی کیس کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے رات کیسے گزاری...... بتا نہیں سکتا۔

میں تو صبح سویرے ہی روڈ پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور انتظار کرتا تھا سوچ نکلے تو دروازے پر دستک دوں۔

وہ پھر رونے لگے تھے۔

اماں ایسے ہی بیٹھی تھیں چپ اور گود میں رکھے ہاتھوں کے ناخنوں میں جانے کیا تلاش کرتی تھیں۔ یسمل نے اماں اور ابا کو پانی پلایا۔

"تمہاری اماں میری طرف دیکھتی نہیں ہیں یسمل گڑیا مجھ سے بات نہیں کرتیں ان سے میری سفارش کرو بیٹا ایک بار دل سے مجھے معاف کر دیں۔ مجھے تلافی کا موقع دیں"

تب یسمل نے روتے ہوئے انہیں اماں کے متعلق بتایا تھا اور ان کا سر جھک گیا تھا......

وہ بے حد نادم سے یسمل سے معافی مانگنے لگے تھے۔

"اس طرح کی باتیں نہ کریں ابا جی"

یسمل اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں ناشتہ بناتی ہوں

"نہیں تم دونوں ابھی چلو میرے ساتھ وہ مچلے تھے۔

"ابھی"

یسمل پریشان ہو گئی تھی۔

"ابھی کیسے ابا جی یہاں برسوں رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ ہمارے ہر دکھ سکھ میں شریک رہے ورنہ روی کے بعد میں اور اماں بہت اکیلے تھے...... اماں بیمار حواس سے بیگانہ اور میں......

میں ان سب سے مل کر انہیں بتا کر ہی جا سکتی ہوں...... پھر ایک دم سے ایسے کیسے......

مجھے تو ابھی کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا...... یہ سب کیا ہے۔

آپ کی آمد...... سچ بتاؤں ابا جی مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ ...... پھر مالک مکان کو بھی اطلاع دینی ہے۔ ایسے کیسے ابا جی ٹھیک ہے جب تمہیں یقین آ جائے تو تب چلیں گے۔

حبیب خان بہت محبت سے اسے دیکھ رہے تھے

لیکن میں اب ایک دن کی بھی دوری برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بھی یہاں ہی رہوں گا۔ تمہارے پاس جب تک تم یہاں ہوں۔

"مینا مجھے نکالو گی تو نہیں"

وہ لگاوٹ سے اماں کو دیکھ رہے تھے۔

وہ ناشتہ بنانے کے لیے کچن میں چلی گئیں تھیں۔ وہ ابا کی اسطرح آمد پر ابھی تک حیران تھی۔

اور کیا پتا ابا نازو کے کہنے پر یہاں آئے ہوں اور ہمیں لے جا کر وہ......

"لیکن نہیں" اس نے خود ہی اپنے خیالات کی نفی کر دی تھی...... یہ سب ناٹک کرنے کی کیا ضرورت ہے وہ چاہتے تو انہیں زبردستی بھی ساتھ لے جا سکتے تھے اور انہیں کون ایسا کرنے سے روک سکتا تھا بھلا۔

اور ان کے وہ آنسو......

ناشتے کے بعد وہ اماں کو کمرے میں لے آئی تھی اور ایک بار پھر انھوں نے چپ کی چادر اوڑھ لی تھی۔

ابا نے اماں کی فائل دیکھی تھی۔

میں ڈاکٹر عرفان سے مل کر ان کی کنڈیشن معلوم کرتا ہوں۔

"میں تو اماں کی آواز سننے کو ترس گئی تھی ابا جی یہ جو اماں نے ذرا ذرا سا بولنا شروع کیا ہے تو صرف چند ماہ سے ورنہ تو۔

"میں انہیں بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گا بیٹا...... اگر باہر جانا پڑا تو باہر لے جاؤں گا۔

وہ کہہ رہے تھے اور یسمل کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اماں کو میڈیسن دے کر اس نے ابا کی طرف دیکھا تھا" ابا جی آپ ادھر لیٹ جائیں رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں کچھ دیر آرام کر لیں۔"

اپنے بیڈ کی طرف اشارہ کر کے اس نے تڑے مڑے تکیے صحیح کیے تھے...... وہ اور رزمی یونہی شنیل کے تکیوں کو توڑ موڑ کر سر کے نیچے رکھتے تھے۔ فضیلت آتی ہو گی میں ذرا کچن سمیٹ لوں۔

اور جب وہ کچن سمیٹ کر آئی تو ابا بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے گود میں تکیہ دھرے بیٹھے تھے۔

تکیے پر کہنیاں رکھے دائیں ہاتھ کے پیالے میں تھوڑی رکھے وہ بڑے انہماک سے اماں سے باتیں

کر رہے تھے۔ اور ان کی آنکھیں لمحہ لمحہ بعد لو دینے لگی تھیں۔ یسمل دروازے کے ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ کر ابا کو دیکھنے لگی تھی۔ یہ لو دیتی خوبصورت آنکھیں رومی کی آنکھوں سے کتنی ملتی جلتی تھیں۔

اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ابا بے حد خوبصورت تھے لیکن آج سے پہلے وہ اسے کبھی خوبصورت نہیں لگے تھے۔ بلکہ جب وہ چھوٹی ہوتی تھی تو سوچتی تھی کہ اگر ابا کے سر پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ لگا دیئے جائیں تو وہ بالکل سامری جادوگر یا زکوٹا جن لگیں...... یا پھر کوئی دیو۔ اس یاد نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ اس نے فوراً ہی ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبائی لیکن ابا کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ تو جانے ماضی کے کون کون سے ورق کھولے بیٹھے تھے۔

"تمہیں یاد ہے مینا جب میں باہر جا رہا تھا تو تم بڑے کمرے کی سلاخوں والی کھڑکی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے صحن میں کھڑے کھڑے اماں ابا سے مل کر یوں ہی نظریں اٹھائی تھیں تو تم پر نظر پڑی تھی تم فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی تھیں لیکن میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ دیکھ لی تھی۔ اور حیران ہوا تھا کہ تم رو کیوں رہی ہو...... اور اس پر بھی حیران ہوا تھا کہ تم اماں ابا اور پھپھو کے ساتھ حویلی کے گیٹ تک مجھے خدا حافظ کہنے نہیں آئی تھیں۔ بلکہ برآمدے سے ہی واپس چلی گئی تھیں شاید تم مجھ سے اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھیں یا پھر شاید تم مجھے بہت دھیان سے چھپ کر دیکھنا چاہتی تھیں۔ تب تم اتنی بڑی بھی تو نہیں تھیں نا...... شاید آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھیں۔ اور جب میں واپس آیا تھا تو ایک لمحہ کو تو میں تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

ارے یہ مینو ہے...... اتنی ملاحت، اتنا حسن میں تو مبہوت سا تمہیں دیکھے ہی جاتا اگر ابا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے عاصمہ خالہ سے نہ ملواتے یہ عاصمہ ہے تمہاری اماں کی خالہ زاد بہن۔

تم کو تو بالکل یاد نہیں ہوگا۔ جب تم چھوٹے سے تھے تو یہ کراچی چلی گئی تھیں۔ اب ان کے میاں اپنی ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں تو یہ واپس گاؤں آ گئی ہیں۔ اس وقت مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ عاصمہ خالہ میری زندگی میں کیا زہر گھولنے والی ہیں۔

میں نے تمہیں پھر دیکھا تھا

تم چپکے مجھے دیکھتی تھیں اور جب میں تمہاری طرف دیکھتا تو تم فوراً نظریں چرا لیتیں...... اور مجھے تمہاری اس چوری پر ہنسی آتی تھی۔ جسے میں سر جھکا کر چھپا لیتا تھا۔

اس نے اماں کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی تھیں۔ ان کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ وہ ذرا سی پلکیں اٹھا کر ابا کو تکتی تھیں پھر فوراً نگاہیں جھکا لیتی تھیں۔

اور کبھی یکدم ساکت نظروں سے ابا کو دیکھنے لگتی تھیں۔ یسمل چپکے سے اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ کچھ دیر وہ برآمدے میں کھڑی رہی پھر فضیلت کو بتا کر صحن میں آ کر دیوار پر سے دوسری طرف کود گئی۔ میراں اماں اپنے برآمدے میں تخت پر بیٹھی ابھی تک قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔ قرآن کو جزدان میں لپیٹا۔

"آؤ آؤ یسمل بچہ" آج اتنی سویرے کیسے آ گئیں۔

"اماں جان"

یسمل خوشی سے ان کے گلے لگ گئی۔

"ابا آئے ہیں صبح صبح"

وہ انہیں تفصیل بتانے لگی

"وہ ہمیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں گھر مگر میں۔

"نہ بچہ ضرور جاؤ اپنے ابا کے ساتھ۔ اللہ نے انکا دل پھیرا ہے تو شکر کرو یسمل بچہ اپنے رب کا۔

بغیر سائبان عورت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے چوراہے پر پڑی چیز جس کا جو جی چاہے سلوک کرے۔

عورت تو اپنے سائبان سے ہی معتبر ہوتی ہے یسمل بچہ، باپ،، بھائی، شوہر، بیٹا کوئی تو ہو۔

اکیلی عورت تو چار دیواری میں بھی غیر محفوظ ہوتی ہے

اماں تمہاری یہ حالت۔

شکر اللہ کا لوگ اچھے ہیں آس پاس کے۔ مروت لحاظ والے، خیال رکھتے ہیں تم دونوں کا پر بیٹا نیت بدلنے میں کون سا دیر لگتی ہے۔

یہ تو حاجی صاحب تمہاری حمنہ کے ابا کا رعب داب ہے کہ کوئی آنکھ اٹھا کر تمہارے گھر کی طرف نہیں دیکھتا۔ پر کب تک بچہ

اکیلی عورت پر تو جھپٹنے کے لیے گدھوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے ہوتے ہیں کچھ خبیث

اللہ کا نام لے کر ابا کے ساتھ سدھارو۔

"جی اماں جان"

یسمل کے دل میں اگر کوئی الجھن تھی تو میراں اماں کی باتوں سے دور ہو گئی تھی۔

ابا بہت بدل گئے ہیں۔ مروان کی موت نے انہیں اندر سے توڑ دیا ہے۔

جزدان میں لپٹے قرآن شریف کو گود سے اٹھا کر میراں اماں اٹھیں۔
بیٹھ بچہ میں یہ قرآن رکھ آؤں تو تیرے لیے چائے بناتی ہوں۔
''نہیں اماں جان میں تو چائے پی کر آئی ہوں''
آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی۔
''ہاں آج شیری صبح صبح ہی چلا گیا تھا۔
''کہاں''
سیمل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
یہ ہی اسلام آباد، پنڈی تک گیا ہے۔
''اچھا''
سیمل کے اندر مایوسی سی پھیل گئی۔
کب تک واپس آئیں گے۔
''بتا کو تو نہیں گیا۔ ایک دو روز تک آ جائیگا۔
میراں اماں نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر قرآن لیکر کمرے میں چلی گئی تھیں اور جب کمرے سے نکلیں تو سیمل کچن میں کھڑی تھی۔ کچن کے دروازے سے جھانک کر اس نے میراں اماں کو دیکھا۔
اماں جان آپ بیٹھیں میں چائے بناتی ہوں اور ناشتے میں کیا لیں گی۔ پراٹھا بنا دوں۔
''نہ نہ سیمل بچہ بس چائے کے ساتھ رس (رسک) دے دینا...... ادھر کاؤنٹر پر ہی ڈبا پڑا ہے۔
وہ تخت پر آ کر بیٹھ گئیں تھیں۔
کاش یہ اتنی اچھی، اتنی پیاری لڑکی ان کے شیری کا مقدر بن سکتی۔ لیکن اتنے امیر باپ کی بیٹی اور کہاں ہم خاناں برباد
بے گھر بے اماں لوگ
اللہ میرے شیری کے دل سے اس کا خیال نکال دے۔
ایسا لٹا پٹا...... ایسا زخمی دل۔ ایک اور زخم کھانے کی کہاں گنجائش ہے اس کے دل میں میرے مولا۔
ماں، باپ، بہن بھائی پہلے ہی سارے رشتے لٹا کر بیٹھا ہے میرا بیٹا۔

اب ایک اور رشتے کا درد اسے نہ دینا مولا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ سے باتیں کیے جاتی تھیں دعائیں کرتی تھیں اور نم آنکھوں کو پونچھتی تھیں۔ جب سیمل ٹرے میں ناشتہ لگائے آ گئی ان کے منع کرنے کے باوجود اس نے ڈبل روٹی سینک لی تھی اور انڈا بھی فرائی کر لیا تھا۔
''منع کیا تھا سیمل بچے''
نم آنکھیں پونچھ کر انھوں نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ اور جو میری زینے ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی۔ ان کے منع کرنے کے باوجود وہ مرضی سے ناشتہ بنا لیتی تھی۔ ''لتاں جان ناشتہ ضروری ہے'' وہ ہنستی...... اور ہنسنے میں اس کے ڈمپل کتنے نمایاں ہو جاتے تھے۔
'' آپ ہم سے یہی کہتی ہیں نا۔ کہ دن کا کھانا بھلے نہ کھاؤ لیکن ناشتہ ضرور کرو تو آپ کے لیے بھی یہی ٹپس...... ناشتہ ضروری ہے۔
ارے بچہ تم لوگوں نے سکول جانا ہوتا ہے۔ دماغ کھپانا ہوتا ہے اور زینیے کو دیکھ کر کتنی ہی بار انھوں نے سوچا تھا کہ زینے اور نوشیروان پر انھوں نے دل کی بات کبھی زبان سے نہ نکالی تھی۔
ابھی تو بچے ہیں...... ابھی سے کیا کہنا کچھ۔
ایک ٹھنڈی سانس لیکر انھوں نے سلائس اٹھا لیا تھا۔ اپنے لیے بھی چائے بنا لیتا تھی بچے۔
''نہیں اماں جان ابھی تو پی کر آئی ہوں۔''
اور پھر میراں اماں کو ناشتہ کرتے چھوڑ کر وہ دیوار سے کود کر گھر آ گئی۔ فضیلت صحن دھو رہی تھی وہ شلوار کے پائنچوں کو بھیگنے سے بچاتی ہوئی کمرے میں آئی تھی تو ابا اس طرح تکیہ گود میں رکھے بیٹھے تھے۔ اور اماں یوں ہی وقفے وقفے سے مسکراتی تھیں اور شرماتی تھیں۔ پتا ہے مینا یہ عاصمہ خالہ تھیں جنھوں نے میرے دماغ میں یہ خناس بھرا تھا کہ تم میرے قابل نہیں ہو۔ میں جب بھی ان کی طرف جاتا تھا وہ کہتی تھیں۔ ''تمہارے ساتھ بھائی صاحب اور آپا نے ظلم کیا۔ کہاں تم کہاں مینا وہ تو تمہارے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔''
تمہارے لیے تو کوئی بہت پڑھی لکھی اور خوبصورت ماڈرن لڑکی ہونا چاہیے تھی۔ اور میرے اندر ان کی باتوں سے جو ''میں'' جاگ اٹھی تھی اس کا غبارہ پھولتا جا رہا تھا اور وہ اتنا پھولا کہ عاصمہ خالہ کی بیٹیاں بھی مجھے اپنے سے کمتر لگنے لگیں۔ وہ ایجوکیٹڈ تو تھیں لیکن خوبصورت نہیں تھیں۔ عاصمہ خالہ نے کہا تھا۔
ابا اور اماں امینہ کو میرے ساتھ بیاہ کر اس احسان کا بدلہ لے رہے ہیں جو انھوں نے

مجھے پال پوس کر کیا تھا۔اور میری ''میں'' کے پھولے غبارے نے مجھے کہا ٹھیک ہے حبیب احمد خان تم امینہ سے شادی کر کے یہ احسان اتار دو۔

''اباجی'' یسمل نے انہیں چونکایا تھا۔

دوپہر کیلئے کیا پکواؤں

''میری بیٹی جو پکائے گی میں وہی کھاؤں گا''

بیٹی کے ہاتھ کا پکا کھا کر تو آپ دوبارا اس کھانے کا نام بھی نہ لیں گے۔

یسمل بے اختیار ہنسی تھی۔اور کتنے سالوں بعد اس طرح ہنسی تھی۔وہ یکدم اپنی ہنسی سے خوفزدہ ہوگئی اور اس نے لب بھینچ لیے مروان کہتا تھا۔

ہنسا کرو گڑیا تم ہنستی کیوں نہیں ہو۔

خوش رہا کرو......تم خوش کیوں نہیں ہوتی ہو۔اور وہ اسے ہنسانے کے لیے کیسے کیسے لطیفے سناتا تھا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑتی تھی۔

''بھئی ہماری بیٹی جیسا بھی پکائے گی کچا پکا ہم شوق سے کھائیں گے۔''

ابا اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دراصل ابا میں ابھی کھانا وانا نہیں بناتی۔فضیلت ہی کرتی ہے سب اور اگر کبھی کوشش کروں تو وہ فضیلت سے بھی زیادہ خراب بنتا ہے۔فضیلت بھی کوئی ماہر کک نہیں ہے۔لیکن گزارہ ہوجاتا ہے۔سو آج آپ بھی گزارہ ہی کریں۔''

''مینا کے ہاتھوں میں تو بہت ذائقہ تھا۔''

بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

''میں جب اماں سے سیکھ کر پکاؤں گی تو میرے ہاتھ میں بھی اماں جیسا ذائقہ ہوگا۔ لیکن ابھی میں ذرا اپنا امتحان دے لوں۔''

''ابھی تم پڑھ رہی ہو۔''

ابا نے شاید دل ہی دل میں حساب لگایا تھا۔

''ہاں دراصل رومی کے بعد میں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی۔''

وہ اماں کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اور ابا کو رومی کے اس طرح چلے جانے کے بعد اپنی کیفیات بتانے لگی تھی۔اور ایک بار پھر رو رہی تھی اور ابا اسے اپنے ساتھ لپٹائے اسے حوصلہ دے رہے تھے۔اور اماں ساکت بیٹھی خالی خالی نظروں سے ان کو تکتی تھیں۔کچھ دیر پہلے والی اماں

نجانے کہاں چلی گئی تھیں۔آنکھیں ویران اور خالی لگتی تھیں۔

اس نے ابا سے الگ ہو کر اماں کو لٹا دیا ''اماں دراصل میڈیسن کھانے کے بعد سوجاتی تھیں لیکن آج''

اس نے ابا کی طرف دیکھا اور اماں کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے انکا سر دبانے لگی۔

اماں کسی سعادت مند بچے کی طرح آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں اور ابا حسرت سے اسے اماں کا سر دباتے دیکھ رہے تھے۔اور صبح فضیلت کے طفیل آس پاس سب کو ہی ابا کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔ابا ناشتے کے بعد کچھ دیر کے لیے چلے گئے تھے اور دن بھر پاس پڑوس کے گھروں سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔سب نے ہی خوشی کا اظہار کیا تھا۔حمنہ بہت اداس تھی اور ابا کے آنے تک اس کے پاس ہی رہی تھی۔وہ خود بہت اداس ہو رہی تھی۔اتنے سارے سال اس نے یہاں گزارے تھے ان لوگوں کی محبتوں اور خلوص کے سہارے۔ابا واپس آئے تو ساتھ دو ملازم تھے۔انھوں نے سب سامان پیک کر دیا تھا۔اماں صبح سے چپ تھیں۔بالکل خاموش جیسے کچھ سوچتی ہوں۔

''اماں جی ابا ہمیں لینے آئے ہیں چلیں ان کے ساتھ'' رومی......اس سے پوچھتا۔

ناراض ہوگا بہت دیر بعد اماں بولی تھیں۔

نہیں اماں جی ......رومی ناراض نہیں ہوگا۔اس نے کہا تھا کہ اگر ابا کبھی بلائیں تو چلے جانا۔اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں جل تھل ہوگئی تھیں۔

''اچھا''

اماں نے بس اتنا ہی کہا تھا اور ان کی آنکھوں سے وہی خالی پن جھانکنے لگا تھا۔کیا اماں اب کبھی ٹھیک نہیں ہوں گی۔کیا یہ دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت ہمیشہ رہے گی۔

وہ افسردہ سی ہو کر باہر آئی ابا باہر صحن میں کھڑے تھے اور اپنے موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔بات کر کے انھوں نے یسمل کی طرف دیکھا۔

''تو کل صبح پھر چلیں''

تم خوش نہیں ہو یسمل۔تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔

وہ اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر پتا نہیں کیا سمجھے تھے۔

''نہیں مجھے رومی بھائی یاد آرہے ہیں۔''

انہیں یہاں صحن میں چارپائی بچھا کر لیٹنا اور آسمان پر تاروں کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔

وہ کہتے تھے وہاں دادا ابا کے گھر کے صحن سے بھی آسمان یونہی نظر آتا تھا۔

وہاں ابا کے گھر میں مجھے بھی صحن میں لیٹ کر تاروں بھرا آسمان دیکھنا اچھا لگتا تھا۔
وہ یکدم ہی بہت اداس ہو گئے تھے۔
جس صبح رومی بھائی کو جانا تھا ہم دیر تک باہر روڈ پر ٹہلتے رہے تھے اور ہم نے کافی ہاؤس میں جا کر کافی پی تھی۔
"اچھا ہم بھی چلیں سیمل آج وہاں جہاں جہاں اس نے قدم رکھے تھے۔ وہاں ہی جا کر کافی پئیں جہاں اس نے کافی پی تھی۔ جی ابا جی اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو۔
"ہاں میرا دل چاہتا ہے میں ان رستوں کو ان گلیوں ان جگہوں کو دیکھوں جنہوں نے آخری بار میرے بیٹے کے قدموں کو چھوا تھا۔ اور پھر کھانا کھا کر وہ اماں اور ابا تینوں باہر نکلے۔ آس پاس کی عورتیں اور بچے حسب عادت پارک میں جا رہے تھے
وہ ٹہلتے ٹہلتے روڈ کراس کر کے کافی ہاؤس میں پہنچے تھے اور سیمل کو مردان بے طرح یاد آ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اور مردان سڑک کے کنارے کھڑے ہوں۔ ٹھنڈی یخ ہوائیں ان کے بدن کو چیرتی ہوں اور کیفے کے اندر ایک فیملی ہو اور......
"سیمل"
ابا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
"ابا جی"
اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔
انھوں نے بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھام کر دبایا تھا۔ کافی پینے کو اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اور شاید ابا کا بھی اور وہ وہاں سے واپس پلٹ آئے تھے۔ جب وہ اپنی گلی کی طرف مڑے تھے تو اسے گمان گزرا تھا کہ جیسے نوشیرواں گلی کے کونے پر بنی بیکری والی گلی کی طرف مڑا ہو۔ اسے انجانی سی خوشی ہوئی تھی۔ تو نوشیرواں واپس آ گیا تھا وہ اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔ نوشیرواں نے بہت بار ان کی مدد کی تھی وہ جانے سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ یا پھر کوئی اور بات تھی۔ لیکن وہ جو کل سے بے چینی سی تھی اسے یکدم قرار آ گیا تھا۔ گھر آ کر اماں کو دوائیاں دے کر وہ بڑے سکون سے اماں کے بیڈ کے پاس میٹرس بچھا کر سو گئی تھی۔ ابا اماں سے پرانی باتیں کر رہے تھے۔ دادا جان کی، دادی جان کی اپنی اور نانی جان کی۔
اماں ان کی باتیں سنتے سنتے سو گئی تھیں۔
صبح جلدی جلدی اس نے باقی ماندہ سامان سمیٹا تھا اور ابھی وہ سامان سمیٹ کر فارغ

ہوئی ہی تھی کہ میراں اماں آ گئیں۔ ابا کمرے میں تھے وہ میراں اماں کو لیکر برآمدے میں ہی بیٹھ گئی۔
"اماں جان آپ بہت یاد آئیں گی۔"
تم بھی تو بہت یاد آؤ گی سیمل بچہ۔ تمھیں دیکھ کر ہمیشہ مجھے اپنی زینبیہ یاد آ جاتی تھی۔ لیکن اللہ تمھیں اپنے باپ کے سائے تلے سکھی رکھے اور تمہاری اماں کو صحت و زندگی دے۔
"اماں جان آپ اماں کے لیے بہت دعا کرنا۔"
میں تو اب بھی ہر نماز کے بعد اس کے لیے دعا کرتی ہوں اور جب جب گل کے لیے دعا مانگتی ہوں اس کی بسلامت واپسی کی تو تیری اماں کے لیے دعا کرنا کبھی نہیں بھولتی۔
"اماں جان"
اس نے میراں اماں کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیے۔ میں آتی رہوں گی کبھی کبھی ملنے آپ بھی آئیں گی نا۔ میں اپنا ایڈریس اور فون نمبر دے جاؤں گی۔ میراں اماں نے سر ہلا دیا تھا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
"وہ نوشیرواں آ گئے واپس"
اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔
اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے میراں اماں نے بغور اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم مایوسی اترنے لگی تھی۔ بے حد افسردہ سا ہو کر انھوں نے سر جھکا لیا تھا۔
تو آپ اکیلی ہیں گھر میں۔
نہ بچہ وہ حیدر کی بیوی آ جاتی ہے تب ہی ابا کمرے سے باہر آئے تھے۔
"سیمل بیٹی میں گاڑی لے کر آتا ہوں تم تیاری کرلو۔"
جی
ابا سر جھکائے دروازہ کھول کر باہر چلے گئے تو وہ میراں اماں کو اماں کے پاس چھوڑ کر خود باہر آ کر تخت پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور اس گھر میں گزرے سارے دن اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔

☆☆☆

نوشیرواں کو اسلام آباد سے واپس آئے آج دوسرا دن تھا...... وہ کل شام اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔ دراصل چیف جسٹس کی معزولی سے پہلے اس نے گل کی بازیابی کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں ایک درخواست دی تھی۔ چیف جسٹس تو معزول ہو گئے تھے لیکن اس کی

درخواست کا کیا بنا تھا وہ معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ پتا نہ چل سکا تھا عجیب افراتفری کا عالم تھا۔
رات کو صحن میں ٹہلتے ہوئے اس نے کئی بار اپنی سماعتیں یسل کے گھر کی طرف مبذول کی تھیں۔
لیکن ادھر خاموشی تھی۔ یسل آج صحن میں اور برآمدے میں نہیں آئی تھی۔ یا آئی بھی تھی تو وہ اس کے قدموں کی آہٹ نہیں سن پایا تھا۔ اس کی سسکیاں

اماں سے اس کی باتیں۔

شاید وہ جلدی سو گئی تھی۔

ایک نامعلوم سی افسردگی میں گھرا وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

کمرہ جہاں ٹیبل پر کارگل کا نقشہ پڑا تھا۔ اور ٹیبل پر ہی ایک کونے میں ''گل'' کی ڈائری پڑی تھی۔ وہ کچھ دیر کارگل کے نقشے کو دیکھتا رہا۔ کارگل کی پہاڑیاں جن میں سے کئی آپس میں جڑی ہوئی تھیں اور ان کی اونچائی سطح سمندر سے 16 ہزار سے 20 ہزار فٹ بلند تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی نقشے کو دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لیکر اس نے میز کے کونے پر پڑی گل کی ڈائری اٹھائی اور میز کے پاس سے ہٹ آیا۔

کون جان سکتا ہے کہ کارگل کی چوٹیوں تک مجاہدین کی پیش قدمی ایک تاریخی عمل سے وابستہ تھی۔ وہ انسانی اور کشمیری خون جو طویل عرصے سے کشمیر میں بہہ رہا تھا اس کی ناقابل تسخیر قوت کارگل کی بلند چوٹیوں تک جا پہنچی تھی۔ بھارت کی گردن کشمیری مجاہدین کی گرفت میں تھی اور وہ چند سو مجاہدین سے شکست پر شکست کھاتا جا رہا تھا۔ تب اس نے دو ہزار پونڈ وزنی بم برسانے شروع کر دیئے تھے یہ میراج 2000 گائیڈڈ بم تھے جنہوں نے تباہی مچا دی تھی۔ پھر پہلے تو لانگ کی چوٹیاں مجاہدین کے ہاتھوں سے نکلیں اور پھر یہ کیسا دکھ تھا جو اکثر اندر ہی اندر کاٹنے لگتا تھا۔
اگر کشمیری مجاہدین کامیاب ہو جاتے تو تاریخ کا دھارا آج کسی اور رخ پر بہہ رہا ہوتا۔

گہرے دکھ کے احساس کو اندر ہی اندر جذب کرتے ہوئے اس نے گل کی ڈائری کھولی تھی۔ جب سے یہ ڈائری اسے ملی تھی وہ نہ جانے کتنی بار اسے پڑھ چکا تھا۔

گل کہاں تھا۔ تھا بھی یا نہیں

اگر کہیں ہوتا تو کبھی تو علاقے میں جاتا حویلی کے ملبے پر جہاں دلدار بیٹھا اس کا انتظار کرتا تھا اور کہتا تھا۔

گل لالہ آئے گا تو یہاں سے جاؤں گا۔ وہ ایک بار پھر گل کی ڈائری پڑھ رہا تھا۔ اس کی اپنی لکھی گئی نظمیں اور اس کا انتخاب سب ہی خوبصورت تھا۔

پھر وہ یونہی بے مقصد ڈائری کے خالی صفحے پلٹنے لگا خالی صفحے جن پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا لیکن پھر بھی وہ صفحے پلٹ رہا تھا۔ پھر ایک جگہ وہ ٹھٹک کر صفحہ دیکھنے لگا۔

آخری صفحات سے کچھ پہلے اس صفحہ پر پنسل سے کچھ لکھا تھا اور پھر لکھ کر اریزر سے مٹانے کی معمولی سی کوشش بھی کی گئی تھی۔ لیکن صاف پڑھا جا رہا تھا۔ یہ تو...... یہ تو

اس نے ایک نظر صفحے پر ڈالی

ذمیرنہ عمر چھ ماہ

حکم جان عمر دو سال

شہباز سات سال

ذرمینہ تاج نو سالہ

کون مجھے بتائیگا کہ ان میں سے کون دہشت گرد ہے مٹے مٹے سے سترہ نام پڑھتے ہوئے نوشیرواں عادل کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے ڈائری بند کر دی۔ یہ نام تو اس کے میراں اماں کے اور گل کے دلوں پر لکھے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی ڈائری ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر ڈائری میز پر رکھ دی اور باہر آ گیا ایک بار پھر وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔
دیوار کے اس طرف سے موتیے کی خوشبو میں رچی ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکراتی تو وہ بہت لمبی سانس لیکر اس ہوا کو اپنے اندر جذب کر لیتا۔

دل بے طرح یسل کو دیکھنے کو مچل رہا تھا۔ لیکن بھلا اس وقت وہ کہاں ادھر آ سکتی تھی۔
مچلتے دل کو سنبھالتے ہوئے اس نے برآمدے میں قدم رکھا تو میراں اماں نے یکدم ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے شیری بیٹا کیوں اتنی رات گئے تک جاگ رہے ہو۔ بچے سو جاؤ اب جا کر۔''

اس نے سر جھکا لیا۔

''جی اماں جان''

بچے وہاں اسلام آباد میں کچھ خاص بات پتا چلی۔ آخر میں کسی خدشے سے ان کی آواز لرز گئی۔

''نہیں اماں جان...... کچھ بھی نہیں۔ اور شاید کبھی کچھ پتا نہ چلے۔

اس نے سر اٹھا کر میراں اماں کو دیکھا۔ آپ آرام کریں اور اماں جان میں بھی آ رہا ہوں۔

بہت رات بیت گئی ہے شیری۔

"اچھا" تھکے تھکے انداز میں چلتا ہوا وہ میراں اماں کے پیچھے کمرے میں آ گیا اور دائیں طرف اپنے بیڈ پر بیٹھے ہوئے اس نے جھک کر جوتوں کے لیس کھولے اور میراں اماں کی طرف دیکھا جو اپنے بیڈ پر لیٹ گئی تھیں۔

"اماں جان آپ نے دودھ پیا تھا" طبیعت ٹھیک ہے۔" "ہاں بچے میں ٹھیک ہوں" کمرے میں زرد روشنی کا بلب جل رہا تھا۔اور زرد روشنی میں میراں اماں کا چہرہ بھی زرد زرد لگ رہا تھا۔

جوتے اتار کر پاؤں اوپر بیڈ پر رکھتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا۔

"صبح مجھے جلدی جانا ہے چھ بجے نکلوں گا گھر سے اگر میری آنکھ نہ کھلے تو جلدی جگا دیجئے گا"

"اچھا"

میراں اماں نے کروٹ بدل لی۔

کیا ہی اچھا ہوتا اماں جان اگر ہم دونوں بھی سب کے ساتھ اور ہمارا ہونا کیا ضروری تھا۔اور ہم نے ان سب کے بعد جی کر بھی کیا کرنا تھا۔

ہمارا ہونا ضروری تھا یا نہیں یہ ہم دونوں کو اس نے کیوں بچا لیا تو یہ اس کی حکمت ہے اس کی رضا ہے۔

میراں اماں نے تڑپ کر پھر اس کی طرف کروٹ بدلی۔وہ تکیہ درست کر رہا تھا۔

کیا ہو گیا ہے بچے کیوں اس طرح اتنا قنوطی اور دکھی ہو رہا ہے۔

"کیا دکھی نہیں ہونا چاہیے اماں جان آپ دکھی نہیں ہوتیں کیا آپ کو سب کچھ بھول گیا ہے"۔

میراں اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"شیری بیٹا"

ان کی آنکھوں سے کرب جھانکنے لگا تھا۔لیکن انھوں نے کچھ کہا نہیں جیسے لفظ اندر ہی کہیں مر گئے تھے وہ آہستگی سے اپنے بیڈ سے اتر کر اس کے قریب آ گئیں۔اس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے انھوں نے اس کا سر چوم لیا۔بہت سی باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہوتیں شیری ہمیں انہیں برداشت کرنا ہی ہوتا ہے"

"جی اماں جان"

کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا۔

پھر آہستگی سے انہیں الگ کیا۔ان کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیسی زخمی دل چیر دینے والی مسکراہٹ تھی"

میراں اماں کو لگا جیسے انکا دل کٹ کر گر رہا ہو۔وہ لمحہ بھر اسے دیکھتی رہیں۔آپ آرام کریں اماں جان میں بھی سوتا ہوں۔

میراں اماں نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی اور اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گئیں۔نوشیرواں نے لیٹنے سے پہلے دائیں طرف دیوار پر موجود سوئچ کو آف کیا کمرے میں یکدم اندھیرا پھیل گیا تھا۔سٹریٹ سے آنے والی مدھم سی روشنی نے کمرے کے اندھیرے کو ذرا کم کر دیا تھا۔نوشیرواں نے دیکھا میراں اماں لیٹ گئی تھیں اور انھوں نے اپنا دوپٹا اپنے چہرے پر ڈال لیا تھا۔

کیا کوئی اس ماں کے دکھ کی تھاہ تک پہنچ سکتا ہے۔نوشیرواں نے لیٹتے ہوئے سوچا اور آنکھیں بند کر لیں۔بہت سارے مناظر آنکھوں کے سامنے آتے رہے اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔صبح اسے جلدی آفس پہنچنا تھا اس لیے میراں اماں کا ناشتہ بھی اس نے جلدی بنا دیا تھا۔انہیں ناشتہ دے کر وہ باہر صحن میں آیا تو اسے دیوار کے اس طرف سے یسمل کی آواز آئی تھی۔"آپ کے لیے ناشتہ ابھی بنا دوں یا پھر کچھ دیر سے شاید وہ اماں سے پوچھ رہی تھی"

نوشیرواں کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی اس کا دل چاہا وہ دیوار پر سے جھانک کر اسے دیکھے۔یکدم اسے روبرو دیکھنے کی خواہش بہت شدت سے دل میں پیدا ہوئی تھی۔لیکن دل کی خواہش دل میں چھپائے وہ بے حد خوشگوار موڈ کے ساتھ میراں اماں کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آیا تھا۔اس کا خیال تھا کہ جلدی واپس آ جائے گا۔لیکن پھر کچھ پرانے دوست مل گئے تھے۔اور کرنل عارف انہیں زبردستی گھر لے گئے تھے۔اس نے وہاں سے اماں کو فون کر دیا تھا کہ وہ کچھ دیر سے آئیگا۔اس لیے وہ حیدر کی بیوی کو بلا لیں رات کا کھانا کرنل عارف کے گھر کھا کر وہ جب اپنی گلی میں داخل ہوا تو اس کی نظریں پہلے یسمل کے گھر پر پڑی تھیں۔وہاں بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

"یہ تالا اور اس وقت"

اللہ خیر کرے یسمل کی اماں ٹھیک ہوں کہیں......لیکن پھر خود ہی اس نے اپنے خیال کو جھٹک دیا کیا پتا یسمل اور اماں اس وقت اماں جان کے پاس بیٹھی ہوں۔یسمل کے تصور سے دل

خوشگوار انداز میں دھڑکا۔

لڑکی تم آہستہ آہستہ نوشیرواں عادل کے دل پر حکمران ہوتی جا رہی ہو۔

لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ میراں اماں کو سلام کر کے وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا برآمدے تک آیا اور کھوجتی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے میراں اماں سے پوچھا۔

"آپ اکیلی تھیں حیدر کی بیوی نہیں آئی تھی۔ دو تین چکر لگائے ہیں اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی گئی ہے"

"اچھا" اس نے غیر ارادی طور پر صحن کی مشترکہ دیوار کی طرف دیکھا تھا۔

دیوار کے اس پار اندھیرا تھا پیلی روشنی کا وہ بلب جو ساری رات برآمدے میں جلتا رہتا تھا آج نہیں جل رہا تھا تو ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔

"یسمل کی اماں جان تو ٹھیک ہیں نا۔ ان کا گھر لاکڈ ہے"

اس نے میراں اماں سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا"

میراں اماں جیسے تھک سی گئی تھیں وہاں ہی تخت پر ٹک گئیں اور ایک گہری نظر نوشیرواں کے چہرے پر ڈالی وہ کچھ مضطرب سا لگ رہا تھا۔

"وہ دراصل وہ لوگ چلے گئے یہاں سے۔ یسمل کے ابا آئے تھے لے گئے انہیں"

"کیا"

اس کا اضطراب یکدم بڑھا۔

"کسی نے منع نہیں کیا...... روکا نہیں انہیں آپ جانتی ہیں نا اماں جان وہ یسمل اپنے والد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ مروان انہیں وہاں سے لایا تھا۔ وہ کتنی خوفزدہ رہتی تھی اپنے والد سے ہاں بیٹا...... لیکن اللہ نے بڑا کرم کیا صلح ہو گئی بیوی اور بیٹی کا خیال آ گیا۔

"اتنے سالوں بعد"

وہ تلخ ہوا۔ اللہ کا کرم جب دل میں خیال ڈال دے بڑی دعائیں کرتی تھی میں اکیلی بچی کب تک اور کیسے بیمار ماں کو سنبھالتی۔

"یسمل خوش تھی۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے نا۔ زبردستی تو نہیں کی اس کے والد نے۔ وہ بہت ڈرتی تھی کہ زبردستی لے جائیں گے۔

وہ بے یقین سا تھا۔

نہیں زبردستی نہیں کی کسی نے بہت خوش تھی کہہ رہی تھی وہ بہت شرمندہ ہیں۔

"اچھا"

نوشیرواں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے اور دل تھا کہ یکدم بجھ سا گیا تھا۔ وہ جسے دیکھنے کی چاہ میں وہ اسلام آباد بریگیڈیئر مصطفیٰ کے اصرار کے باوجود نہیں ٹھہرا تھا وہ اس سے ملے بنا ہی جا چکی تھی۔ کم از کم اس کا انتظار ہی کر لیتی۔ اس نے دل ہی دل میں اس نے شکوہ کیا۔

وہاں اسلام آباد کی فضا بہت غمزدہ تھی بلکہ پورے ملک کی فضا میں افسردگی اور غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مسجد حفصہ کی معصوم بچیوں کی شہادت کے واقعے کو زیادہ دن تو نہیں گزرے تھے۔ ہر گھر میں انہی کا ذکر تھا۔ ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ 2007ء بھی کیسا سال تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں سیاہ ترین باب کا اضافہ کرتا سال مارچ میں چیف جسٹس کی معزولی اور اب جولائی میں معصوم اور بے گناہ بچوں اور بچیوں کا قتل عام۔

"تمہیں سلام کہہ رہی تھی"

میراں اماں بغور اسے دیکھ رہی تھیں"

کیا اس نے یسمل کو کھو دیا ہے۔

ایک گہرے احساس زیاں کے ساتھ اس نے میراں اماں کی طرف دیکھا۔

.آپ نے کھانا کھا لیا اماں جان

"ہاں بیٹا، حیدر کی بیوی نے بتایا تھا تم کھانا کھا کر آؤ گے تم کھانا کھایا؟"

ایک انجانا سا دکھ بھرا احساس ہولے ہولے دل کو چیرنے لگا تھا۔

"آپ آرام کریں اماں جان میں ابھی کچھ دیر کام کروں گا۔

گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے انھوں نے پھر نوشیرواں کی طرف دیکھا تھا۔ نوشیرواں کے چہرے پر پھیلی یاسیت کو دیکھ کر ان کا دل بوجھل سا ہو گیا تھا۔ بہت اچھی تھی یسمل۔ کتنا خیال کرتی تھی انکا۔ کیسا محبت بھرا نرم دل دیا تھا اللہ نے اسے۔ بالکل زینبیے کی طرح۔ اللہ اسے اپنے گھر اپنے باپ کے سائے تلے سکھی رکھے۔ بہت دکھ اور تکلیف دیکھی ہے اس نے۔

دل ہی دل میں سوچتی ہوئی وہ کھڑی ہو گئی تھیں نوشیرواں نے بے اختیار ہی ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پھر وہ یونہی ہاتھ تھامے تھامے وہ انہیں کمرے میں لے آیا اور بہت محبت سے پوچھا۔

"اماں جان آپ کے لیے دودھ گرم کر کے لے آؤں"

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"جی نہیں چاہ رہا میں اب سو جاؤں گی تم بھی بیٹا جلدی سو جانا"

"جی اماں جان"

انہیں لٹا کر اور ان کو چادر اوڑھا کر وہ باہر نکل آیا اور اس کے باہر جاتے ہی میراں اماں کی آنکھوں سے گرم گرم سیال بہہ نکلا تھا۔

کاش وہ اپنے اس بے حد پیارے بے حد بہادر اور صابر بیٹے کے دل کی خوشی کا کوئی سامان کر سکتیں۔ یسل کو دیکھ کر کئی بار ان کے دل میں بھی خیال آیا تھا کہ وہ یسل کو نوشیرواں کے لیے مانگ لیں لیکن چاہنے کو تو دل بہت سی باتوں کو چاہتا ہے لیکن ہر چاہ پوری نہیں ہو سکتی۔

حسنہ نے انہیں بتایا تھا۔ یسل کا باپ ایک بے حد امیر شخص ہے اور یسل کا گھر اتنا خوبصورت اتنا بڑا ہے کہ حیران رہ جاتے ہیں اس نے انہیں بتایا تھا۔

"وہ مروان کی موت پر وہاں گئی تھی اور اس نے دیکھا تھا۔

بھلا کہاں نوشیرواں اور کہاں یسل۔ ان کی جھولی تو خالی تھی وہ کیسے یسل کے باپ کے سامنے پھیلاتیں۔ نہ گھر نہ ٹھکانہ تہی داماں۔

گرم آنسوؤں سے تکیہ بھیگ رہا تھا اور باہر نوشیرواں تخت پر چپ بیٹھا پتا نہیں کیا سوچتا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار صحن میں مشترکہ دیوار کی طرف اٹھتیں اور پھر لوٹ آتیں۔ عجیب سا احساس زیاں تھا جو دل کو بھینچتا تھا اور تکلیف دیتا تھا۔

"کیا اس نے جانے سے پہلے ایک بار بھی مجھے نہیں سوچا ہوگا۔ کیا اس کا دل نہیں چاہا ہوگا کہ جانے سے پہلے وہ مجھے مل لے۔ آخر کچھ دنوں کا ساتھ تو تھا نا۔ بہت طویل نہ سہی...... لیکن کبھی کبھی طویل رفاقتیں بھی بے معنی ہو جاتی ہیں اور لمحوں کا ساتھ عمر بھر پر محیط ہو جاتا ہے کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ میں نوشیرواں اپنے دل کی خالی مسند پر اسے بٹھا چکا ہوں۔

آج باہر حبس تھا اور گرمی ہوا کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کی شرٹ پسینے سے چپک رہی تھی لیکن وہ جیسے گرمی اور حبس سے بے نیاز سا صرف یسل کو سوچ رہا تھا۔ وہ ایسی تو نہ تھی کہ یوں ہی بنا نشان دیئے بغیر چلی گئی ہوگی۔ ضرور، ، ں جان کو اس نے اپنے گھر کا ایڈریس اور نمبر بتایا ہوگا۔

ناامیدی کے بادلوں میں سے امید کی کرن چمکی تو جیسے یکدم Relax ہو گیا۔ اور اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے سوچا۔

اف آج کتنی گرمی اور حبس ہے اور کھڑا ہو گیا۔

"بھلا یوں بھی کوئی کرتا ہے ظالم لڑکی اس کے لبوں کو ایک خوبصورت مسکراہٹ نے چھوا اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کام کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ اسے اپنے پراجیکٹ کے متعلق رپورٹ تیار کرنی تھی۔ کچھ دیر وہ یونہی قلم ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر سونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کو وہ میراں اماں کے کمرے میں ہی سوتا تھا۔ کہیں رات کو اچانک ان کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔ کہیں وہ اٹھیں اور اندھیرے میں گر نہ جائیں وہ آہستہ سے دروازہ دھکیل کر کمرے میں آیا کمرے میں اندھیرا تھا۔ میراں اماں شاید سو چکی تھیں۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گیا آنکھیں بند کرتے ہی جیسے یسل کا تصور چھم سے آنکھوں کی پتلیوں میں اتر آیا۔

ڈری سہمی شاپ پر کھڑی۔

باپ کے ڈر سے خوفزدہ ہو کر بھاگتی ہوئی۔ اس کے ساتھ مروان کی باتیں کرتی ہوئی یسل کو سوچتے سوچتے یکدم اس کا خیال اسلام آباد کے اس سانحے کی طرف چلا گیا۔ وہاں عبداللہ کے گھر میں ہر فرد کی زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔

اس کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ لوگ رو پڑتے تھے۔

"وہ سب وہاں پڑھنے آئی تھیں انکل عبداللہ کی بیٹی نے اسے روتے ہوئے بتایا تھا۔ ان میں سے کئی تو بہت معصوم تھیں بہت کم عمر آٹھ نو اور دس سال کی۔ آپ نے ٹی وی پر دیکھا ہوگا۔

"وہ کیا کہتا...... اس نے تو ٹی وی دیکھنا اور اخبار پڑھنا چھوڑ رکھا تھا...... لیکن وہ اس سانحے سے بے خبر تو نہ تھا اس کی بازگشت تو پورے ملک میں سنائی دے رہی تھی ہر دل پر ضرب پڑی تھی ہر آنکھ اشکبار تھی۔

وہ یہ سب سوچتے ہوئے جانے کب سویا تھا کہ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی میراں اماں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی فجر کی قضا ادا کی اور باہر تخت پر آ بیٹھا۔ میراں اماں ناشتہ وہاں ہی لے آئی تھیں۔

"وہ...... یسل نے کچھ بتایا تھا وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ کچھ اتا پتا فون نمبر وغیرہ۔

چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے جھجکتے ہوئے میراں اماں سے پوچھا۔

"نہیں جلدی میں تھی۔ مجھے بھی خیال نہیں رہا میراں اماں نے نظریں چرائیں۔

اس کی چمکتی آنکھیں یکدم ماندی پڑ گئیں تو بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا کہہ رہی تھی آؤں گی ملنے اماں کو ساتھ لے کر چکر لگایا کروں گی۔

اس کی مانند ہوتی آنکھیں پھر چمک اٹھی تھیں میراں اماں نے امید کی ایک شمع اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ پھر بھی وہ دل گرفتہ سا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی وہاں عبداللہ کی وائف نے اسے شادی کے لیے کہا تھا۔ نوشیرواں بھائی اب آپ کو شادی کر لینا چاہیے۔

عبداللہ اس کا اچھا دوست تھا انھوں نے میٹرک اور ایف ایس سی اکٹھا ایک ہی کالج سے کیا تھا۔ اور وہ جب بھی راولپنڈی اسلام آباد آتا اسی کے پاس ٹھہرتا تھا۔ اور یہی بات بریگیڈیئر مصطفیٰ نے بھی کہی تھی۔ ''نوشیرواں تمھیں اس وقت کسی کی رفاقت کی ضرورت ہے۔ تمہارے ساتھ جو سانحہ ہوا وہ یقیناً بہت بڑا ہے اس پر گل کی گمشدگی تم ہر بار مجھے پہلے سے زیادہ کمزور اور ڈسٹرب لگتے ہو تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔ دوسراہٹ ملے گی۔ کوئی دکھ بٹانے والا ہوگا تو کہو تو تمہاری بھابی سے بات کروں۔

''نہیں ابھی نہیں''

اسے سیمل کا خیال آیا تھا اور پھر راولپنڈی سے لاہور تک کے سفر میں وہ مسلسل سیمل کے متعلق سوچتا رہا تھا کہ وہ جا کر سیمل سے سب کچھ کہہ دے گا۔

اپنی بے چینی و بے قراری

اپنے احساسات عمر بھر کے لیے اس کی رفاقت کی چاہ اور اپنی محبت کا اعتراف

لیکن کبھی کبھی وقت انسان کے ساتھ کیسا مذاق کر جاتا ہے۔ میراں اماں نے اس کے ہاتھ میں آس کا دیا تھما تو دیا تھا لیکن مایوسی ہر روز بڑھتی جا رہی تھی۔ کتنے سارے دن گزر گئے تھے۔ وہ پلٹ کر نہ آئی تھی۔ آتی تو میراں اماں ضرور بتائیں وہ جب بھی آ کر سوالیہ نظروں سے میراں اماں کی طرف دیکھتا تو نظریں چرا لیتیں۔ وہ اتنی بے مرت تو نہ تھی کہ اتنی جلدی سب کو بھول گئی۔ حمنہ تو اس کی بہت اچھی دوست تھی دکھ درد کی ساتھی۔ اس نے بتایا تھا کہ حمنہ اور اس کے گھر والوں نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ یقیناً ان سے ملنے آتی ہوگی کئی بار اس کا جی چاہا وہ حمنہ کے گھر جائے۔ حمنہ سے پوچھے لیکن حمنہ لڑکی تھی اور پردہ کرتی تھی۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا تب ایک روز دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بظاہر سرسری انداز میں میراں اماں سے کہا تھا۔

''حمنہ کو سیمل کے گھر کا پتا ہوگا۔ آپ حمنہ سے پوچھ لیں تو کسی روز آپ کو ملانے لے چلوں گا۔

''نہیں حمنہ سے پوچھا تھا میں نے اسے نہیں معلوم

''اچھا''

اسے حیرت ہوئی تھی۔

''کمال ہے''

وہ میراں اماں کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ اس کا دل نہیں مان رہا تھا یہ بات۔

میراں اماں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں۔

اس کا باپ بہت بڑا آدمی ہے یہ بڑی سی گاڑی تھی اس کی شیری بچہ...... دو تین ملازم آئے تھے سامان پیک کرنے اور لے جانے کو۔

میراں اماں پتا نہیں اسے کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ جو وہ سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

''کیا پتا اس کے ابا نے منع کر دیا ہو اسے پسند نہ ہو...... کچھ لوگ ہوتے ہیں نا جو اپنے ہی سٹیٹس کے لوگوں سے میل جول رکھنا پسند کرتے ہیں۔

میراں اماں نے وضاحت کی تھی لیکن وہ وضاحت کرتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں ہو سکتا ہے''

اس نے سوچا تھا۔

''اور ممکن ہے اس نے انہیں یہاں سے لے جانے کے لیے سب ڈرامہ کیا ہو۔ معافی مانگنے کا شرمندہ ہونے کا۔

اس کا دل سیمل کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔

وہ ڈری سہمی خوفزدہ سی سیمل اب کیسے رہتی ہوگی اس گھر میں۔

اب جبکہ مروان بھی نہیں تھا۔ وہ کتنی تنہا ہوگی۔ کتنی اکیلی۔ اماں تو۔ نہیں مجھے اس کے متعلق کچھ غلط نہیں سوچنا چاہیے۔

وہ بہت خوش ہوگی اور خوشی میں اسے غم کے ساتھ بھول گئے ہوں گے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ ایک بار وہ سیمل سے اپنے جذبوں کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے بے حد بے حساب محبت کرنے لگا ہے لیکن سیمل نہیں تھی۔

اور یہ اگست 2007 کا اینڈ تھا جب مالک مکان نے گھر خالی کرنے کو کہا تھا۔ اس نے سیمل وغیرہ کے جانے کے بعد دوسرا حصہ کرائے پر نہیں چڑھایا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ یہ گھر فروخت کرنا چاہتا تھا اور اب یہ گھر فروخت ہو گیا تھا اور انہیں ایک ماہ کے اندر اندر یہ گھر خالی کرنا تھا۔ اس نے اپنے آفس کے قریب ہی ایک گھر لے لیا تھا سیمل شاید کبھی اماں جان سے ملنے

آئے یا حمنہ سے ایک آس تھی لیکن اب اگر وہ آئی تھی تو آس کا دیا ٹمٹمانے لگا تھا۔

لیکن وہ اسے بجھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

کئی بار وہ شاپ پر گیا تھا۔ شاید کبھی وہاں وہ کھڑی نظر آجائے۔

لیکن پھر اسے خود ہی اپنی حماقت پر ہنسی آئی۔

اب بھلا اسے شاپ پر کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کئی بار اس نے بلاوجہ ہی سمن آباد کے چکر لگائے تھے لیکن وہ نظر نہیں آتی تھی۔ کہیں بھی نظر نہیں آئی تھی۔

ایسی بے مروت تو نہ تھی وہ وہ تو بہت محبت کرنے والی تھی۔ کہیں اس کے ابا نے اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ پھر بھی اس کا دل کہتا تھا وہ ایسی نہ تھی اتنی بے مروت اتنی بے لحاظ۔

☆☆☆

اور وہ واقعی ایسی نہ تھی۔ وہ کبھی بھی اپنے دکھ کے ساتھیوں کو نہیں بھول سکتی تھی جنہوں نے آٹھ سال اس کا ساتھ دیا تھا۔ جو رومی کے جانے کے بعد اس کے لیے چھاؤں بن گئے تھے۔ جنہوں نے اس کے آنسو پونچھے تھے جو اس کے ساتھ مل کر روئے تھے۔ وہ مہینے میں ایک یا دو چکر ضرور سمن آباد کے لگاتی تھی۔ کبھی اماں کے ساتھ کبھی اکیلے سب سے مل کر پھر وہ بہت سارا وقت حمنہ کے ساتھ گزار کر آجاتی تھی میراں اماں سے بھی دو بار ملاقات ہوئی تھی وہ کتنی ہی دیر ان کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ لیکن دونوں بار ہی اس کی نوشیرواں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔

دونوں بار ہی اماں نے بتایا تھا کہ وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے نہیں تو وہ اس کا انتظار کر لیتی وہ نوشیرواں سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ اسے ابا کے متعلق بتانا چاہتی تھی کہ وہ کتنا بدل گئے ہیں۔ کس طرح اس کا اور اماں کا خیال رکھ رہے ہیں۔ اور اماں پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں۔ ہاں کبھی کبھی وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتی ہیں۔ ساکت اور الجھی الجھی سی۔ لیکن ان کی آنکھوں میں خالی پن نہیں ہوتا بس وہ کہیں گم ہو جاتی ہیں۔ کسی سوچ، کسی خیال میں گم، وہ نوشیرواں کو بتانا چاہتی تھی کہ ابا نے بہت بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا ہے۔ سب ان کی اس Improvement سے مطمئن ہیں۔ دو دفعہ اماں کے لیے ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھ چکا ہے سب کا خیال ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مزید بہتری آئے گی وہ نوشیرواں کو یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ وہ اسے مس کر رہی ہے۔

لیکن نوشیرواں اسے نہیں ملا تھا اور تیسری بار جب وہ آئی تھی تو میراں اماں وہاں سے

جا چکی تھی اور حمنہ، آمنہ آپا، حیدر کی بیوی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے کہاں گھر لیا ہے۔

"کم از کم میراں اماں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا" اسے بے حد دکھ ہوا تھا۔

یہاں سب ان سے کتنی محبت کرتے تھے۔ کم از کم حیدر کی بیوی کو تو پتا ہونا چاہیے تھا لیکن وہ بھی لاعلم تھی۔ اور اب شاید کبھی وہ دوبارہ نوشیرواں سے نہیں مل سکے گی۔

اس روز وہ سمن آباد سے واپس آئی تو بہت اداس تھی۔ اس نے لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے اماں کے ساتھ باتیں کرتے اور کچن میں کھانا بنواتے ہوئے نوشیرواں کے ساتھ پہلی ملاقات سے لیکر اب تک کی ہر ملاقات کو نہ جانے کتنی بار سوچ ڈالا تھا۔ نوشیرواں اور میراں اماں کتنے دکھوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ اس سے ایک رومی کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں اس گھر میں آکر تو وہ اسے بہت یاد آتا تھا۔ قدم قدم پر اسکی یادیں بکھری تھیں۔ جب وہ ابا کے ڈر سے سیڑھیوں کے نیچے چھپتی تھی اور جب وہ ریلنگ کے پیچھے چھپ کر ابا اور اماں کو لڑتے دیکھتی تھی اور رومی اسے بازوؤں میں چھپا لیتا تھا اور اسے کہانیاں سناتا تھا۔

نیلی کے ہوم سویٹ ہوم کی روزلی اور اس کے بھائی رچ کی اے کاش گل انہیں مل جائے اچانک اور اے کاش وہ نوشیرواں کے دکھ بانٹ سکے

یہ خواہش اچانک ہی دل کی زمین پر اگ آئی تھی ایک لمحہ کو وہ ششدر رہ گئی۔

نہیں کیا وہ نوشیرواں کی رفاقت کی خواہاں ہے...... کیا وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے۔

"نہیں یہ بھلا کیسے ممکن ہے"

اس نے خود ہی خود کو جھٹلایا۔ بھلا نوشیرواں مجھ سے...... اور اس رات جب وہ بیڈ پر لیٹی تو اسے لگا جیسے وہ نوشیرواں سے محبت کرنے لگی ہے اگر یہ محبت ہے تو وہ اس محبت کو پانے سے پہلے ہی کھو چکی ہے۔ اس نے خود سے اعتراف کیا اور پھر کتنے ہی آنسو آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہو گئے۔ کیا بسمل خان کی زندگی میں ہمیشہ ادھوری خوشیاں آتی رہیں گی۔ رومی تھا تو ابا نہیں تھے اور اب ابا ہیں تو رومی نہیں ہے اور...... اور...... نوشیرواں بھی نہیں ہے۔

اور پھر بہت سارے دن گزر گئے وہ انتظار کرتی رہی شاید کبھی میراں اماں کا فون آجائے شاید کبھی وہ ملنے آجائیں۔ ان کے پاس اسکا نمبر تھا تو...... وہ اسے فون تو کر سکتی تھیں پھر...... ہو سکتا ہے گل مل گیا ہو۔

وہ گل کے ساتھ اپنے علاقے میں واپس چلے گئے ہوں...... لیکن آس کی ڈور تھی کہ

ٹوٹتی ہی نہ تھی......وہ جب سمن آباد جاتی حمنہ سے میراں اماں کے متعلق ضرور پوچھتی۔ وہ ہوتیں تو ضرور آتیں کبھی نہ کبھی۔

حمنہ نے ایک بار کہا......کیا مطلب وہ کانپ گئی۔ وہ ایسا کچھ سوچنا نہ چاہتی تھی۔ حمنہ کے گھر سے آکر وہ کئی دن تک اپ سیٹ رہی۔ ایک روز اس نے ایک جگہ ''فوجی فاؤنڈیشن'' کا بورڈ دیکھا تھا تو کتنی ہی دیر تک گاڑی ایک طرف پارک کروائے وہ ادھر دیکھتی رہی۔ کیا پتا یہاں ہی کہیں نوشیرواں کا دفتر ہو اور وہ ادھر جاتا یا وہاں سے آتا دکھائی دے جائے۔

پھر خود ہی اپنی بیوقوفی پر ہنسی آ گئی تھی اور اس نے ڈرائیور سے گھر چلنے کو کہا تھا گھر آ کر وہ بہت دیر تک رومی کے کمرے میں بیٹھی رہی......رومی کی کتابیں دیکھتے ہوئے اسے حامد چاچا بھی یاد آئے تھے......حامد چاچا جوان کے لیے قیمتی اور اچھی کتابیں چھانٹ کر رکھتے تھے۔ اس نے سوچا تھا۔ پتا نہیں وہ اب بھی وہاں اس بڑی کپڑوں کی دکان کے باہر کتابیں بیچتے ہوں گے یا نہیں۔ شاید ان کا پڑھا لکھا بیٹا اب کسی اچھی پوسٹ پر ہو اور انھوں نے کام چھوڑ دیا ہو لیکن ایک بار وہ ضرور انارکلی جا کر دیکھے گی کیا پتا وہ اب بھی وہاں بیٹھتے ہوں۔ اور ان کا بیٹا اب بھی اچھی سی جاب ڈھونڈتا ہو۔

پیپرز کے بعد وہ فارغ تھی۔ وہ کتابیں پڑھتی کچن میں نئی نئی ڈشز بناتی اور ابا اماں کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ ابا اب بھی بہت شاندار لگتے تھے۔ ان کے سیاہ بالوں میں گرے بالوں کی آمیزش نے انہیں بہت سوبر بنا دیا تھا اور اماں تو بالکل ویسے ہی لگنے لگی تھیں بارہ تیرہ سال پہلے والی۔ وقت جیسے انہیں چھوئے بغیر گزر گیا تھا۔ ان کے گھنے سیاہ بال اب بھی اتنے ہی لمبے اور چمکیلے تھے۔

ان کا سراپا اب بھی اتنا ہی نازک تھا۔ جب وہ نفیس کپڑے زیب تن کیے ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ نفیس جیولری پہنے ابا کے ساتھ کھڑی ہوتیں تو ابا بڑے فخر سے انہیں دیکھتے تھے۔ وہ اب بھی پہلے جیسی ہی کم گو تھیں۔ لیکن ابا انہیں بولنے پر اکساتے تھے۔ کبھی وہ بے بسی سے انہیں دیکھتیں۔ اور کبھی ان کی باتوں کا جواب دیئے جاتیں۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے ایک کے بعد ایک دن۔ دن بھر کی مصروفیت کے بعد جب وہ رات کو سونے کے لیے لیٹتی تو اس کا دل بھرا ہوتا۔ جی چاہتا کہ چپکے چپکے روتی رہے۔ دل کو جیسے کوئی ہولے ہولے مٹھیوں میں بھینچتا رہتا اسے رومی کے علاوہ نوشیرواں بھی بے طرح یاد آتا تھا۔

اس رات اس نے رومی کو بڑے دنوں بعد خواب میں دیکھا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اور نہ

جانے کس بات پر ہنس رہا تھا وہ دونوں انارکلی میں حامد چاچا کی دکان کے پاس کھڑے تھے۔ وہ صبح اٹھی تو اس نے سوچا وہ آج ضرور انارکلی جائے گی اور حامد چاچا سے کتابیں خریدے گی۔ اور انہیں بتائے گی کہ وہ جو اس کا بھائی تھا مروان وہ شہید ہو گیا اس لیے وہ اتنے سارے سال وہاں نہیں آئی۔

دسمبر شروع ہو چکا تھا اور اس سال بھی لاہور میں ٹھیک ٹھاک ٹھنڈ تھی۔ اس کا بستر سے نکلنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ سارا دن بیڈ پر اوندھی لیٹی کتابیں پڑھتی رہی۔ ناشتہ اس نے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔ اور کھانا کھا کر پھر بستر میں گھس گئی تھی۔ اماں کی اب اسے فکر نہ تھی۔ ابا تھے نا ان کا خیال کرنے کو اور آج تو یوں بھی اتوار تھا۔ ابا گھر پر ہی تھے۔ عصر کے بعد وہ بستر سے نکلی اور تیار ہو کر نیچے آئی۔ اماں لاؤنج میں کھڑی تھیں۔ لائیٹ براؤن اور سیاہ کڑھائی کے امتزاج والے سوٹ کے ساتھ سیاہ ہی نفیس ایمرائیڈری والی شال اوڑھے وہ بہت باوقار لگ رہی تھیں اور ابا بار بار فخر اور مسرت سے انہیں دیکھتے تھے۔

وہ شاید کہیں جا رہے تھے۔

ایک خوشی بھرے احساس کے ساتھ اس نے انہیں دیکھا

''ہم ایک پارٹی میں جا رہے ہیں تم چلو گی'' ابا نے پوچھا تھا۔

''ابا اماں کو ساتھ لے کر کسی پارٹی میں جا رہے تھے۔ اب جبکہ اماں مکمل طور پر نارمل نہ تھیں اور کبھی انہیں اماں کے ساتھ چلتے ہوئے شرمندگی ہوتی تھی۔

احساس تشکر سے اس کی اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''نہیں ابا جی آپ جائیں مجھے کچھ کتابیں خریدنے اردو بازار جانا ہے۔''

تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گی گڑیا۔ اماں پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں''

وہ مسکرا دی

''ڈرائیور لے جانا بیٹا ادھر رش ہوتا ہے۔ خود مت ڈرائیو کرنا۔

''جی''

اب ابا مسکرا کر اماں کو دیکھ رہے تھے۔

''ہم بھی چلیں''

انھوں نے اپنا ہاتھ اماں کی طرف بڑھایا تھا اس کا ہاتھ تھامنے کو۔

اس سب کے لیے وہ کتنا ترسی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں والی نمی کو انگلیوں کی پوروں سے پونچھا۔ اور انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر آ گئی۔ پورچ میں دونوں گاڑیاں کھڑی تھیں۔

جب وہ یہاں سے گئے تھے تب بھی یہاں دونوں گاڑیاں ہوتی تھیں۔ ایک گاڑی گھر کے لیے تھی اور دوسری ابا کے ذاتی استعمال کے لیے تھی۔ ڈرائیونگ اسے رومی نے سکھائی تھی۔ لیکن رومی کے ساتھ ہونے کے باوجود وہ مین روڈ پر خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ لیکن اب ابا کے ساتھ اس نے چند بار پریکٹس کی تھی اور ابا کے دیئے اعتماد کے سہارے وہ اب کئی بار اکیلی ہی گاڑی لے کر حمنہ سے ملنے چلی گئی تھی۔

اس نے ڈرائیور سے انار کلی چلنے کو کہا تھا۔ دسمبر کا مہینہ دن اتنے چھوٹے تھے ابھی رات ہو جاتی تھی۔

اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کپڑوں کی دکان کے سامنے تختے پر کتابیں سجائے حامد چاچا ہی بیٹھے تھے۔ ویسے ہی صاف شفاف دھلے ہوئے سفید کپڑے اور سفید پگڑی باندھے وہ کتابیں ادھر ادھر کر رہے تھے۔ شاید گاہکوں نے ان کی ترتیب خراب کر دی تھی۔ آج بھی انھوں نے آنکھوں میں سرمہ لگایا ہوا تھا۔ یسمل کو وہ کچھ کمزور سے لگے تھے۔ ان کے بالوں میں بھی سفیدی زیادہ ہو گئی تھی داڑھی تو بالکل سفید تھی۔

"چاچا جی"

وہ ان کے سامنے زمین پر ہی دوزانو بیٹھ گئی تھی۔

"میں"

حامد چاچا نے ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک طرف رکھ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے ان کی سرمہ لگی آنکھیں بے حد روشن تھیں اور پیشانی پر سجدوں کا نشان چمکتا تھا۔ انھوں نے بنا کچھ کہے مڑ کر اپنے پیچھے رکھے کارٹن سے کچھ کتابیں نکال کر اس کے سامنے رکھی تھیں۔

"یہ میں تمہارے لیے رکھتا رہا"

"میرے لیے"

اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

آخری بار جب وہ آئی تھی تو جنوری 1999ء تھا اور اب 2007ء رخصت ہو رہا تھا۔

آٹھ سالوں بعد وہ اسے یوں کتابیں نکال کر دکھا رہے تھے جیسے وہ ابھی کل ہی تو آئی تھی۔

آپ نے مجھے پہچان لیا۔ آپ کو یقین تھا کہ میں کسی دن آؤں گی اور مروان۔

"مجھے انتظار تھا"

وہ ہمیشہ ہی مختصر بات کرتے تھے

"لیکن مروان تو......"

اس نے بتانا چاہا

اللہ کی امانت تھی۔

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"کیا وہ کوئی بزرگ ہیں کوئی ولی"

میں نے اخبار میں پڑھا تھا اور اس کی تصویر دیکھی تھی۔

"پھر بھی آپ کو انتظار تھا میں کسی روز آؤں گی کتابیں لینے"

وہ مسکرا کر ایک اور کتاب نکالنے لگے۔

"آپ نے جتنی بھی کتابیں ہمارے لیے رکھی ہیں انکا بل بنا دیں"

وہ عقیدت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

میں ڈرائیور کو بھجواتی ہوں وہ لے جاتا ہے سب۔ وہ کارٹن سے کتابیں نکال کر تختے پر رکھنے لگے۔

"آپ دیکھ لیں ان میں سے کون کون سی"

"سب......سب چاچا جی وہ سب جو آپ نے ہمارے لیے رکھی ہیں۔"

وہ کھڑی ہو گئی اور اس نے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔

سامنے روڈ پر جو کوئی بھی جا رہا تھا وہ چلتے ہوئے ایک پاؤں پر زور دے کر چلتا تھا اور اس کا دراز قد دور سے بھی اسے نمایاں کر رہا تھا۔ آس پاس چلتے سب لوگوں میں وہ یکدم روڈ کی طرف تیز تیز چلنے لگی۔ وہ کہیں لوگوں کے ہجوم میں گم نہ ہو جائے وہ تقریباً بھاگنے لگی تھی۔ آس پاس کئی لوگوں نے حیرت سے اسے دیکھا لیکن وہ بھاگتی رہی۔ جب اس کے قدم نوشیرواں کے قدموں کے برابر پہنچے تھے تو اس کا سانس پھول رہا تھا۔ نوشیراں نے یکدم پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

"یسمل"

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے پھر یسمل کی نظریں جھک گئیں

یوں بھی کوئی کرتا ہے یسمل ایسے

نوشیرواں کے لبوں پر بے اختیار شکوہ آیا تھا۔ نہ کوئی پتا، نہ کوئی نشان، میں نے ان پانچ ماہ میں کتنا تلاشا تمہیں۔"

اور یہی بات میں کہوں تو...... میں تو میراں اماں سے مل کر بتا کر آئی تھی سب، فون نمبر، ایڈریس سب کچھ ہی تو دیا تھا میں بعد میں بھی دو بار ملنے بھی گئی تھی۔ کتنا انتظار رہا کہ آپ میراں اماں کو لے کر اماں ابا سے ملنے آئیں گے۔

سیمل کے لبوں پر شکوہ آیا تو ایک لمحے کی حیرت کے بعد نوشیرواں نے جان لیا کہ میراں اماں نے اسے نارسائی کے دکھ سے بچانا چاہا تھا۔

لیکن وہ نہیں جانتی تھیں یہ سب اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے ان پانچ ماہ کی ہر صبح اور ہر رات میں اس نے خود سے اعتراف کیا تھا کہ وہ سیمل حبیب خان کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو چکا ہے۔

"میں نے تمہیں بہت مس کیا سیم"

وہ دونوں اب واپس جا رہے تھے

"اور میں نے بھی"

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سیمل نے اعتراف کیا

"اور میں مجھے لگتا ہے کہ"

اس نے دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے کان کی لو کو مروڑا

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے"

I am fell in love with you semal

"میں یعنی نوشیرواں عادل...... میرے ذہن میں یہ کبھی نہیں تھا کہ میں کبھی اسطرح بھرے بازار میں لوگوں کے ہجوم میں بھاگتے ہوئے تم سے اظہار محبت کروں گا۔

میں نے تو سوچا تھا سیمل کسی روز بڑے خوبصورت انداز میں تمہارے سامنے ایک گھٹنا موڑ کر بیٹھتے ہوئے قدیم رومن انداز میں تمہیں گلابوں کا گچھا پیش کر کے کہوں گا۔

"سیمل میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میری محبت کو قبول کر لو"

وہ ہولے سے ہنسا

"لیکن......اور میں نے اس محبت کو قبول کیا۔

چلتے چلتے رک کر سیمل نے اس کی طرف دیکھا نوشیرواں بھی رک کر اسے دیکھنے لگا تھا

مبہوت سا ہو کر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے پھر سیمل کی نظریں جھک گئیں۔

"کلپ، سوئیاں بٹن"

کسی ہاکر نے آواز لگائی تو نوشیرواں چونکا کمال ہے

اب وہ دونوں پھر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ محبت کا اس طرح سر بازار اظہار بھی اتنا برا نہیں ہے۔

وہ پھر ہنسا تھا۔

لیکن کاش ہم کہیں تنہا ہوتے تو اس اظہار قبولیت پر......

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی وہ حامد چاچا کے تختے (پھٹے) کے پاس کھڑے تھے۔ حامد چاچا نے دس بارہ کتابوں کا ایک بنڈل سا بنا دیا تھا۔ چاچا جی یہ میجر نوشیرواں ہیں۔ مردان کے ساتھ ہی تھے کارگل محاذ پر۔ حامد چاچا مسکرائے تھے۔

میں ان پانچ ماہ میں کئی بار یہاں آیا ہوں۔

نوشیرواں مسکرایا تھا۔

کہاں کہاں نہیں تلاشا تمہیں اور پتا ہے جب بھی میں نے چاچا سے پوچھا۔ وہ نہیں آئی کتابیں لینے چاچا نے کہا وہ آئے گی......لیکن سیمل مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ تم سے میری ملاقات یہاں ہی ہو گی۔

"آپ کے بیٹے چاچا جی"

بل ادا کرتے ہوئے سیمل کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔ انہیں کوئی اچھی جاب ملی اپنے مطلب کی۔

جس کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔

حامد چاچا جواب دیکر کتابیں ترتیب سے رکھنے لگے تھے اور نوشیرواں کے ساتھ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے سیمل سوچ رہی تھی۔

حامد چاچا اشفاق احمد کے بابے نہیں ہیں لیکن ان میں اشفاق احمد کے بابوں جیسا کچھ ضرور ہے۔

☆☆☆

میرا دل نہیں مانتا مینا

"بلاشبہ نوشیرواں اچھا لڑکا ہے اس کی والدہ بھی بہت اچھی ہیں ...... بہت محبت

کرنے والی۔ وہ یقیناً ہماری یسل کو بہت اچھی طرح رکھیں گے لیکن ایک تو دونوں میں Age Difference بہت ہے۔ تقریباً گیارہ سال کا فرق ہے۔ نوشیرواں ہمارے رومی کا ہی ہم عمر تو ہے۔

اور کچن سے باہر لاؤنج میں آتی یسل وہاں ہی رک گئی ابا دائیں طرف صوفے پر بیٹھے تھے اور اماں بالکل سامنے بیٹھی تپائی پر ٹوکری اور باؤل رکھے مٹر چھیل رہی تھیں ایک بہت پرانا منظر یسل کی آنکھوں کے سامنے آ کر گزر گیا جب اماں لاؤنج میں بیٹھ کر کوئی سبزی کاٹتیں یا ایسا ہی کوئی کام کرتی تھیں تو ابا کا عتاب اماں پر ٹوٹتا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لیکر دروازے سے جھانکا ابا کچھ افسردہ اور پریشان سے بیٹھے تھے۔

میں عمر کے فرق کو نظر انداز بھی کر دوں بیٹا لیکن ماحول کے فرق کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ذات، برادری، امیری، غریبی سب نظر انداز کی جا سکتی ہے لیکن وہ تو ایک بالکل مختلف کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ رسم و رواج، ماحول ہر چیز پھر وہ علاقہ اس علاقے کے تو اپنے قانون اپنے رواج ہیں۔

بے شک اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گزارا ہے۔ اب بھی یہاں ہی رہ رہا ہے لیکن اپنی جڑیں، اپنی زمین تو کوئی نہیں چھوڑ سکتا۔

"تم بھی تو کچھ کہو نا بیٹا"

وہ یکدم بولتے بولتے اماں کی طرف دیکھنے لگے تھے کوئی رائے، کوئی مشورہ۔

"میں کیا کہوں"

"انہوں نے سر اٹھا کر بے بسی سے اسے دیکھا۔

"ہاں تم"

انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔

"بیٹا کیا یسل بھی ایسا چاہتی ہے۔ انہوں نے جو دست سوال دراز کیا ہے تو کوئی جواز تو ہوگا نا ان کے پاس:۔

"پتا نہیں"

اماں اب بھی بے بسی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ "تو بیٹا منع کر دو میراں اماں کا فون آئے تو انہیں بتا دینا۔"

اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ پیچھے مڑ کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے یسل نے کاؤنٹر سے ٹیک لگا لی۔

اماں پہلے سے بہت بہتر تھیں۔ وہ بہت سارے کاموں میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔ کچن کا کام، ابا کے کپڑے وغیرہ نکالنا۔ وہ بہت شوق سے کرتی تھیں...... انہیں یہ بھی پتا تھا کہ رومی شہید ہو چکا ہے لیکن شاید وہ ابھی اتنی ٹھیک نہیں تھیں کہ اس کی زندگی کے متعلق کوئی رائے دے سکیں اور وہ ان سے اپنے دل کی بات کر سکے۔ انہیں بتا سکے کہ نوشیرواں کی اس کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ وہ نوشیرواں کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔

اور......اور ابا سے بھی وہ یہ بات نہیں کر سکتی۔ ابا کیا سوچیں گے کہ میں......

اور ابا تو پہلے ہی رومی بھائی سے کہتے تھے...... وہ بدل گئے ہیں...... لیکن کیا پتا۔ وہ کیا سوچیں۔

"نہیں...... وہ کبھی بھی ابا سے دل کی بات نہیں کر سکتی اور یکایک اس کا دل ڈوب سا گیا۔

تو کیا میں نوشیرواں کے علاوہ کسی اور......

اور کیا نوشیرواں اس انکار کو برداشت کر لے گا۔

وہ کتنا خوش تھا اس روز اس طرح اچانک مل جانے پر۔

پتا ہے۔ کبھی کبھی میں مایوس ہونے لگتا تھا کہ شاید میرا تمہارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔

پارکنگ کی طرف اس کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

اور اب اس طرح اچانک تم ملی ہو تو یہ خوشی مجھ سے سنبھالی نہیں جا رہی۔ پتا ہے یسل مجھے مدت بعد کوئی خوشی ملی ہے نا۔

اور اس کی زندگی میں تو کوئی خوشی نہیں ہے۔

یسل نے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے لگائے سوچا۔ اور آنسو اس کے اندر گرنے لگے قطرہ قطرہ کر کے اس روز کتابوں کا بنڈل گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے اس نے سیٹ پر پڑے یسل کے موبائل کو دیکھا اور اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے اس نے اپنا نمبر اسے دے دیا تھا۔

میں آؤں گا یسل اماں جان کو لیکر کسی روز ملنے۔

وہ بے حد اشتیاق سے اسے دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"اماں بہت خوش ہوں گی وہ ہمیشہ ہی میراں اماں سے مل کر خوش ہوتی تھیں۔ آپ

ضرور آنا"

"تم منع بھی کرو گی تب بھی آؤں گا سیمل تو سارے راستے اب تمہاری طرف ہی جاتے ہیں"۔

وہ بے حد سرشاری گھر آئی تھی اور اس نے اماں کو نوشیرواں کے متعلق بتایا تھا اور یہ بھی کہ کسی روز میراں اماں ان سے ملنے آئیں گی اور پھر وہ سچ مچ ہی دوسرے دن میراں اماں کے ساتھ وہ آ گیا تھا۔ ابا اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور بہت دیر تک اس سے رومی کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اس سے رومی کی باتیں کرتے ہوئے کئی بار ابا کی آنکھیں بھر آئی تھیں......وہ رومی کے آخری لمحوں میں اس کے ساتھ تھا۔ اس سے رومی کے آخری لمحوں کے متعلق جاننا ابا کو اچھا لگا تھا اور ابا نے اس سے پھر بھی آتے رہنے کو کہا تھا اور اس کے جانے کے بعد بھی ابا بہت دیر تک اس کے متعلق باتیں کرتے رہے تھے اور اس کے خاندان کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی پر وہ بے حد دکھی ہوئے تھے اور اس رات جب وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نئی کتابیں دیکھ رہی تھی تو تکیے کے پاس پڑا اس کا موبائل بج اٹھا اس نے چونک کر فون اٹھایا دوسری طرف نوشیرواں تھا اور اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔

"ابھی چار گھنٹے پہلے تو آپ یہاں سے گئے ہیں اور میں خیریت سے تھی۔"

نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ مسکرائی تھی۔

"سیمل کبھی کبھی کوئی شخص اتنا اہم کیوں ہو جاتا ہے کہ زندگی اس کے بغیر ادھوری لگنے لگتی ہے۔"

"مجھے بھی تمہارے بغیر اپنی زندگی ادھوری لگنے لگی ہے۔"

سیمل خاموش رہی تھی وہ کیا کہتی اسے تو خود یوں ہی لگتا تھا جیسے نوشیرواں اس کی زندگی کا ہی حصہ ہو۔ پچھلے چند ماہ وہ نہیں تھا تو اسے اپنی زندگی نامکمل لگتی تھی۔ ادھوری اور ویران سی۔

سنو سیمل کیا میں تمہیں پرپوز کر سکتا ہوں۔

یہ ہے تو آکورڈ سا نا تمہیں اس طرح یوں رات کے اس پہر پروپوز کرنا۔ لیکن سیمل۔ وہ ہنسا۔

انار کلی کے ہجوم میں تم سے اظہار محبت کرنا اور اب اس وقت پروپوز کرنا ہے تو کچھ عجیب سا......لیکن یار کیا کروں۔ ابھی اسی وقت چند لمحے پہلے مجھے خیال آیا ہے کہ مجھے تمہیں پروپوز کر دینا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور......اور میں خالی ہاتھ تہی داماں رہ جاؤں۔ میں اتنے

رشتے کھو چکا ہوں کہ اب مجھ میں کوئی اور رشتہ کھونے کی سکت نہیں ہے۔ بتاؤ نا سیمل میں صبح اماں جان کو بھیج دوں۔

"لیکن اتنی جلدی"

وہ اپ سیٹ ہو گئی۔

"میں نے تو ابھی اما ابا کی محبتوں کو صحیح طرح سے محسوس بھی نہیں کیا۔ میں ابھی انہیں انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی اماں اور ابا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں نے پہلی بار جانا ہے کہ باپ کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی میں ابا کے ساتھ رہی ہوں اتنے سارے سال لیکن تب وہ اجنبی لگتے تھے۔ اب پہلی بار مجھے لگا ہے وہ میرے ابا ہیں۔ پھر ابھی اماں کو ابا کو دونوں کو میری ضرورت ہے۔

"تو"

وہ یکدم Relax ہو گیا تھا۔

میں کب کہہ رہا ہوں سیمل کہ تم ابھی آج ہی رخصت ہو کر میرے ساتھ آ جاؤ۔ میں تو بس اپنے اس سہمے ہوئے خوفزدہ دل کے یقین کا کوئی سامان کرنا چاہتا ہوں جو ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں بے خبری میں تمہیں میں کھو نہ دوں۔ بس ایک بار مجھے یقین ہو جائے کہ تم میری ہو تو پھر جب تم نے چاہا جب تم نے کہا......اس دوران میں علاقے میں اپنی زمین، جائیداد وغیرہ فروخت کر کے یہاں اچھا سا گھر لے لوں گا تمہارے لائق......کیا پتا تب تک گل بھی آ جائے......تو پھر میں اماں کو بھیج دوں نا۔"

اور اس نے اثبات میں جواب دے دیا تھا۔ اور پھر کل ہی تو نوشیرواں میراں اماں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا اور میراں اماں نے ابا کے سامنے اپنا مدعا بیان کر کے انہیں سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا اور آج ابا نے فیصلہ سنا دیا تھا وہ سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس نے کاؤنٹر پر پڑے چائے کے کپ کو دیکھا چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے رگڑ ڈالا۔

یہ صرف نوشیرواں کی خواہش تو نہیں تھی وہ خود بھی تو نوشیرواں کے سنگ ہی زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن یہ بات وہ ابا سے نہیں کہہ سکتی تھی کبھی بھی نہیں۔ وہ ابا کو یہ موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ کہیں کہ ان سے الگ ہو کر تنہا رومی نے اور اماں نے اس کی صحیح تربیت نہیں کی اور پھر رومی کی وجہ سے ابا کتنے بکھر گئے ہیں میں اپنی طرف سے انہیں دکھی نہیں کر سکتی۔ میں نوشیرواں

کے لیے اور اپنے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتی...... میں...... یکدم اندر گرتے آنسو باہر آنے کو بیتاب ہونے لگے تو وہ کچن کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ ابا کہیں جاچکے تھے اور اماں مٹروں کی ٹوکری سامنے رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ آہٹ پر انھوں نے سیمل کی طرف دیکھا تو سیمل ان سے نظریں چرائے تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی

☆☆☆

نوشیرواں میراں اماں کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے لیٹا تھا اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"میں تمھیں اس دکھ سے بچانا چاہتی تھی اس لیے میں نے...... میں جانتا ہوں اماں جان"

یہ بہت مشکل تھا شیری...... میرا بھی جی چاہا تھا کہ سیمل میری بہو بنے...... میرے شیری کی دلہن وہ مجھے بالکل اپنی ذینبیے کی طرح لگتی تھی لیکن میں نے اپنے دل کو سمجھالیا۔

"لیکن میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں اماں جان۔ بند آنکھوں کے پیچھے مچلتے آنسوؤں کو روکتے ہوئے نوشیرواں نے سوچا

"بہت سی چیزیں ہمیں اچھی لگتی ہیں شیری بچہ لیکن ہم انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے"

ہمیں دل مارنا پڑتا ہے۔

"لیکن سیمل چیز تو نہیں ہے اماں جان"

نوشیرواں نے تڑپ کر آنکھیں کھولی تھیں۔

"وہ تو میرے دل کی آرزو ہے"

"سب آرزوئیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔

انھوں نے اس کی بے حد سرخ آنکھوں کو دکھ سے دیکھا۔

"دل تو اکثر لاحاصل چیزوں کی آرزو بھی کرنے لگتا ہے بچے۔

کیوں...... بھلا کیوں ایسی آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں دل میں جنھیں پورا نہیں ہونا ہوتا۔

نوشیرواں نے سوچتے ہوئے پھر آنکھیں موندلی تھیں۔ میراں اماں اس طرح اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں اور ان کی آنکھیں نم ہوجاتی تھیں۔

اگر سیمل اپنے ابا سے کہتی، انہیں اپنی مرضی بتاتی تو کیا وہ اس کے اور نوشیرواں کے متعلق سوچتے ناں۔ لیکن اسنے تو لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

"نہیں میں ابا سے یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"کیوں نہیں کہہ سکتیں سیمل"

نوشیرواں بے حد مضطرب اور بے چین تھا۔

"میں ابا کو دکھ نہیں دینا چاہتی"

اس کی آنکھیں پانیوں سے بھرگئی تھیں اور کیا خود کو دکھ دے لوگی"

نوشیرواں تلخ ہوا تھا۔

وہ صبح صبح ہی ملنے چلی آئی تھی۔ میراں اماں کچن میں تھی اور وہ ٹیبل سے ٹیک لگائے نوشیرواں کے کمرے میں کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ سیمل"

نوشیرواں کو احساس ہوا تھا کہ وہ جب سے آئی ہے کھڑی ہے لیکن سیمل اسی طرح میز سے ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ میراں اماں ملک ہاؤس آئی تھیں تو ابا نے مختلف کلچر اور ماحول کی بات کر کے معذرت کرلی تھی۔ اور میراں اماں کے جانے کے بعد نوشیرواں نے اسے کتنے ہی فون کیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں اٹنڈ نہیں کررہی تھی۔ اس میں نوشیرواں سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اسے سنبھلنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے نوشیرواں سے بات کرلی تو وہ بکھر جائے گی۔ اسے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہے گا۔

"پلیز نوشیرواں میں بات نہیں کرسکتی کل آؤں گی"

اس نے نوشیرواں کو Message کیا تھا۔

سو اب وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم خوش نہیں رہ سکو گی"

ایک بار صرف ایک بار ان سے بات کر کے تو دیکھو۔

"نہیں"

سیمل کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

میں اپنا بھرم نہیں کھوسکتی۔ میں مروان کے لیے ایک بھی منفی بات نہیں سن سکتی۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ ابا کے دل میں یہ خیال تک بھی آئے کہ مروان نے مجھے بہت آزادی دے رکھی تھی۔ پلیز نوشیرواں مجھے معاف کردیں۔ میری ذات آپ کے لیے دکھ کا باعث بنی حالانکہ میں نے تو ہمیشہ آپ کو سکھ دینے کا ہی سوچا تھا۔ میں تو آپ کے غم بانٹنا چاہتی تھی۔ میں تو آپ کے

آنسو پونچھنا اور آپ کے ساتھ مل کر رونا چاہتی تھی لیکن انجانے میں دکھ دے بیٹھی۔

"دکھ"

نوشیرواں کے لبوں پر زخمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"دکھ تو بہت معمولی لفظ ہے لڑکی۔ میرا تو دل ہی خالی ہو گیا ہے"

اور سیمل جو اب تک ضبط کئے بیٹھی تھی یکدم رو پڑی تھی اور نوشیرواں بے بسی سے اسے دیکھتا رہا تھا...... پھر وہ چلی گئی۔ وہ کتنی ہی دیر تک خالی دروازے کو دیکھتا رہا۔ کمرے میں اس کی خوشبو رچی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر میراں اماں آگئیں انھوں نے اس کا سر سینے سے لگا کر اس کا سر ہمیشہ کی طرح چوما تھا پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔

"میں اسی دن سے ڈرتی تھی شیری اور مجھے اسی بات کا خوف تھا۔"

نوشیرواں کا دل چاہا تھا وہ میراں اماں کے گلے لگ کر بہت سا رو لے۔

وہ قبائلی بہادر مرد بمشکل اپنے آنسو روک پا رہا تھا۔

دل تو خالی تھا تب سے جب سب نے اکھٹا دوسری دنیا کی راہ لی تھی۔ اور اس خالی دل میں بس ایک آس کا دیا جلتا تھا۔

گل کے ملنے کی آس...... پھر نہ جانے کہاں سے اس خالی دل میں بہاروں کی خوشبو بھر گئی۔ وہ سہمی سہمی خوفزدہ سی لڑکی خالی دل کے دالانوں اور برآمدوں میں آزادی سے گھومنے لگی اور بار بار اسے بہار کا پیام دینے لگی۔

میراں اماں بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں اور وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں کہ بند آنکھوں کے پیچھے آنسو مچلتے تھے اور باہر آنے کو بیتاب ہوتے تھے۔

"شیری تو تو میرا بہادر بچہ ہے۔ فوجی جوان میراں اماں کی انگلیاں اب بھی اس کے بالوں میں تھیں اور ان انگلیوں کا لمس اسے سکون دیتا تھا۔

بہت ساری حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں لیکن انہیں قبول کرنا پڑتا ہے ہمارے قبول نہ کرنے سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔ سیمل بہت پریشان تھی...... بہت رو رہی تھی۔ تمہیں تو اسے حوصلہ دینا چاہیے تھا الٹا خود حوصلہ ہار بیٹھے۔

"بچیاں تو ایسے ہی ہوتی ہیں کمزور نازک دل تو تو بہادر فوجی ہے نا"

"ہاں بہادر فوجی"

اس نے آنکھیں موندے موندے دل میں اعتراف کیا...... اور ہمیں سکھایا گیا ہے کہ ہمیں آخری سانس تک اپنی جنگ لڑنا ہے۔ سیمل نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں لیکن میں ہتھیار نہیں پھینکوں گا...... میں اپنی جنگ خود لڑوں گا آخری سانس اور آخری امید تک اس نے اپنے ہاتھ میراں اماں کے ہاتھوں پر رکھ دیئے اور آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

"اماں جان میں ٹھیک ہوں"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

آپ پلیز جا کر آرام کریں

میراں اماں نے بغور اسے دیکھا ان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

میری جھولی میں صرف تم ہو شیری اور ایک آس ہے بس گل کے ملنے کی آس۔ مجھے تہی دامن مت کرنا شیری بچے۔

میں ایسا کچھ نہیں کرنے والا اماں جان آپ وہم نہ کریں بس کچھ دیر آرام کروں گا۔ وہ ہولے سے ہنسا اور انکا ہاتھ دبایا۔ اوکے اماں جان۔

اسکی آنکھوں میں پہلے کرب کے پیچھے کسی عزم کی جھلک تھی یا پھر میراں اماں کو محسوس ہوئی تھی۔ اور وہ دل ہی دل میں اس کی خوشیوں اور سکون کی دعا کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی آئیں۔ اور بیڈ پر لیٹ کر تکیے پر سر رکھتے ہوئے نوشیرواں نے زیر لب کہا۔

میں ایک سپاہی ہوں اماں جان اور میں زندگی کی آخری سانس تک جنگ لڑوں گا اور اپنی بقا کے لیے اور اس نے آنکھیں موند لیں اور باہر میراں اماں بے وقت ہی نفل پر نفل پڑھے جاتی تھیں۔

اور دعا کرتی تھیں کہ شاید کہیں کوئی در قبولیت کھل جائے اور ان کے شیری کا خالی دل بھر جائے۔

☆☆☆

سیمل نے حسان کو تھپکتے ہوئے نوشیرواں کی طرف دیکھا جس کی نظریں ٹی وی پر تھیں۔ لیکن وہ ٹی وی نہیں دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ"۔

"کچھ نہیں"

ایک افسردہ سی مسکراہٹ نوشیرواں کے لبوں پر نمودار ہوئی اور اس نے تکیے کے پاس

رکھا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے یسل کی طرف دیکھا۔

"حسان سو گیا کیا"

یسل نے سر ہلایا اور گود میں لیٹے حسان کو اٹھ کر کاٹ میں لٹایا۔ اور نوشیرواں کے قریب بیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"کیا کوئی خاص پروگرام نہیں ہے"

نوشیرواں نے نفی میں سر ہلایا اور یسل کی طرف دیکھا۔

ایک اور سال بیت گیا سیم کل نئے سال کی پہلی صبح ہو گی۔

جنوری 2012ء کی صبح لیکن ان بیتے سالوں میں کیا ہوا یسل کچھ بھی تو نہیں بلکہ لگتا ہے ہمارے لیے ہم پاکستانیوں کے لیے زندگی اور مشکل ہو گئی ہے۔

ڈرونز، دہشت گردی، خودکش حملے، ٹارگٹ کلنگ، مہنگائی، کرپشن، لوڈشیڈنگ، ناانصافی، ظلم...... کیا ہو گا اس ملک کا سیم ان بیتے سالوں میں اجتماعی سطح پر کوئی خوشی کی خبر نہ تھی۔

ہاں انفرادی خوشیاں تھیں۔

اس کی زندگی میں یسل شامل ہوئی تھی وہ اپنی جنگ جیت گیا تھا۔

سوائے اپنی آبائی حویلی کے کھنڈرات کے اس نے علاقے میں اپنی ساری زمین بیچ دی تھی اور یہاں اقبال ٹاؤن میں ایک کنال کا گھر خرید لیا تھا۔ وہ اکثر حبیب خان سے ملنے چلا جاتا تھا۔

پھر اس کے بعد راستے آسان ہوتے گئے تھے۔ ایک روز وہ حبیب خان کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

میں مردان نہیں ہوں لیکن آپ مجھے اپنا مردان ہی سمجھیں...... یسل کے لیے آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے اور یسل کو قبول ہو گا۔ یسل آپ کی بیٹی ہے اور آپ اس کے لیے فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ وہ آپ کے کسی بھی فیصلے سے انحراف نہیں کرے گی۔ لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار پھر سوچئے گا ضرور۔ میں نے ہمیشہ کے لیے یہاں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے پھر بھی آپ مجھے یسل کے قابل نہیں سمجھتے تو آپ کو حق ہے مجھے ریجیکٹ کر دیں۔ حبیب خان خاموش رہے تھے۔ اس ایک سال میں وہ ان کے بہت قریب آ گیا تھا۔ وہ اس سے بہت ساری باتیں Share کرنے لگے تھے اس سے بہت سارے معاملات میں مشورہ کرتے تھے وہ اس روحی کی طرح ہی ٹرسٹ کرنے لگتے تھے۔ کبھی بہت سارے دن وہ نہ آتا تو وہ اسے ملنے کو بے چین ہو

جاتے۔ سو انھوں نے نوشیرواں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اور پھر یسل اس کی زندگی میں آ گئی ان خوشیوں کو پائیدار کرنے کے لیے حسان بھی آ گیا اماں بہت بہتر بلکہ ٹھیک تھیں۔ اماں ابا حج بھی کر آئے تھے۔ یہ چھوٹی چھوٹی انفرادی خوشیاں تھیں۔ لیکن...... باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔

وہ بہت دل گرفتہ ہو رہا تھا۔ 2011ء گزر گیا تھا

اور

وہ اب بھی ایک دوسرے کو محسن نقوی کی نظم سناتے تھے۔

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں

کوئی ایسا شہر بساؤں میں

جہاں چاند مائد نہ ہو کبھی

اب بھی ان کے دل میں ایسا شہر بسانے کی خواہش چٹکیاں لیتی تھی۔ جہاں پر سب کچھ نہ ہو۔

یہ نفرتیں، یہ ہلاکتیں، یہ خودکش حملے۔

ایسا شہر، ایسا ملک

جہاں سکون ہو، امن ہو۔

خوشحالی ہو، انصاف ہو اور جہاں لوگ مطمئن اور خوش ہوں۔ بادشاہ عمر کے "beautiful city" (بیوٹی فل سٹی) کی طرح آج چار سال بعد بھی وہ گل کے پلٹ آنے کا انتظار کرتے تھے اور اس کے سلامت لوٹ آنے کی دعائیں کرتے تھے۔ آج بھی گل سے متعلق کہیں کوئی خبر نہیں ملتی تھی۔

میراں اماں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتیں تو پھر کتنی ہی دیر اٹھائے رکھتیں۔ اور آنسو ان کے ہاتھوں کے پیالے میں گرتے رہتے یسل اور نوشیرواں اب بھی کسی نہ کسی اتوار کو انارکلی جاتے اور حامد چاچا نے ان کے لیے اچھی اچھی کتابیں الگ کر کے رکھی ہوتیں اور انارکلی سے واپس آتے ہوئے آج بھی یسل سوچتی تھی۔

حامد چاچا اشفاق احمد کا بابا نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کوئی اچھی اور خوش کن تبدیلی۔

لیکن وہ خواب تو دیکھ سکتے تھے اچھے دنوں کے خواب سو وہ دیکھتے تھے۔

"یسل صبح میں اسلام آباد چلا جاؤں"

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نوشیرواں نے باہر جاتی سیمل سے پوچھا۔

کیوں

سنا ہے لاپتہ افراد کے لواحقین کوئی ریلی نکال رہے ہیں آپ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔

پتا نہیں جانا چاہتا ہوں یا نہیں۔

وہ بے حد تھکا تھکا لگ رہا تھا۔

لیکن سیم تم جانتی ہو نا گل میرے نانا کی نسل کا امین ہے۔

بچ جانے والا میرا واحد رشتہ دار

ہمارے علاقے کے بہت کم افراد لاپتہ ہوئے ہیں...... دو تین یا شاید چار لیکن وہاں اسلام آباد میں جب جب میں گیا مجھے لگا میرا دل یہاں ہی پھٹ کر بہہ جائے گا۔

وہاں ان لاپتہ افراد کے بے شمار لواحقین چھوٹے چھوٹے بچے ہاتھوں میں بینرز اٹھائے جھکے کندھوں اور کمروں والے بوڑھے اور بوڑھیاں...... میں انہیں دیکھنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا ان کے مایوس چہرے، ویران آنکھیں لیکن میں کیا کروں سیمل۔

میں ایسا کوئی موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا وہ ملے نہ ملے میں اس کی ڈور ٹوٹنے نہیں دینا چاہتا اپنے آخری سانسوں تک اور جب میں نہیں رہوں گا تو اپنی یہ آس اپنے بچوں کے دل میں چھوڑ جاؤں گا کہ شاید...... شاید کبھی میرے نانا کی نسل کا امین لوٹ آئے۔ اس نے آہستگی سے کہا اور سیمل کی طرف دیکھا۔

سیم...... مجھے نظم سناؤ اپنی نرم دلکش اور خوبصورت آواز میں۔

جو مروان کو پسند تھی جو گل کو پسند تھی اور جو شاید ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔ میں کچھ دیر کے لیے خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔

سیمل بیٹھ گئی وہ جانتی تھی کہ جب کبھی گل کے آنے کی امید دم توڑنے لگتی تھی تو وہ یونہی نڈھال ہو جاتا تھا۔

ہاں سیم بولو نا۔

اس نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ سیمل نے آہستگی سے نظم سنانا شروع کی تھی۔

میرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی ایسا شہر بساؤں میں

جہاں داغ داغ سحر نہ ہو
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں

سیمل نظم سنا رہی تھی اور اس کی بند آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کا دریا موجزن تھا۔

خمار پلکیں بھیگتی جا رہی تھیں۔

اور لاؤنج میں جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگتی میراں اماں کے آنسوان کے دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کے کٹورے میں گرتے تھے۔

اور نگاہیں آسمانوں پر بھٹکتی تھیں جانے کب در قبولیت کھلتا تھا ...... جانے کب..

رسائی نارسائی

"معاذ!"

میں اسے پکارتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ میرے پاؤں تلے جلتی ہوئی ریت تھی اور میرے پاؤں اس گرم ریت میں دھنس رہے تھے۔ میں بھاگتے بھاگتے کئی بار گری اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"معاذ......!"

میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت سے اسے آواز دی۔ لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گرم ریت میرے پاؤں کو جلا رہی تھی اور معاذ میری نظروں سے اوجھل ہوتے ہوتے ایک نقطے کی طرح نظر آنے لگا۔

"معاذ......!"

میں نے ایک بار پھر جسم کی پوری طاقت سے اسے پکارا اور مجھے لگا جیسے بہت ساری گرم ریت ایک دم اڑ کر میرے حلق میں چلی گئی ہو اور میں گھٹنوں کے بل ریت پر گر گئی۔ لیکن میں نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

"معاذ! میرے لبوں سے سسکی کی طرح نکلا۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ معاذ۔" معاذ میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اب میری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں اس ویران صحرا میں تپتی ریت پر تنہا بیٹھی تھی۔ بے بسی سے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر میں ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ "آبگینے، آبگینے! آنکھیں کھولو۔"

میرے کانوں میں معاذ کی آواز آئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

وہ تھوڑا میری طرف جھکا دائیں ہاتھ سے میرے رخسار تھپتھپا رہا تھا۔ میری نظریں

پہلے اس کے گندمی ہاتھ پر پڑی تھیں۔ خوبصورت آرٹسٹک انگلیوں والا ہاتھ جس پر سنہرے سنہرے روئیں ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ میرا دل چاہا میں اس ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں بھینچ لوں۔ لیکن وہ ہاتھ پیچھے کر کے سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ تب میری نظریں اس کی نظروں سے ملی تھیں۔

سیاہ دلکش آنکھوں میں میرے لیے ترحم تھا، ہمدردی تھی لیکن محبت نہیں تھی۔ شدتِ کرب سے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

محبت، جسے پچھلے تین سالوں سے میں اس کی آنکھوں میں کھوج رہی تھی۔ پھر قالین پر اس کے قدموں یک ہلکی سی چاپ ......اور میری آنکھوں سے گرم سیال نکل کر رخساروں کو بھگونے لگا۔

"آبگینے......!" کچھ دیر بعد اس کی نرم اور دھیمی آواز پر میں نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے گیلے رخساروں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔

"یہ پانی پی لو۔"

میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے لیا اور دو گھونٹ بھر کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ معاذ لمحہ بھر وہیں کھڑا ترحم آمیز نظروں سے مجھے تکتا رہا اور جب بولا تو اس کی آواز ویسی ہی تھی نرم، دھیمی اور روح میں اترتی۔

"سو جاؤ آبگینے! تم شاید خواب میں ڈر گئی تھیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا خواب دیکھا تھا؟"

اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں بالکل سپاٹ تھیں اور ان میں جیسے دور کہیں دھول اڑ رہی تھی۔ ایک بار عالین رضا نے کہا تھا۔

"آبگینے! یہ جو معاذ منیر ہے، جب ہنستا ہے تو اس کی آنکھیں بھی ہنستی ہیں۔ میں نے ایسی ہنستی آنکھیں کسی کی نہیں دیکھیں۔"

اور ان تین سالوں میں کتنی ہی بار میں نے معاذ کو مسکراتے اور ہنستے دیکھا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں اس ہنسی کی روشنی کبھی دکھائی نہیں دی، وہاں تو بس دھول اڑتی رہتی ہے۔

اور میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

یہ اور اس سے ملتے جلتے خواب تو میں پچھلے دو سال سے دیکھ رہی ہوں۔ خود سے دور

جاتا معاذ...... کسی ویرانے کسی صحرا میں مجھے تنہا چھوڑ کر جاتا ہوا معاذ اور اس کے پیچھے بھاگتی گرتی اور پکارتی میں۔ بہت شروع میں ایک دو یا شاید تین بار میں نے اپنا خواب معاذ کو سنایا تھا لیکن معاذ نے خواب پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ کتنا ہی چاہا تھا میرا کہ معاذ مجھے اپنی محبتوں کا یقین دلائے مجھ سے کہے۔ "پاگل ہو آبگینے! میں بھلا تمہیں کبھی چھوڑ کر جا سکتا ہوں" لیکن وہ بس خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔

"پتا نہیں کیا الٹا سیدھا سوچتی رہتی ہو۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا اور میں نے اسے خواب سنانے چھوڑ دیے تھے۔ وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر میرے ہاتھ تھپتھپائے تھے۔

میرا دل آج بھی اس کے ہاتھوں کے لمس سے اسی طرح کانپا تھا جس طرح پہلی بار مہندی کی رات اسٹیج پر کانپا تھا جب وہ دوستوں کے جھرمٹ میں چلتا ہوا اسٹیج پر میرے پاس آ کر بیٹھا تھا اور بیٹھتے ہوئے اس نے ہولے سے صوفے پر میرے ہاتھ کو چھو کر کچھ کہا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس نے کیا کہا تھا لیکن اس کے ہاتھ کے لمس سے میرا دل میرے سینے کے اندر اتنے زور سے دھڑکا تھا کہ مجھے اس کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی اور اسکی آواز کا سحر مجھے مسحور کر رہا تھا۔ دھیمی، نرم اور ٹھہری ہوئی آواز۔

عالین رضا نے صحیح کہا تھا۔

"آبگینے! معاذ کی آواز بہت خوبصورت ہے۔"

"سو جاؤ تم۔" وہ مڑا۔

"آپ......" میرے کانپتے لبوں سے نکلا تھا۔

"میں کچھ مطالعہ کر رہا ہوں۔ لیکن میں یہاں ہی ہوں کمرے میں بے فکر ہو کر سو جاؤ۔"

وہ صوفے کی طرف مڑا۔ میں نے سینٹر ٹیبل پر ادھ جلے سگریٹوں سے بھری ایش ٹرے کو دیکھا۔

وہ جاگ رہا تھا۔ رات کے اڑھائی بجے جاگ کر مطالعہ کر رہا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا اور شادی شدہ زندگی کے ان تین سالوں میں کئی راتیں اس نے یونہی جاگ کر اور سگریٹ پیتے گزاری تھیں۔ بلکہ میں نے تو اپنی سہاگ رات میں بھی اسے یونہی بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے اور جاگتے دیکھا تھا۔ کیا غم ہے معاذ منیر کو؟ آخر کون سا دکھ ہے جو اسے راتوں کو جگاتا ہے۔ ان تین سالوں میں میں نہ جان پائی تھی۔ حالانکہ اچھی بیویوں کی طرح میں نے کئی بار پوچھا تھا۔

"معاذ! آپ پریشان کیوں ہیں۔ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتائیں پلیز میں آپ کی بیوی ہوں۔ مجھے اپنا دوست سمجھ کر مجھ سے اپنا مسئلہ شیئر کریں۔"

"کچھ بھی نہیں ہے یار! میری عادت ہی ایسی ہے۔"

وہ ٹال گیا تھا۔ تب پھر میں نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔

حالانکہ میں جانتی تھی وہ ایسا نہیں ہے۔ عالین نے مجھے بتایا تھا۔

"معاذ بہت ہنس مکھ، بہت شریر۔ جملہ بازی میں ماہر ہے۔ باتوں میں وہ کسی کو جیتنے نہیں دیتا۔" اب پتا نہیں عالین نے مجھے غلط بتایا تھا یا پھر معاذ ہی بدل گیا تھا۔ حالانکہ عالین تو اس کی سگی تایا زاد تھی۔ دونوں کا بچپن اور لڑکپن اکٹھے ہی گزرا تھا۔ ایک ہی گھر میں اور پھر عالین شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ یو اے ای چلی گئی۔ وہ معاذ سے تین سال بڑی تھی لیکن اس نے بتایا تھا کہ اس کے باوجود دونوں میں بڑی دوستی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ دونوں ہی اکلوتے تھے۔

"آبگینے! سو جاؤ۔ صبح پھر جاگنے سے تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔" وہی نرم لہجہ جسے پہلی بار سن کر مجھے لگا تھا جیسے میرے اندر پھول کھل اٹھے ہوں لیکن اب یہی لہجہ میرے اندر گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ میں لیٹ گئی اور میری بند پلکوں تلے گرم گرم آنسو مچلنے لگے۔ کمرے میں سگریٹ کی بو پھیل گئی۔ اس نے سگریٹ جلایا تھا۔ میں آنکھیں کھولے بغیر جانتی تھی اور عالین رضا کہتی تھی۔

"معاذ منیر کو سگریٹ پینے سے نفرت ہے۔" اور عالین کی بتائی ساری ہی باتیں غلط تھیں لیکن میں نے دل ہی دل میں کتنی بار دعا کی ہے کہ عالین کی بتائی ہر بات چاہے غلط ہو لیکن ایک بات صرف ایک بات سچ ہو جائے کہ معاذ مجھ سے محبت کرتا ہے۔

"تم اندازہ نہیں کر سکتیں آبگینے! وہ تمہیں کتنا چاہتا ہے۔ وہ ہر وقت مجھ سے تمہاری باتیں کرتا رہتا ہے۔ فون پر اس نے تمہاری تعریفیں کر کر کے میرے کان کھا لیے تھے۔"

پہلی بار عالین جب اپنی والدہ کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی تو اس نے مجھے بتایا تھا۔

"مجھے یقین تھا مازی کی چوائس ایسی ویسی نہ ہو گی اور تمہیں دیکھ کر مجھے یقین آ گیا ہے۔ تم بہت خاص ہو آبگینے!"

اور میں حیران سی عالین رضا کو دیکھتی رہ گئی تھی یہ معاذ منیر کون تھا؟ میں تو نہیں جانتی تھی۔ یونیورسٹی میں کئی لڑکوں کی آنکھوں میں، میں نے اپنے لیے پسندیدگی دیکھی تھی۔ بلکہ کئی ایک نے تو ڈھکے چھپے لفظوں میں اظہار بھی کیا تھا لیکن میں نے کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی

تھی۔ مجھے یہ سب پسند نہیں تھا میں یہاں پڑھنے آئی تھی اپنے لیے رشتہ پسند کرنے نہیں اور پھر مجھے ایسا کوئی پرابلم نہیں تھا کہ میری شادی کہیں نہ ہوسکتی۔ میٹرک کے بعد سے ہی میرے لیے رشتے آنے شروع ہوگئے تھے۔ عزیزوں میں سے جاننے والوں میں سے۔ میں خوبصورت تھی کہنے والے کہتے تھے کہ اللہ نے مجھے بہت فراخدلی سے حسن کی دولت عطا کی ہے اور پھر میرا تعلق اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ میرے ابو بزنس مین تھے۔ گھر میں دو دو گاڑیاں موجود تھیں۔ کہیں کوئی کمی نہ تھی میں دو بڑے بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ گھر بھر کی لاڈلی۔ لیکن اس لاڈ اور محبت نے مجھے نہ بگاڑا تھا نہ مغرور کیا تھا، بس مجھے یونیورسٹی میں لڑکوں سے دوستی کرنا پسند نہ تھا۔ میرا گھرانہ اتنا آزاد نہ تھا۔ ہمارے ہاں لڑکوں سے دوستی کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سو میں نے کبھی ادھر ادھر نہیں دیکھا تھا یوں بھی میں ایسی محبتوں کی قائل نہ تھی۔ میرے خیال میں یہ راہ چلتی محبتیں سوائے بدنامی کے اور کچھ نہیں دیتیں آدمی کو۔

"انھوں نے مجھے کہاں دیکھا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔

میرے ڈیپارٹمنٹ میں تو اس نام کا کوئی لڑکا نہ تھا شاید کسی اور ڈیپارٹمنٹ میں ہو۔ میں نے سوچا تھا۔

"مازی نے تمہیں کسی فنکشن میں دیکھا تھا۔ شاید اس کے کسی دوست کی بہن کی شادی تھی۔"

عالین بتا رہی تھی۔

"تم اسے پہلی نظر میں ہی اٹریکٹ کر گئی تھیں حالانکہ وہ پہلی نظر کی محبت کا قائل نہ تھا۔ لیکن اس نے مجھے فون کیا۔ اور کہنے لگا عالی! مجھے لگتا ہے یہ وہی لڑکی ہے جسے زندگی کے سفر میں میرا ہم سفر ہونا ہے۔ وہ اس روز بہت خوش تھا اور اس روز کے بعد کتنی ہی بار اس نے مجھے فون کیا۔ عالی! جلدی سے آجاؤ نا میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے نام کرلوں۔ دراصل معاذ کی امی جب وہ بہت چھوٹا تھا تب ہی فوت ہوگئی تھیں۔ تایا نے پھر شادی نہیں اور اسے میری امی نے ہی پالا۔" عالین نے بتایا تھا اور تب مجھے سمجھ میں آیا تھا کہ میرا رشتہ مانگنے اور مجھے دیکھنے معاذ کی امی کی بجائے عالین کی امی کیوں آئی تھیں۔

میرے دل میں ایک خوشگوار سا احساس پھیل گیا تھا۔ مجھے کسی نے پسند کیا تھا اور بہت چاہ کے ساتھ مانگا تھا۔ معاذ ایم بی اے کر کے اپنے والد کے ساتھ ان کے بزنس میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ اگلے دس پندرہ دنوں میں عالین نے تین چکر لگائے تھے اور ہر بار ہی اس نے مجھے معاذ منیر

کے متعلق کچھ نہ کچھ بتایا تھا۔

"وہ بہت ذہین ہے اور اسے ذہین لوگ اٹریکٹ کرتے ہیں۔"

لیکن میں تو بہت زیادہ ذہین نہیں تھی بس نارمل تھی۔ میں نے تب سوچا تھا۔ "وہ بہت سادہ مزاج کا بہت مخلص، بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے اور ہر ایک کا بہت خیال رکھنے والا اسے اپنے ڈیڈی سے بہت محبت ہے۔"

عالین کی یہ بات تو صحیح تھی۔ میں نے ان تین سالوں میں اسے بہت خیال رکھنے والا پایا تھا۔ وہ ڈیڈی سے محبت کرتا تھا اور کسی ملازم کی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھتا تھا۔ "وہ بہت آہستہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولتا ہے۔ وہ جب یونیورسٹی میں تھا تو لڑکیاں اس کی آواز اور اس کے لہجے پر مرتی تھیں لیکن معاذ نے کبھی کسی لڑکی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ کہتا تھا عالی! جب کوئی رائٹ لڑکی مجھے نظر آئی تو میں اس سے ڈائیلاگ نہیں بولوں گا۔ بلکہ ڈائریکٹ اسے پرپوز کروں گا۔ مجھے یہ تھرڈ کلاس عاشقوں کی طرح لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرنا پسند نہیں ہے۔ کسی کو محبتوں کا یقین دلا کر خدانخواستہ کسی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑے تو زندگی تو تباہ ہوئی نا اس لڑکی کی۔"

عالین کے ساتھ معاذ کے ڈیڈی بھی ایک بار آئے تھے۔ ابو جان نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا اور دونوں بھائیوں نے معاذ کے متعلق تحقیق کر کے اسے او کے کر دیا تھا۔

"وہ ایک بہترین لڑکا ہے۔ ہر لحاظ سے پرفیکٹ۔"

بڑے بھائی اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور پھر ابو جان نے ہاں کر دی۔ اس روز عالین بہت خوش تھی۔

"آج معاذ کی خوشی دیکھنے والی ہے آبگینے! وہ تو ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ میں نے اس سے زبردست ٹریٹ لینی ہے جا کر۔ سچ میں نے آج اس کے چہرے کی طرف اس ڈر سے نہیں دیکھا کہ کہیں اسے میری نظر نہ لگ جائے۔ خوشی اس کی آنکھوں میں رقص کر رہی تھی۔ پتا ہے، وہ ہنستا ہے تو اس کی آنکھیں بھی ہنستی ہیں۔ میں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ وہ لڑکی بہت لکی ہوگی جو معاذ کی شریک حیات بنے گی اور وہ خوش قسمت لڑکی تم ہو آبگینے!" منگنی کا فنکشن بہت مختصر اور سادا سا تھا۔ صرف گھر کے افراد تھے۔ عالین کی والدہ نے مجھے انگوٹھی پہنائی تھی۔ میں اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہی تھی اور چائے اور کھانے کے بعد وہ سب میرے کمرے میں آئے تھے۔ عالین کی نندیں اور ساس، اس کی امی، میری امی اور میری بڑی بھابی۔ مرد باہر سٹنگ روم میں ہی تھے۔ ہمارے ہاں یہ رواج نہیں تھا کہ لڑکا لڑکی کو اور لڑکی لڑکے کو انگوٹھی پہنائے بلکہ لڑکی شادی ہونے تک لڑکے

کے سامنے نہیں جاتی تھی اس لیے میرے ابو نے معاذ کو انگوٹھی پہنا دی تھی۔ دادی بتاتی تھیں کہ لڑکی پہلے تو کسی سسرالی عزیز کے سامنے بھی نہیں جاتی تھی حتیٰ کہ خواتین کے سامنے بھی نہیں لیکن اب صرف منگیتر سے پردہ کرتی ہے۔ معاذ باہر سٹنگ روم میں بیٹھا تھا اس وقت مجھے کسی بہن کی کمی شدت سے محسوس ہوئی میرا بہت جی چاہ رہا تھا کہ میں معاذ کو کسی طرح دیکھ لوں۔

اس نے تو مجھے دیکھ ہی رکھا تھا۔ سب کمرے سے جا چکے تھے اور میں اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں اپنی اس ڈائمنڈ رنگ کو غور سے دیکھ رہی تھی جس نے مجھے ایک اجنبی شخص کے ساتھ ایک بہت مضبوط اور گہرے بندھن میں باندھ دیا۔ یہ انگوٹھی بہت خوب صورت تھی۔

''معاذ نے اسے خود پسند کیا ہے'' عالین نے مجھے بتایا تھا۔ ''اور ہم سب کزنز نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا لیکن وہ اڑا رہا کہ وہ اپنی منگنی کی انگوٹھی خود ہی خرید کر دلائے گا۔'' انگوٹھی دیکھتے دیکھتے میرا دل زور سے دھڑکا۔ میں اٹھی لیکن میرے دروازے سے لونگ روم کا وہ حصہ نظر نہیں آ رہا تھا جہاں معاذ بیٹھا ہوا تھا۔ میں بس ایک نظر اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ حالانکہ عالین نے مجھے اس کی تصویر دکھائی تھی۔ لیکن تصویر تو تصویر ہوتی ہے اور اس وقت مجھے خدیجہ بہت شدت سے یاد آئی۔ اتنے سارے دنوں میں ایک بار بھی مجھے اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ جب سے عالین رضا نے آنا شروع کیا تھا میں غیر ارادی طور پر معاذ کو ہی سوچتی رہتی تھی اسی لیے تو مجھے خدیجہ کا خیال نہیں آیا۔ حالانکہ مجھے اس کی اتنی عادت ہو چکی تھی کہ وہ چند دنوں کے لیے بھی اپنے ددھیال جاتی تو میں بور ہو جاتی اور اسکی واپسی پر خوب لڑتی اس سے۔

''اور تم وہاں جا کر بیٹھ گئیں ان خود غرض لوگوں میں۔''

''تم جانتی ہو آبگینے! میں صرف دادی کے لیے وہاں جاتی ہوں۔ جب وہ مجھے بلاتی ہیں تو میں انکار نہیں کر سکتی۔''

اور اب وہ پچھلے دو ہفتے سے اپنے ددھیال گئی ہوئی تھی اور مجھے اس کی کمی محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔ خدیجہ، ابو کی ایک کزن کی بیٹی تھی اور تقریباً پچھلے گیارہ سال سے وہ ہمارے ہاں ہی رہ رہی تھی۔ ابو کی کزن کو ان کے شوہر کی وفات کے بعد جو ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے ان کے سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ ابو انہیں گھر لے آئے تھے۔ خدیجہ جب تیرہ چودہ سال کی تھی۔ امی نے مینا پھپھو نے خدیجہ کی، مد پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

دادی بھی ان کے آنے سے خوش ہوئی تھیں۔ امی کو ان کے آنے سے بہت سہولت ہو گئی تھی آہستہ آہستہ انھوں نے تقریباً سارے گھر کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ دادی کا بھی خیال رکھتی

تھیں۔ خدیجہ بہت خاموش طبع اور سنجیدہ سی تھی بہت جلد ہمارے درمیان دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بہت ذہین بلکہ جینئس تھی۔ ہر کلاس میں فرسٹ آتی تھی۔ وہ اساتذہ کی ہمیشہ پسندیدہ اسٹوڈنٹ رہی تھی کیونکہ پڑھائی کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی وہ سب سے آگے ہوتی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس سے مرعوب تھی۔ جب وہ کالج پہنچی تو اپنا تعلیمی خرچ خود اٹھانے لگی تھی حالانکہ دادی نے اسے ڈانٹا بھی تھا۔ اسکالرشپ تو اسے ملتا ہی تھا لیکن وہ ٹیوشنز بھی کرنے لگی تھی۔ ہمارے ہاں آنے کے تقریباً چار سال بعد پہلی بار اس کی دادی نے اسے بلایا تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتی تھیں۔ ہم سب نے منع کیا تھا لیکن وہ چلی گئی۔ ''وہ بہت بیمار ہیں اور انھوں نے منت کی ہے۔ میں ایک بوڑھی عورت کو مایوس نہیں کر سکتی آبگینے! وہ اپنے پیارے بیٹے کی نشانی کو سینے سے لگا کر سکون حاصل کرنا چاہتی ہیں تو میرا فرض بنتا ہے کہ انہیں یہ سکون دوں۔''

''لیکن جب ان لوگوں نے تمہیں گھر سے نکالا تھا تو اس وقت لاڈلے بیٹے کا خیال نہیں آیا تھا۔''

''دادی عملاً اس گھر میں بے بس ہیں۔ سب کنٹرول تایا اور چچاؤں اور ان کی بیویوں کے ہاتھ میں ہے۔'' پھر وہ چلی گئی۔ جب آئی تو اس نے بتایا کہ کسی نے اس کا جانا پسند نہیں کیا۔ سب کو یہی فکر لگی ہوئی تھی کہ وہ کیوں آئی ہے۔''

''اسی لیے میں نے تمہیں منع کیا تھا۔'' میں نے کہا تھا تب وہ دھیمے سے مسکرائی تھی اور مسکراتے ہوئے اس کی براؤن آنکھوں میں سنہرا پن سا گھل گیا تھا۔ ''دادی مجھ سے مل کر خوش ہوئیں۔'' اور اس سارے عرصہ میں اب وہ تیسری بار دادی کے بلانے پر گئی تھی۔ لیکن اس بار اس نے بہت دن لگا دیے تھے۔ شاید اس کی دادی زیادہ بیمار تھیں۔ اس کے ددھیال والے لاہور میں رہتے تھے اور کم از کم میں اسے فون تو کر سکتی تھی۔ مینا پھپھو کے پاس یقیناً وہاں کا فون نمبر ہوگا۔ حالانکہ دو دن پہلے یونیورسٹی میں اس کی دوست ہما عادل نے مجھ سے کہا تھا کہ سر اس کی اتنی زیادہ چھٹیوں پر ناراض ہو رہے ہیں۔ وہ قائداعظم یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم فل کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے ایک سال سینئر تھی۔ میں بھی اسی یونیورسٹی میں تھی۔ جب اس نے ایم فل کے لیے اپلائی کیا تھا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔

''اتنا زیادہ پڑھ کر کیا کرو گی خدیجہ! جاب تو تمہیں مل ہی جائے گی ماسٹرز کے بعد...... سائنس ٹیچرز کی بہت مانگ ہوتی ہے۔''

''بس میرا جی چاہتا ہے کہ میں بہت سارا علم حاصل کروں۔''

وہ تھی تو سائنس اسٹوڈنٹ لیکن اس کے کمرے میں ادبی کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ پتا نہیں کیسے وہ کچھ پڑھنے کا وقت نکال لیتی تھی اور اگر اس وقت یہاں ہوتی تو کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی لیتی۔

میں دروازے کے پاس سے ہٹ کر بیڈ پر آبیٹھی۔ "معاذ آئندہ بھی تو گھر آتے رہیں گے میں تب دیکھ ہی لوں گی۔ تصویر تو دیکھ ہی لی ہے۔" مسکراتی آنکھوں والا خوب صورت لڑکا یہ تھا معاذ منیر۔

جانے سے پہلے عالین رضا پھر میرے کمرے میں آئی تھی اور اس نے میرے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔ "معاذ کہہ رہا ہے، یہ نیا بندھن مبارک ہو۔"

اور میں نے اپنے رخساروں کو تپتے محسوس کیا تھا۔ "تم مبارکباد نہیں دوگی آبگینے!" عالین نے شریر نظروں سے مجھے دیکھا۔ "میری طرف سے بھی مبارک کہہ دینا۔" لفظ بمشکل میرے لبوں سے نکلے تھے اور میرے رخسار مزید تپ اٹھے تھے، پلکیں جھک گئی تھیں۔

"اگر اس وقت معاذ تمہیں دیکھتا تو اس ادا پر مر ہی مٹتا۔" اسے حیادار لڑکیاں بھاتی ہیں۔ لیکن تم دل میں افسوس مت کرو کہ معاذ نے تمہیں نہیں سراہا، سمجھو میں معاذ کی آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

عالین بہت شوخ تھی۔ کھلکھلاتی، فقرے چست کرتی، معاذ کے متعلق بتاتی یہ لڑکی مجھے بہت مخلص اور پیاری لگی تھی اور میں نے سوچا تھا معاذ بھی ایسا ہی ہوگا عالین رضا جیسا۔

عالین کو واپس یو اے ای جانا تھا۔ اس کے شوہر ابوظہبی میں ہی بزنس کرتے تھے۔ اس کے جانے سے پہلے ان سب کی دعوت کی گئی تھی اور اس دعوت میں مجھے معاذ کو دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ اگرچہ خدیجہ ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس کی دادی بہت بیمار تھیں اور اس نے مینا پھپھو کو بھی بلا لیا تھا کیونکہ یہ اس کی دادی کی خواہش تھی۔ وہ ان سے معافی مانگنا چاہتی تھیں۔ خدیجہ نہیں تھی تو مجھے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ میں فرسٹ فلور کے کچن میں تھی جس کی کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی اور جہاں سے گیٹ اور گیراج صاف نظر آتا تھا۔ میں نے جالی کے پیچھے سے معاذ کو گاڑی سے اترتے دیکھا، وہ گاڑی کا دروازہ بند کر کے شاید اپنے ڈیڈی سے کچھ کہہ رہا تھا۔

اس سے مجھے اپنی قسمت پر رشک آیا تھا۔ عالین نے صحیح کہا تھا کہ میں بہت لکی ہوں۔

وہ میرے خاندان کے ہر لڑکے سے زیادہ خوبصورت تھا بہت اٹریکٹو پرسنالٹی تھی اس کی اور اس وقت میں نے دل سے شکر ادا کیا تھا کہ میں بھٹکی نہیں تھی اور میں نے ادھر ادھر نہیں دیکھا تھا۔

اور اس خالی مکان میں آنے والا شخص شاید میری صاف ستھری سوچوں اور پاکیزہ زندگی کا انعام تھا اور اس روز معاذ منیر نے میرے دل میں اپنی مسند سنبھال لی تھی۔

میرے اندر خوشی کے رنگ ہی رنگ کھل رہے تھے اور ان کا عکس یقیناً میری آنکھوں اور میرے چہرے سے جھلک رہا تھا جب عالین مجھ سے ملنے میرے کمرے میں آئی۔

"اوہ یہ رنگ کیسے دمک رہے ہیں تمہارے چہرے پر۔" اس نے میرے رخساروں پر بوسہ دیتے ہوئے شرارت سے مجھے دیکھا تھا۔

"کاش ان لمحوں میں معاذ تمہیں دیکھ سکتا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی اور پھر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے میری بے حد تعریف کی تھی۔

"سچ آبگینے! آج تم ہر روز سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہو۔ اللہ نے یقیناً تمہیں بے حد فرصت سے بنایا ہے اور میرا بھائی بہت لکی ہے۔ آج میں نے معاذ سے کہا تھا کہ تمہاری گہری نظر کی داد نہ دینا زیادتی ہے۔ کیسے تم نے ہجوم میں سے اسے کھوج لیا اور پتا ہے آبگینے! وہ بہت ہنسا۔"

"پھر داد دیں ہماری نظر کی۔ صحیح پارکھ ہیں۔"

"اور اس میں مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے آبگینے!" اس نے محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

"خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے اور ڈھیروں خوشیوں سے تمہارا دامن بھرا رہے۔"

اس نے سچے دل سے دعا کی تھی، لیکن پتا نہیں کیوں ان تین سالوں کے ہر ہر لمحے مجھے یہ احساس کیوں ہوا کہ عالین رضا کی دعا اوپر آسمانوں تک نہیں پہنچی۔ کہیں راستے میں ہی بھٹک رہی ہے۔

"معاذ ہم سب کو بہت پیارا ہے۔" اس روز عالین رضا نے کہا تھا۔

"اور ہم سب نے اس کے لیے ہمیشہ ہی بہت دعائیں کی ہیں اور اب ان دعاؤں میں تم بھی شامل ہو گئی ہو۔"

اس روز عالین نے مجھ سے معاذ کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں کی تھیں۔ اس کی پسند ناپسند، اس کے مشاغل۔ "اسے کافی اور چائے بہت پسند ہے وہ کہتا ہے جو لڑکی اچھی کافی اور چائے نہیں بنا سکتی اس کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہوگا اور سنو اگر تمہیں چائے اور کافی بنانا نہیں آتا تو سیکھ لو۔" وہ ہنسی تھی۔

"وہ کہتا ہے جب تک حلق سے خوشبو نہ آئے۔ چائے کا کیا فائدہ۔ پتا نہیں کچھ لوگ قہوہ ابال ابال کر چائے کا ملغوبہ کیوں بنا دیتے ہیں۔"

اور میں نے سوچا تھا کہ خدیجہ سے چائے بنانا ضرور سیکھوں گی۔ مجھے کہاں آتی تھی ٹھیک چائے بنانا اور خود مجھے چائے پینے کا شوق بھی نہیں تھا۔ خدیجہ بہت اچھی چائے بناتی تھی اور بڑے بھائی کہتے تھے۔ "خدیجہ چائے بناتی ہے تو حلق تک خوشبو آتی ہے۔" اور میں نے خدیجہ کے آنے پر کتنے شوق اور لگن سے چائے بنانا سیکھی تھی۔ لیکن ان تین سالوں میں معاذ نے کبھی مجھ سے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ میں اس کے لیے چائے بناؤں۔ حالانکہ عالین نے کہا تھا۔ "دیکھنا آبگینے! معاذ تم سے فرمائشیں کر کر کے چائے بنوائے گا۔ جب میری شادی نہیں ہوئی تھی تو اکثر آدھی رات کو مجھے جگا دیتا تھا۔ اٹھو عالی! اچھی سی چائے یا کافی بناؤ بیٹھ کر پیتے ہیں۔"

عالین نے بتایا تھا اس کے پاس اعلیٰ ادبی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ "تم دیکھنا جا کر۔ کتنا کریزی ہے وہ اپنی کتابوں کے متعلق۔ مجھے تو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا تھا کہتا تھا آپ ورق موڑ دیتی ہیں منتیں کروانے اور وعدے لینے کے بعد کوئی کتاب پڑھنے کو دیتا تھا۔ تمہیں شوق ہے کچھ پڑھنے کا؟"۔

"آ...... ہاں! میں گڑبڑا گئی تھی۔

مجھے تو ذرا بھی شوق نہیں تھا۔ میں تو اکثر خدیجہ کو ہر وقت کتابوں میں گھسے دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔ اسے جب بھی وقت ملتا تھا وہ بڑے بھائی کی اسٹڈی میں گھس جاتی تھی۔ بڑے بھائی بھی بہت اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے اور یہ انہیں ابا سے ورثے میں ملا تھا۔ لیکن مجھے تو ذرا بھی شوق نہیں تھا۔ میں تو کالج میں لڑکیوں کو خواتین کے میگزین پڑھتے دیکھ کر حیران رہ جاتی تھی۔ ایک دو بار میں نے کسی کلاس فیلو سے رسالہ لے کر پڑھنے کی کوشش کی تھی کہ آخر اس میں ایسا کیا ہے جو انہیں دیوانہ بنا دیتا ہے۔ میری کچھ سہیلیاں تو مہینہ شروع ہوتے ہی بک اسٹال کے چکر لگانے لگتی تھیں جو کالج کے نزدیک ہی تھا لیکن میں تو ایک کہانی کے چند پیراگراف پڑھ کر ہی بور ہو گئی تھی۔

"لو سنبھالو۔" میں نے رسالہ اپنی دوست کو دے دیا تھا۔ "یہ اس کی خاطر تم نے کل بک سٹال کے دو بلکہ تین چکر لگائے۔"

"ہائے کمبخت! تو نے پڑھی ہی نہیں۔" میری دوست نے رسالہ مجھ سے لے لیا تھا۔

اور میں تو اخبار بھی نہیں پڑھتی تھی جبکہ خدیجہ تو اخبار کا بھی لفظ لفظ چاٹ جاتی تھی۔ اکثر جب کبھی بڑے بھائی گھر پر ہوتے تو دونوں کسی نہ کسی موضوع پر بحث میں الجھ جاتے تھے۔ کبھی

کوئی کتاب موضوع بحث ہوتی اور کبھی کسی ہاٹ ٹاپک پر اور میں ہونقوں کی طرح انہیں دیکھا کرتی تھی۔ کبھی کبھی بور ہو جاتی۔

"یہ کیا فضول باتیں ہیں"

"گڑیا رانی! تم بھی پڑھا کرو کچھ۔ کورس سے ہٹ کر۔ ذہن کشادہ ہوتا ہے"

بڑے بھائی مجھے مشورہ دے کر پھر خدیجہ سے بحث میں الجھ جاتے تھے۔

"اوہ! پھر تو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

عالین ہنسی تھی اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی لیکن میں نے سوچا تھا بہر حال میں اب ضرور کچھ نہ کچھ پڑھنے کی کوشش کروں گی اور اگلے چند ماہ میں، میں نے بڑے بھائی کی اسٹڈی سے کچھ کتابیں لے کر پڑھنے کی کوشش بھی کی تھی۔

"معاذ! بہت ویل ڈریسڈ ہے۔ ہمیشہ ہم سب کزنز میں سے اس کی ڈریسنگ غضب کی ہوتی ہے۔"

"عالین! آپ کچھ دن اور رک جائیں نا!"

میرا جی چاہا تھا کہ وہ یوں ہی مجھ سے معاذ کی باتیں کرتی رہے اور میں سنتی رہوں۔ چند دنوں میں میرے اندر کی دنیا کتنی بدل گئی تھی۔

"نہیں یار! رضا پہلے ہی رولا ڈال رہے ہیں کہ اب آ جاؤں ورنہ وہ سب چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ جائیں گے پھر بچوں نے بھی تنگ کر رکھا ہے انہیں۔"

وہ دونوں بچے وہیں ہی چھوڑ کر آئی تھیں۔

"اتنا کہا تھا معاذ سے کہ ذرا صبر کر لو۔ دو ماہ بعد بچوں کی چھٹیاں ہوں گی تو سب ساتھ ہی آ جائیں گے۔ رضا بھی ساتھ آتے لیکن توبہ، معاذ کو تو چین ہی نہیں تھا کہنے لگا۔"

"کیا خبر دو ماہ تک اس کی منگنی ہی ہو جائے۔"

"اب کیا تمہیں پتا ہے کہ اس کی منگنی نہیں ہو چکی۔"

"ہاں ابھی تک نہیں ہوئی مجھے یقین ہے میں نے غور سے اس کے بائیں ہاتھ کو دیکھا تھا کسی انگلی میں کوئی انگوٹھی نہیں تھی۔"

"یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ کچھ لڑکیاں نہیں پہنتیں منگنی کی انگوٹھی۔" میں نے اسے چھیڑا تھا تو وہ بے چین ہو گیا۔

"خدارا عالی! یوں تو نہ کہو۔"

سچ آبگینے! معاذ تمہیں بے حساب چاہے گا اور تم دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکیوں میں سے ایک ہو۔"

اور ان تین سالوں میں کتنی ہی بار میں نے عالین کے کہے لفظ دہرا کر خود کو یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکیوں میں سے ایک ہوں کہ معاذ منیر جیسا شخص میرا ہمسفر ہے لیکن پتا نہیں کیوں اس خوش قسمتی پر میرے دل میں کہیں کوئی خوشی کی رمق نہیں پھوٹی حالانکہ میں نے خوش ہونا چاہا تھا۔

"سنو آبگینے! معاذ تم سے بات کرنا چاہتا ہے صرف ایک بار۔"

عالین نے جانے سے پہلے مجھ سے کہا تھا اور پھر خود ہی نمبر ملا کر اپنا سیل فون مجھے دیا تھا۔

"آبگینے! معاذ کی نرم دھیمی آواز واقعی سحر طاری کر رہی تھی۔ میرے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے اور دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

"آبگینے......!" اس نے پھر دہرایا تھا۔

"جی...... میرے لبوں سے بمشکل نکلا تھا۔

"میں اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا کہ میں نے جو چاہا مجھے ملا۔ آپ خوش ہیں؟"

"جی......" میرے لبوں سے پھر نکلا تھا۔ عالین شرارت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو جی کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے؟" وہ شوخ ہوا۔ "آبگینے! اس وقت میں بہت زیادہ بات نہیں کروں گا۔ صرف آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپکا ساتھ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔"

مجھے خاموش پا کر قدرے توقف سے اس نے کہنا شروع کیا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لیکن پراثر لہجے میں بولتا وہ مجھ پر سحر طاری کیے دے رہا تھا۔

"کہنے کو تو بہت کچھ ہے آبگینے! اپنی بیتابیاں، اپنی بے چینیاں، اپنی محبتیں اپنے جذبے لیکن یہ سب کسی اور وقت کے لیے۔ اس وقت تو صرف یہ کہوں گا کہ آپ کو میں اس طرح سنبھال کر رکھوں گا جیسے کوئی آبگینہ۔ آپ مجھے کتنی عزیز ہیں یہ میں آپ کو آج نہیں بتاؤں گا۔"

وہ بول رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا دل سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہتھیلیوں میں، کنپٹیوں پر، رخساروں پر جیسے ہر جگہ دل دھڑک رہا تھا۔

"آپ نے میری باتوں کو مائنڈ تو نہیں کیا؟" اس نے بات کرتے کرتے اچانک پوچھا تھا۔

"نہیں......"

"اوہ تھینکس......" عالین نے میرے ہاتھوں سے فون لے لیا۔

"بس اب اور تنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے"

پتا نہیں معاذ نے کیا کہا تھا جس پر عالین مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"اب زیادہ نہ پھیلو" اور سیل فون بند کر کے بیگ میں رکھ لیا۔

"پھر کب آئیں گی آپ؟" میں نے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمہاری شادی پر ہی اب آئیں گے۔ چاچو کہہ رہے تھے کہ سب تیاری تو مجھے ہی کرنا ہے آکر اور شادی میں کون سی دیر ہے۔ چھ ماہ گزرتے پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم تو فارغ ہو جاؤ گی نا تب تک؟"

"ہاں، تین ماہ بعد آخری سمسٹر ہے۔"

"معاذ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتا تھا لیکن تمہارے ابو اور بھائیوں نے کہا کہ تمہارے ایگزام کے بعد۔"

اور پھر عالین رضا چلی گئی تھی اور معاذ کے کہے لفظوں نے کتنے ہی دنوں تک میرے دل میں ہلچل مچائے رکھی تھی۔ سوتے جاگتے پڑھتے لکھتے اس کی خوبصورت آواز کانوں میں رس گھولتی رہتی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے کھو جاتی تھی۔

پتا نہیں میں نے پیپرز بھی کیسے دیے تھے۔ معاذ کے علاوہ مجھے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اس روز کے بعد معاذ نے پھر بات نہیں کی تھی۔ عالین نے جانے سے پہلے بتایا تھا کہ اسے میری عزت اور میرے خاندان کی اقدار کا بے حد خیال ہے۔ ان پانچ مہینوں میں وہ صرف ایک بار گھر آیا تھا۔ عالین کے جانے کے ہفتہ بھر بعد بڑے بھائی سے ملنے۔ اس روز میں گھر پر نہ تھی بلکہ اپنی ایک دوست کی بہن کی شادی پر گئی ہوئی تھی اور جب گھر آکر مجھے پتا چلا تھا کہ وہ آیا تھا تو مجھے کتنا افسوس ہوا تھا اس ایک جھلک دیکھنے کے بعد کتنی بار دل نے شدت سے اسے دیکھنے کی چاہ کی تھی۔

وہ کسی کاروباری سلسلے میں ہانگ کانگ جا رہا تھا۔ اس لیے بڑے بھائی سے ملنے آیا تھا۔ وہاں کی مارکیٹ کے متعلق اسے بھائی سے کوئی بات کرنا تھی کیونکہ وہ کئی بار سنگاپور اور ہانگ کانگ جا چکے تھے پھر وہاں سے ہی وہ یو اے ای چلا گیا تھا۔

☆☆☆

خدیجہ ان ہی دنوں واپس آئی تھی جب وہ سنگاپور گیا ہوا تھا۔ وہ صرف کچھ دنوں کے

لیے آئی تھی، اسے اپنا تھیسس مکمل کرنا تھا۔

"دراصل دادی بہت بیمار ہیں۔ انہیں فالج ہوگیا ہے اور ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں۔"

مینا پھپھو کو وہ وہاں ہی چھوڑ آئی تھی۔

"اور وہ سب جنہوں نے تمہاری دادی اور دادا کی ساری جائیداد سنبھالی وہ کیوں نہیں خدمت کرتے تمہاری دادی کی۔"

مجھے بہت غصہ آرہا تھا اس پر۔

"ان سے ہمیں کیا! اس وقت دادی کو ہماری ضرورت ہے آبگینے! ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ تمہیں کیا پتا وہ اٹھتے بیٹھتے کتنی دعائیں دیتی ہیں۔"

"صرف دعائیں یا تمہارا حق بھی تمہیں دیا ہے کچھ؟"

"آبگینے! ہم کسی لالچ میں ان کی خدمت نہیں کررہے۔ فرض ہے ہمارا اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ انھوں نے گھر سے نکالا تھا تو تمہاری دادی اور ابو کو اللہ نے وسیلہ بنا دیا۔"

وہ ایسی ہی تھی۔ بے غرض، قناعت پسند بالکل مینا پھپھو کی طرح۔

میرا جی چاہتا تھا کہ خدیجہ سے معاذ کی بہت ساری باتیں کروں۔ لیکن وہ بہت مصروف ہوگئی تھی۔ دیر تلک لائبریری میں بیٹھی رہتی تھی، اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہوگیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ تھوڑا بہت وقت نکال ہی لیتی تھی۔ بڑے بھائی گھر پر ہوتے تو ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ چائے بنائے۔ "تمہارے بعد چائے کا مزہ ہی نہیں آیا۔"

انھوں نے کتنی بار اظہار کیا تھا۔ میری منگنی کا سن کر وہ بہت خوش ہوئی تھی اسے معاذ کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ لیکن میرے پاس تو اس کی تصویر بھی نہیں تھی۔ عالین نے جب تصویر مجھے دکھائی تھی تو میرا جی چاہا تھا کہ وہ یہ تصویر مجھے ہی دے دے لیکن عالین نے وہ تصویر واپس اپنے پرس میں ہی رکھ لی تھی۔

"اور تم سے ایک تصویر نہیں مانگی گئی میرے لیے؟" "یہ میرا کام نہیں تھا۔ یہ بھابیاں اور بہنیں کرتی ہیں۔ بھابی تو کوئی ہے نہیں اور تم بہن ہو کر وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔"

"تم نے بتایا بھی تو نہیں منگنی کے فنکشن کا۔ نہیں تو ایک روز کے لیے تو میں آ ہی جاتی"

"بس اچانک ہی تو پروگرام بنا تھا۔ عالین کو واپس جانا تھا اور منگنی بھی کہاں تھی بس عالین کی امی نے آکر انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔ میں نے تو کپڑے بھی چینج نہیں کیے تھے۔"

"چلو خیر، معاذ بھائی جس روز آئے میں ان سے تمہارے لیے تصویر مانگ لوں گی۔"

خدیجہ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"لیکن وہ تو پاکستان میں نہیں ہیں۔" بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"بہت خوش ہو آبگینے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں بہت زیادہ خدیجہ! تم نہیں جانتیں۔ معاذ کتنا اچھا ہے۔ تم اس سے مل کر بہت خوش ہوتیں اس کے مزاج کے بہت سے رنگ تم سے ملتے ہیں۔ تمہاری طرح وہ اچھی چائے اور کافی کا شوقین ہے۔ اسے مطالعے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ اس کے پاس کتابوں کا بہت اچھا کلیکشن ہے اور اسے موسیقی سے بھی لگاؤ ہے۔ غزلیں سننا اسے پسند ہے۔"

"ارے!" خدیجہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائی تھیں۔

"تم نے تو بقول تمہارے، اسے قریب سے دیکھا تک نہیں تھا پھر یہ اتنی ساری معلومات کہاں سے ملیں؟"

"عالین نے بتایا ہے۔"

میں نے اس روز خدیجہ سے معاذ کی ہر وہ بات کی تھی جو عالین نے مجھے بتائی تھی۔

"چلو کبھی تو ملیں گے ہی تمہارے معاذ منیر سے۔"

خدیجہ بہت مصروف تھی۔ بہت کم اس سے بات ہو پاتی تھی۔ میں امتحان کے بعد فارغ ہوئی تو امی نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"دو تین ماہ تو یوں ہی پل میں گزر جائیں گے۔ پہلے ہی تین ماہ تمہاری پڑھائی میں ضائع ہو گئے۔"

وہ اکثر مجھے ساتھ لے جاتیں۔ عروسی جوڑے کو پسند کرنا بھی ایک اہم مرحلہ تھا۔ کتنے ہی دن تو امی کے ساتھ مری روڈ کے چکر لگائے تب کہیں جا کر ایک ڈریس پسند آیا تھا۔ لائٹ پرپل اور پنک کلر کا ولیمہ کا ڈریس خالص خدیجہ کی پسند تھا۔ اور مجھے بھی اچھا لگا تھا۔ میں تو چند دنوں میں ہی تھک گئی تھی۔

"امی! مجھے خدیجہ کی پسند پر اعتبار ہے، آپ اسے ہی لے جایا کریں۔"

اور بے چاری خدیجہ تھکی ماندی یونیورسٹی سے آتی اور امی کے ساتھ چلی جاتی۔ معاذ نے جہیز سے صاف منع کر دیا تھا۔

"فضول خریداری کرنے کی ضرورت نہیں ہے سب کچھ گھر میں ہے۔" اس نے بہت

سختی سے کہا تھا۔

"آپ اپنا اتنا قیمتی اثاثہ مجھے دے رہے ہیں کہ اس کے لیے ہی میں آپ کا احسان مند ہوں۔ مزید زیر بار نہیں ہونا چاہتا۔"

بڑے بھائی معاذ کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ "اگر سب لوگ اس طرح سوچنے لگیں تو ہمارے بہت سے معاشرتی مسائل حل ہو جائیں۔"

پھر بھی میرے لیے ڈریسز اور جیولری تو لینا ہی تھی اور بڑے بھائی کے منع کرنے کے باوجود امی نے کچھ ضروری اشیاء بھی خرید لی تھیں۔

خدا خدا کر کے خدیجہ کا سمسٹر ختم ہوا اور بڑے بھائی نے معاذ اور عالین کے آنے کی خبر سنائی۔

"وہ لوگ کل شام ہی آئے ہیں۔"

رات جب بڑے بھائی کی فرمائش پر خدیجہ چائے بنا کر لائی تو انھوں نے بتایا۔

خدیجہ کی آنکھیں یکدم چمکی تھیں۔

"معاذ بھائی ادھر کب آئیں گے؟"

"پتا نہیں، لیکن ایک دو روز تک تو وہ تاریخ لینے آ رہے ہیں۔"

"چلو جی، اب تمہارے معاذ منیر سے بھی ملاقات ہو جائیگی۔"

خدیجہ نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی اور میرا دل معمول سے زیادہ رفتار سے دھڑکنے لگا تھا۔

"بھئی تم لڑکیوں میں یہ بری عادت ہوتی ہے سرگوشیاں کرنے کی وہ بھی کسی محفل میں۔"

"یہاں تو صرف آپ ہیں بڑے بھائی۔"

خدیجہ نے بے حد معصومیت سے کہا تھا اور میں نے دیکھا تھا بڑے بھائی کتنی ہی دیر تک خدیجہ کو دیکھتے رہے تھے۔ اس سے وہ اتنی معصوم اور پیاری لگ رہی تھی۔ خدیجہ کا رنگ گندمی تھا لیکن نقوش میں بے حد جاذبیت تھی خاص طور پر اس کی آنکھیں بہت دلکش تھیں سنہری سنہری سی اور اس کی پلکوں کا گھنا جنگل۔ قد بھی متناسب تھا پانچ فٹ اور پانچ انچ میرا قد بھی تقریباً اتنا ہی تھا لیکن میرا جسم اس کے مقابلے میں گداز تھا لیکن میں موٹی نہیں تھی۔ ہاں وہ بہت اسمارٹ تھی اور اس کے بال سلکی اور بے حد لمبے تھے۔

"کیا بڑے بھائی خدیجہ میں دلچسپی لیتے ہیں۔" اس لمحے میں نے سوچا تھا اور اگر ایسا

ہو تو کچھ برا بھی نہیں لیکن امی...... شاید وہ اس لحاظ سے خدیجہ کو پسند نہ کریں اور پھر بڑے بھائی کے لیے تو انکا خیال اپنی بھتیجی کا تھا جو میڈیکل کی طالبہ تھی۔ ہاں چھوٹے بھائی لیکن چھوٹے بھائی سے ہم اتنے بے تکلف نہ تھے۔ حالانکہ انھوں نے کبھی کچھ ایسا خاص کہا تو نہیں تھا مجھ سے، لیکن بچپن سے مجھ پر انکا رعب تھا اور میں نے ہی خدیجہ کو ان کے متعلق بتا کر ڈرا دیا تھا کہ وہ خود سے چھوٹے بھائی سے کم ہی مخاطب ہوتی تھی۔

ایک بار میں گلے میں دوپٹا ڈالے گلی میں سے اپنی سہیلیوں کے ساتھ آ رہی تھی تو سامنے سے چھوٹے بھائی آ گئے تھے اور گھر آنے پر انھوں نے مجھے زور سے تھپڑ مارا تھا۔

"دوپٹا اوڑھنے کی تمیز سیکھو۔ بڑی ہو گئی ہو اب۔"

تب میں ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی اور تب سے ہی شاید میرے دل میں چھوٹے بھائی کا خوف بیٹھ گیا تھا میں کبھی ان سے بے تکلف نہ ہو سکی تھی۔ حالانکہ اس ایک تھپڑ کے علاوہ انھوں نے پھر کبھی مجھ سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی تھی۔

میں نے ہی نہیں شاید خدیجہ نے بھی بڑے بھائی کے اس طرح دیکھنے کو محسوس کیا تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ میں بھی۔ بڑے بھائی نہ جانے کس سوچ میں تھے کہ انھوں نے ہاتھ میں پکڑی چائے کا ایک گھونٹ تک نہ پیا تھا اور وہ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

خدیجہ نے جاتے جاتے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے شاید۔ مائیکرو ویو میں ایک چکر لگوا لاؤں۔"

"ہاں......!" بڑے بھائی نے کپ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

بڑے بھائی کو چائے دے کر وہ کمرے میں آئی تو میں دیر تک اس سے معاذ کی باتیں کرتی رہی۔

"بھئی اب مل ہی لیں گے تمہارے معاذ صاحب سے۔ ایک دو دن کی تو بات ہے۔ عالین آئیں گی تو میں کہوں گی ان سے کہ مجھے ملوایئے فوراً اپنے جیجاجی سے۔"

وہ ہنس رہی تھی اور ہنستے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مینا پھپھو چونکہ لاہور میں تھیں اس کی دادی کے پاس۔ اس لیے جب سے وہ واپس آئی تھی اکثر رات کو میرے ہی کمرے میں سو جاتی تھی۔ اگر کبھی وہ نہ آتی تو میں اسے بلا لاتی تھی۔ کبھی کبھی میں بے حد اداس ہو جاتی تھی۔ معاذ کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرنے کا خیال خوشگوار ضرور تھا لیکن وہ گھر جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ جہاں میں نے اپنے بھائیوں، امی ابا کی محبتیں سمیٹی تھیں۔ اسے چھوڑنے کا خیال ہی دل کو

مٹھی میں لے لیتا تھا۔ ہر لڑکی پر یہ وقت بہت کڑا ہوتا ہے۔

مجھے سب کے ساتھ ساتھ خدیجہ سے بچھڑنے کا احساس بھی رلاتا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ میری سگی بہن ہو۔ ہم نے اپنی محبتوں کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا لیکن ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اور کئی بار جدائی کے احساس سے رو چکے تھے۔

اس روز چونکہ رات دیر سے سوئے تھے اس لیے صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی لیکن خدیجہ مجھ سے پہلے اٹھ چکی تھی اور نماز پڑھ کر قرآن مجید پڑھ رہی تھی۔ میں کچھ دیر اپنے بیڈ پر لیٹی اسے دیکھتی رہی پھر یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ کمرہ ایک ماہ کی بات تھی میرے لیے پرایا ہو جانا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدیجہ نے قرآن کو جزدان میں لپیٹ کر شیلف پر رکھا تو میں نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

"خدیجہ......!" میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔ وہ میرے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"مت روؤ آبگینے! پلیز"

اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور جب ہم دونوں دھواں دھار رو رہی تھی تو چھوٹے بھائی خاموشی سے اندر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

"یہ کیا صبح صبح رونے کی کلاس ہو رہی ہے۔"

انھوں نے آواز کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے محسوس کیا تھا۔ ان کی آواز بھیگ رہی تھی میرا دل چاہا تھا ہمیشہ فاصلے سے رہنے والے چھوٹے بھائی کے گلے سے لگ کر خوب روؤں۔ تب چھوٹے بھائی صوفے سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

"نہ روؤ آبگینے......!" معاذ بہت اچھا لڑکا ہے۔ تم بہت خوش رہو گی۔ میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا ضبط گریہ کی کوشش میں سرخ ہوتی آنکھیں۔

"چھوٹے بھائی......!" میرا ضبط جواب دے گیا میں ان سے لپٹ گئی اور ایک بازو میرے گرد حمائل کیے مجھے اپنے ساتھ لگائے مجھے خاموش کرانے کی کوشش میں وہ خود بھی رو دیے تھے اور تب خدیجہ نے ہی سب سے پہلے خود کو سنبھالا تھا۔

"اب رو رہی ہو، رلا رہی ہو، چند ماہ بعد ہمیں یاد بھی نہیں کرو گی۔ کیوں چھوٹے بھائی! صحیح کہہ رہی ہونا میں؟"

"ہاں!" انھوں نے خود کو سنبھالا تھا۔

"یہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں آبگینے! ایک دن گھر ویران کر کے چلی جاتی ہیں۔"

"اور آپ بھی تو کسی کا گھر خالی کر کے کسی کو لے کر آئیں گے۔"

خدیجہ نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی تھی اور اسے یہ کمال بھی حاصل تھا۔ لمحوں میں موسم بدلنے پر قدرت رکھتی تھی۔ کچھ دیر بعد چھوٹے بھائی مسکرا رہے تھے اور میرے لبوں پر بھی دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

"اور اب رونا نہیں بالکل۔" چھوٹے بھائی تاکید کر کے چلے گئے تھے۔ میں نے دیکھا تھا، آنسو اب بھی ان کی آنکھوں میں مچل رہے تھے۔

ناشتے کی میز پر امی نے کہا تھا۔

"خدیجہ! تم آبگینے کو لے کر "فیشن ہاؤس" چلی جاؤ انھوں نے آج بلایا ہے اسے ویڈنگ ڈریس چیک کرنے کے لیے عمیر تمھیں لے جائے گا۔" انھوں نے بڑے بھائی کا نام لیا تھا۔

"اچھا......!"

خدیجہ تو اب فارغ ہی تھی اور جب میں باتھ لے کر باہر نکلی تو خدیجہ تیار تھی۔ ٹی پنک کلر کے ڈریس میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میں نے بھی بالکل ویسا ہی ڈریس پہنا ہوا تھا۔ بریزے کے یہ سوٹ ہمیں بڑے بھائی نے نیو ایئر پر گفٹ کیے تھے۔ اس اتفاق پر ہم دونوں کو ہنسی آ گئی۔

"یونیفارم!" خدیجہ ہنسی تھی۔

کہو تو میں بھی چینج کر لوں۔" اس کی یادداشت غضب کی تھی۔

"ایک بار جب امی عید پر ہم دونوں کے ایک ہی رنگ کے کپڑے لائی تھیں۔ تو میں نے کہا تھا۔

"اوہ امی! یہ ایک جیسے رنگ۔ اب کیا عید پر ہم یونیفارم پہنیں گے۔"

مگر یہ سات سال پرانی بات تھی۔

"ارے نہیں، یہ رنگ تم پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔"

مجھے ان دنوں وہ بہت پیاری لگنے لگی تھی یا واقعی وہ بہت پیاری ہو گئی تھی۔

ہم فیشن ہاؤس سے جلد ہی فارغ ہو گئے تھے۔ بڑے بھائی نے ہمیں گھر کے گیٹ پر اتارا تھا۔

"مجھے معاذ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا ہے۔"

انھوں نے کہتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔ میں شرما کر تیزی سے اندر بڑھ گئی تھی جبکہ خدیجہ وہیں کھڑی بڑے بھائی سے کوئی بات کر رہی تھی۔ وہ اندر آئی تو کچھ پرجوش سی ہو رہی تھی۔

"میں نے بڑے بھائی سے کہا ہے کہ شاپنگ کے بعد وہ معاذ کو ساتھ لے کر آئیں۔ آخر مجھے بھی تو ان سے ملنا ہے۔" اور انھوں نے وعدہ بھی کر لیا ہے۔

ویسے میں ابھی کھڑی تھی کہ میں نے ایک گاڑی کو گیٹ کے باہر رکتے دیکھا۔ گاڑی میں بیٹھے شخص نے ہارن بجایا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تب تک بڑے بھائی گیٹ سے باہر چلے گئے۔ میرا خیال ہے وہ ضرور تمہارا معاذ ہوگا۔ لیکن میں نے باہر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ سوچا جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں کچھ اور سہی واپسی پر تو وہ آئیں گے ہی۔" حسب معمول معاذ کے نام پر میری دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں اور رخسار تپ اٹھے تھے۔

"تم تو معاذ سے باتیں کرو چپکے چپکے اور میں جا رہی ہوں کچن میں۔ بھئی اپنے دولہا بھائی کے لیے مجھے کچھ خاص پکانا ہے آج...... کھانے کا ٹائم تو ہو ہی جائے گا۔"

اور ابھی وہ کچن میں گئی ہی تھی کہ مینا پھپھو کا فون آ گیا۔ خدیجہ کی دادی کو اٹیک ہوا تھا اور وہ ہسپتال میں تھیں۔ خدیجہ فوراً ہی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

"امی اکیلے دادی کے ساتھ ہسپتال میں نہیں رہ سکتیں۔ ان کا بی پی پریشانی میں اور بھی ہائی ہو جاتا ہے اور چاچیوں میں سے کوئی بھی ہسپتال رہنے کو تیار نہیں ہوتا۔ پچھلی بار جب فالج کا اٹیک ہوا تھا دادی پر تو میں اور امی ہی رہے تھے ہسپتال میں۔" وہ کہہ رہی تھی۔

میں اسے روک نہیں سکتی تھی لیکن میرا دل بہت برا ہو رہا تھا اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"روؤ تو نہیں آبگینے! دیکھو میں تمہاری شادی سے پہلے آ جاؤں گی۔ ضرور۔ پرامس۔"

"اور پھپھو؟"

"امی کو بھی لاؤں گی تم فکر نہ کرنا۔ بس دادی کے لیے دعا کرنا......"

اور وہ چلی گئی۔ چھوٹے بھائی اسے ڈائیو میں بٹھا آئے تھے اور مینا پھپھو کو فون کر دیا تھا کہ کسی کو اسٹاپ پر بھیج دیں۔

مجھے خدیجہ کے اس طرح چلے جانے کا بہت دکھ تھا۔ میں بہت دیر تک کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ حتیٰ کہ بڑے بھائی معاذ کے ساتھ واپس آ گئے۔ بڑے بھائی کے قہقہوں کی آواز کئی بار میرے کانوں میں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں پانی پینے کے لیے کچن میں گئی۔ شاید میرے

لاشعور میں تھا کہ مجھے معاذ نظر آ جائے حالانکہ کچھ اتنی زیادہ پیاس بھی نہیں لگ رہی تھی۔

میں کچن کے دروازے پر کھڑی تھی اور ملازم لڑکے سے میں نے پانی مانگا تھا۔ پتا نہیں کس احساس کے تحت میں اندر کچن میں نہیں گئی تھی۔۔ تب ہی مجھے لاؤنج میں بڑے بھائی کی آواز آئی۔

"بھئی جو محترمہ تم سے ملنے کی شائق تھیں اور جو خود کو تمہاری اکلوتی سالی کہتی ہیں انہیں تو ایمرجنسی میں جانا پڑ گیا لاہور۔ اس لیے تمہیں مجبور نہیں کیا رکنے پر۔"

"چلیں، سالی صاحبہ آ جائیں تو پھر مل لیں گے۔"

دھیمی اور دل میں اترتی آواز یکدم ٹھہر گئی۔ مجھے لگا جیسے میری طرف کسی کی نظر اٹھی ہو۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش کے باوجود میں بے اختیاری میں کچن میں چلی گئی اور مجھے اپنے پیچھے دھیمی سی ہنسی اور بلند قہقہہ سنائی دیا۔

"یار یہ لڑکیاں بھی۔" بڑے بھائی کا مخصوص جملہ۔

میں کتنی ہی دیر تک کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑی رہی میرا دل دھڑ دھڑ میرے سینے کے اندر جیسے بج رہا تھا۔ کیا تھا کیا تھا جو میں ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھ لیتی اور شاید اس سے وہ بھی میری طرف دیکھتا اور نظروں کا یہ تصادم کیسی افسانوی سی بات ہوتی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو خدیجہ میرے ہاتھ میں ناول دیکھ کر بہت ہنسی تھی۔

"یار اگر کچھ پڑھنا ہے تو اچھی بکس پڑھو یہ کیا رومانی ناول اٹھا لائی ہو۔" لیکن مجھے اسے پڑھنا اچھا لگا تھا۔

"ابتدا میں تم نے بھی تو ایسے ہی ناول پڑھے ہوں گے ابھی تمہاری وہ اعلیٰ ادبی کتابیں میرے دماغ میں نہیں سماتیں ابھی تو میں خود کو صرف مطالعہ کا عادی بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"چھاپ تلک سب چھین لی موسے نیناں ملائی کے۔"

اس روز خدیجہ کتنی ہی بار میری طرف دیکھ کر گنگناتی تھی۔

بڑے بھائی، معاذ کو گیٹ تک چھوڑ کر آئے تو لاؤنج میں سے انھوں نے آواز دی۔

"آ جاؤ آبگینے! وہ چلا گیا ہے۔"

اور پھر میں نظریں جھکائے کچن سے نکل آئی۔ چھوٹے بھائی بھی اپنے کمرے سے نکل آئے تھے۔ امی بھی آ گئیں اور ماحول میں اداسی رچ گئی۔ وہی اداسی جو لڑکی کی رخصتی سے پہلے ہی در و دیوار پر چھا جاتی ہے۔

چھوٹے بھائی مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ مجھے کچھ چاہیے تو نہیں کوئی چیز جو مجھے بہت پسند ہو۔ میرے حلق میں نمک گھلنے لگا۔

"فرمائش کرلو گڑیا۔ یہ موقع پھر نہیں ملے گا آج میرے سے جو مانگنا ہے مانگ لو۔"

بڑے بھائی نے مجھے اکسایا۔ ہم بہت دیر وہاں بیٹھے رہے

"پھر پتا نہیں کب یوں اس طرح اکٹھے بیٹھیں گے۔" میں نے سوچا تھا۔ سسرال چند قدم پر بھی ہو تو میکہ کتنا دور لگنے لگتا ہے۔

کل شام وہ لوگ تاریخ لینے آرہے تھے۔ ڈنر کا پروگرام طے ہو رہا تھا۔ میں چپکے سے اٹھ آئی۔

☆☆☆

عالین آئی تو سیدھی میرے کمرے میں آئی تھی۔ "آبگینے! میں نے تمہیں بہت یاد کیا تھا اور میرے بھائی نے بھی۔" وہ ہنسی۔ "ویسے کل تم نے بھائی کی اپنی جھلک دکھادی تھی تب سے ہی وہ بے چین ہے کہہ رہا تھا ہفتے بھر بعد کی تاریخ رکھ لیں۔"

وہ جتنی دیر میرے پاس رہی معاذ کی شدتوں کا ذکر کرتی رہی اس کی بے چینیاں اس کی وارفتگیاں۔

"جب تم اس کے پاس ہوگی آبگینے! تو پتا نہیں وہ کیا کرے گا۔ ابھی سے یہ حال ہے تو۔"

تاریخ طے ہوئی تھی اور وقت تو جیسے پر لگا کر گزرا تھا۔ میں نے خدیجہ کی بے حد کمی محسوس کی تھی۔ کئی بار اس سے فون پر بات ہوئی۔ لیکن اس کی دادی ایک بار گھر آکر پھر دوبارہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہوگئی تھیں۔ شادی سے تین دن پہلے سب ہی کزنز ہمارے گھر میں اکٹھی ہوگئی تھیں۔ میری کچھ کلاس فیلوز بھی باقاعدگی سے روز ہی آجاتی تھیں لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے بھی مجھے خدیجہ کی کمی بے حد محسوس ہو رہی تھی۔ اب مجھے پتا چلا تھا کہ خدیجہ میرے کتنے قریب تھی اور ان اہم لمحوں میں اس کا میرے قریب نہ ہونا مجھے کتنی تکلیف پہنچا رہا تھا۔

"دادی کو آج رات پھر اٹیک ہوا ہے آبگینے! اور وہ تقریباً کومے میں ہیں۔" مہندی سے ایک رات پہلے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ "لیکن میں مہندی والے دن ہر صورت صبح پہنچ جاؤں گی۔ ہاں اماں نہیں آسکیں گی۔ وقاص نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میرے بعد وہ ہسپتال میں اماں کے ساتھ رہے گا۔ آبگینے! ان سارے لوگوں میں یہ ایک شخص کچھ کچھ انسان لگتا ہے اور اسے

میرے تایا کا سپوت ہونے کا فخر حاصل ہے۔" (اس کے ابا کے تین بھائی تھے ایک بڑا دو چھوٹے ایک بہن تھی۔)

"اور آبگینے! یہاں ان سب کی بے حسی دیکھ کر میرا جی مرجانے کو چاہتا ہے۔ یہ سب جو دادی کے اپنے ہیں بیٹے تو خیر کہتے ہیں شادی کے بعد پرائے ہو جاتے ہیں لیکن یقین کرو آبگینے! پھپھو جی بس گھڑی دو گھڑی کے لیے ہاسپٹل آتی ہیں اور بس فرض پورا ہو گیا۔ کیا دولت انسان کو پتھر کر دیتی ہے آبگینے! کیا دادی نے ان سب کی پرورش میں تکالیف نہیں اٹھائی ہوں گی۔ کیا وہ اسی محبت کی مستحق نہیں ہیں جو کبھی انھوں نے انہیں دی تھی۔ میرا دل دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہے آبگینے! ایک تمہارے لیے تڑپ رہا ہے کہ میری آبگینے دلہن بننے جا رہی ہے، نیا گھر بسانے جا رہی ہے اور میں ایسے وقت میں اس سے دور ہوں اور دوسرا حصہ دادی کی بے بسی اور تنہائی پر تڑپتا ہے۔ آبگینے! میں اپنے دل کو بے حس نہیں کر سکی۔ کوشش کے باوجود۔ دادی جب آس بھری نظروں سے مجھے دیکھتی ہیں تو تم تک اڑ کر پہنچنے کے میرے سارے ارادے پانی ہو جاتے ہیں۔ تھینک گاڈ کہ وقاص نے میری بے چینی محسوس کر کے دو دن کے لیے دادی کے پاس رہنے کی آفر کر دی۔"

"تم صرف دو دن کے لیے آؤ گی خدیجہ!" میں اس کی ساری گفتگو بہت دھیان اور خاموشی سے سن رہی تھی، تڑپ اٹھی۔ "کیا ولیمہ میں شرکت نہیں کرو گی؟"

"دادی کی حالت ٹھیک نہیں آبگینے! پھر بھی کوشش کروں گی کہ وقاص مان جائے تین دن تک ہاسپٹل میں رہنے کو......" اور میں نے دل ہی دل میں وقاص کے مان جانے کی دعا کی تھی۔ مہندی والے دن میں صبح سے ہی خدیجہ کا انتظار کرنے لگی تھی۔ لیکن وہ نہ آئی۔ وہ ایسی تو نہ تھی اس نے وعدہ کیا تھا تو ضرور آتی۔ جب ہم شادی ہال میں جا رہے تھے تو میں نے بڑے بھائی سے پوچھا تھا جو گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔

"خدیجہ نہیں آئی بڑے بھائی! اس کا فون بھی نہیں آیا۔ آپ فون تو کریں وہ کب چلی وہاں سے...... رات ہوگئی ہے۔ اکیلی کیسے آئے گی۔ ٹائم پوچھ کر ڈرائیور کو بھجوا دیں لینے کے لیے۔" پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بڑے بھائی نے بتایا تھا۔

"وہ نہیں آسکے گی، اس کی دادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ آج آٹھ بجے ان کا جنازہ تھا۔"

اور مجھے اس کی دادی کے آج کے دن مرجانے کا بے حد دکھ ہوا۔

"اور اب شاید وہ بارات اور ولیمہ میں بھی نہیں آئے گی۔" میں نے سوچا تھا۔

مہندی کے فنکشن سے پہلے نکاح ہوا تھا اور نکاح کے بعد میری کزنز نے مجھے تیار کیا تھا۔ میرے ہاتھوں میں، بالوں میں گلے میں پھولوں کے زیور تھے۔

اور پیلا اور سبز کنٹراسٹ کا دوپٹہ گھونگٹ کی طرح میرے چہرے کو چھپائے ہوئے تھا اور اس دوپٹے کے نیچے بھی نیٹ کا نقاب تھا جس نے میرے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ سہیلیوں اور کزنز نے بڑا سا دوپٹا پکڑ رکھا تھا اور اس دوپٹے کے نیچے چلتے ہوئے میں اسٹیج پر آئی تھی اور میرے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی لڑکے والے آگئے تھے۔ اسے اس کے کزنز نے اپنے جھرمٹ میں لے رکھا تھا وہ سب گلے میں پٹکے ڈالے بھنگڑا ڈالتے ہوئے آئے تھے اور پھر کتنی ہی دیر تک انھوں نے اسٹیج کے سامنے بھنگڑا ڈالا تھا اور مختلف گانوں پر ڈانس کیا تھا۔

"معاذ یار! تم بھی ادھر آؤ"

کسی کزن نے اسے آواز دی تھی اسے دیکھنے کی چاہ میں بے اختیار ہی میری نگاہوں نے اسے کھوجا تھا۔ باریک دوپٹے میں سے میں نے اسے دیکھا۔ اس کے ڈیڈی اس کا ہاتھ پکڑ کے ڈانس کر رہے تھے اور وہ بے اختیار ہنس رہا تھا۔ عالین نے کتنا صحیح کہا تھا کہ ہنسی اس کے چہرے پر بہت بجتی ہے اور ایک فخر کے احساس کے ساتھ میں نے نظریں فوراً ہی جھکا لی تھیں۔ یہ شخص یہ اس قدر شاندار شخص میرا ہے کل تک اس سے ایک نازک سا بندھن تھا کچا۔ آج یہ بندھن یہ رشتہ بہت مضبوط ہو گیا ہے۔ امی کہتی تھی۔

"آبگینے! یاد رکھنا۔ دنیا میں سب سے اہم رشتہ میاں بیوی کا ہے۔ اولاد سے بھی زیادہ مضبوط رشتہ ایک مقام آتا ہے جب اولاد ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ بہن بھائی، ماں باپ سب رشتے دور ہو جاتے ہیں لیکن ایک ساتھ آخر تک رہتا ہے۔ شوہر اور بیوی کا پرخلوص ساتھ۔ معاذ کو اپنی محبت، خلوص اور خدمت سے اپنا بنا لینا۔ مرد کو اپنی عورت سے سکھ اور محبت ملے تو وہ کبھی باہر نہیں جھانکتا۔" یہ میری ماں کی سوچ تھی۔ صحیح تھی یا غلط میں نے اپنے پلو سے باندھ لی تھی اور سوچا تھا معاذ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔

پھر وہ ہنستے ہوئے اسٹیج کی طرف آنے لگا۔ اس کے ڈیڈی اس کے گلے میں بانہیں ڈالے جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ طرح ہنستے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ ان تین سالوں میں ایک بار بھی نہیں۔ جب میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی تھی تو میں نے دیکھا تھا ہنستے ہوئے اس کے دونوں گالوں میں گہرے ڈمپل بن رہے تھے بالکل بڑے بھائی کی طرح۔ اور یہ بات مجھے عالین نے نہیں بتائی تھی اور اس وقت ہنستا ہوا وہ مجھے بہت اپنا اپنا لگا تھا۔

پھر وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ کو جو صوفے پر دھرا تھا ہولے سے چھوتے ہوئے السلام علیکم کہا تھا اور میرے پیچھے کھڑی میری کزن نے میرے دوپٹے کو اور نیچے جھکا دیا تھا۔

"بھئی اب تو چھپانے اور چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب تو یہ میری وائف ہیں۔" پتا نہیں میری کزن نے کیا جواب دیا تھا لیکن میں نے گردن مزید جھکا لی تھی۔ مہین دوپٹے سے میرا ماتھا اور آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ میری کزن نے پتا نہیں کیا کہا تھا کہ وہ یکدم میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر میں نے اسے یکدم چونکتے دیکھا تھا اور میں نے جو بس لمحہ بھر کے لیے نظر اٹھائی تھیں فوراً جھکا لی تھیں۔

پھر اس کے دوستوں میں سے شاید کسی نے مذاق کیا تھا۔ وہ سامنے دیکھنے لگا لیکن وہ کچھ الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی باتوں سے ہوا تھا وہ دوستوں اور میری کزنز کے مذاق کا جواب اتنی برجستگی سے نہیں دے رہا تھا جیسے پہلے۔

"دولہا میاں! کہاں کھوئے ہوئے ہیں" میرے کانوں میں آواز آئی تھی اور پھر رسم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ باری باری دونوں کے ہاتھوں پر مہندی رکھ کر برفی کھلائی جا رہی تھی۔

"پلیز عالی! یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟" وہ کچھ بیزار سا لگ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے معاذ!" اس کے پاس کھڑی عالین کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"شاید میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میرا دل ایک لمحہ کو کانپا تھا۔

"یا اللہ! خیر کہیں نظر ہی نہ لگ گئی ہو۔ یا اللہ! میری خوشیوں کو سلامت رکھنا"

میں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی۔ پھر کچھ دیر اور مووی بنتی رہی تھی۔ پتا نہیں کون کون پاس آ کر بیٹھا تھا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا اور میرا چہرہ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ مہندی کا یہ فنکشن مشترکہ تھا۔ میرے رشتہ داروں نے معاذ کو اور معاذ کے عزیزوں نے مجھے مہندی لگائی تھی۔

دو بجے کے قریب ہم ہال سے گھر آئے تھے۔ گھر آتے ہی امی نے کہا تھا کہ تم سو جاؤ۔ ابھی کل ایک اور تھکا دینے والا دن تھا۔ تین بجے ہی مجھے پارلر چلے جانا تھا۔ لیکن بستر پر لیٹنے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ کئی بار جی چاہا عالین کو فون کر کے پوچھوں، معاذ کی طبیعت کیسی ہے؟

لیکن پھر حیا مانع آ گئی۔ آخر صبح کے قریب مجھے نیند آئی تھی۔ اس لیے میں بارہ بجے تک

سوتی رہی تھی اور مجھے کسی نے نہیں جگایا تھا۔ جب میں جاگی تو میرا دل جیسے میرے وجود میں بار بار ڈوبنے لگتا تھا۔

آج اس گھر میں میرا آخری دن تھا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ یہ گھر جس کو کل تک میں اپنا سمجھتی تھی جس کی ایک ایک چیز پر میرا اختیار تھا کل سے یہ بیگانہ ہو جائے گا۔ شاید میں آج کے بعد اس استحقاق سے اس گھر کی کوئی چیز بھی استعمال نہ کر سکوں گی۔

امی میرے لیے خود ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ یہ میری ماں تھی۔ جو میری پیدائش سے لے کر اب تک میرے لیے ہلکتی رہی تھی۔ میرے ہونے سے اسے بھلا کیا سکھ ملا تھا۔ ابھی تو میں نے پڑھائی ختم کی تھی۔

"امی!"

نوالہ میرے حلق میں پھنسنے لگا۔ اس وقت مجھے معاذ جیسے ہمسفر کے ساتھ کی خوشی بھی خوش نہیں کر پا رہی تھی۔ میں نے سلائس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"کچھ تو کھالو، اچھا یہ دودھ پی لو"

"امی! میں ایکدم ان سے لپٹ گئی۔ پھر پتا نہیں کب ابو اور چھوٹے بھائی بھی کمرے میں آ گئے تھے۔ "جتنا رونا ہو رو لو خبردار میک اپ کے بعد نہیں رونا۔" میری کسی کزن نے تنبیہ کی تو میرے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

ابو کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ بہت روئے تھے۔

"بھئی یہ لڑکیاں، دل میں چاہے لڈو پھوٹ رہے ہوں اوپر سے خوب آنسو بہائیں گی۔" بڑے بھائی نے سب کو ہنسانے کی کوشش کی تھی لیکن کسی کو بھی ہنسی نہیں آئی تھی اور پھر امی نے ہی میرے آنسو پونچھے تھے۔

"بس اب چپ کر جا۔ آنکھوں اور سر میں درد ہونے لگے گا" امی نے بے حد اصرار سے مجھے دودھ کا گلاس پلایا تھا اور بڑے بھائی نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے میرا دل بہلانے کی کوشش کی تھی۔ پھر امی مجھے آرام کرنے کی تاکید کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں تین بجے تک اپنے کمرے میں ہی رہی۔ میری کزنز میرے کمرے میں تھیں لیکن میرا کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ امی نے میرا کھانا کمرے میں ہی بھجوا دیا تھا لیکن مجھ سے کچھ نہیں کھایا گیا، بس دو تین لقمے ہی کھا سکی تھی۔ تین بجے مجھے پارلر جانا تھا میرے ساتھ میری کزن تھی اور چھوٹے بھائی ڈرائیو کر رہے تھے۔ اس وقت مجھے خدیجہ بے حد یاد آئی۔ پارلر سے تیار ہونے

کے بعد مجھے فوٹو سیشن کے لیے جانا تھا۔

نکاح تو ہو چکا تھا اور عالین نے بڑے بھائی کے ساتھ یہ طے کیا تھا کہ دولہا پہلے تیار ہو کر "یونیک" پر آئے گا اور فوٹو سیشن کے بعد میں چھوٹے بھائی اور کزن کے ساتھ ہال میں چلی جاؤں گی اور دولہا پھر بارات کے ساتھ آئے گا۔

اس روز اس پارلر پر چھ دلہنیں تیار ہونے آئی تھیں۔ اور وہاں سب نے ہی کہا تھا کہ آج کی کوئین میں ہوں "بہت کم دلہنیں آپ جیسی خوبصورت ہوتی ہیں۔ آپ تو بغیر تیار ہوئے بھی قیامت ڈھا رہی ہیں۔" جو لڑکی مجھے نیل پالش لگا رہی تھی اس نے فراخدلی سے میری تعریف کی تھی۔

"آج تو معاذ بھائی کی خیر نہیں۔" میری کزن نے مجھے چھیڑا۔

لیکن کتنی عجیب بات تھی جب "یونیک" پر چھوٹے بھائی، معاذ کے ساتھ اندر آئے تو معاذ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا تھا۔ میں بالکل سامنے صوفے پر بیٹھی تھی اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میری نظریں جھکی ہوئی تھیں لیکن میں اس کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ پھر شاید چھوٹے بھائی آ گئے تھے۔ وہ معاذ کے ساتھ بات کرتے ہوئے اندر آئے اور پھر فوٹو گرافر آ گیا۔ فوٹو سیشن شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اس سارے عرصہ میں معاذ نے مجھ سے کوئی ایک بات بھی نہیں کی اور شاید اس کے بعد میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ بہت خاموش تھا۔ حالانکہ میں منتظر تھی کہ وہ کچھ کہے گا۔ کوئی خوبصورت بات اور نہیں تو تعریف ہی کر دے گا کہ میں خوبصورت لگ رہی ہوں۔ چھوٹے بھائی تو ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔ فوٹو سیشن مکمل ہوا تو ہم ویٹنگ روم میں آ گئے۔

وہ چھوٹے بھائی سے ہاتھ ملا کر اپنے دوست کے ساتھ چلا گیا تو بھائی نے مجھ سے کہا۔

"آبگینے! گڑیا تم تھک گئی ہو گی۔ ابھی تو صرف نو بجے ہیں بارات تو گیارہ بجے سے پہلے نہیں آئے گی۔ میرا خیال ہے ہال میں جانے کے بجائے پہلے گھر چلتے ہیں تم وہاں ایزی ہو کے بیٹھ جانا۔ آدھ گھنٹہ پہلے میں تمہیں ہال میں لے جاؤں گا۔ ایک تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پارلر والے آٹھ آٹھ گھنٹے پہلے کیوں بلا لیتے ہیں۔ ذرا سا تو میک اپ کرنا ہوتا ہے لیکن......"

چھوٹے بھائی بڑبڑا رہے تھے اور میں...... پتا نہیں کیوں میرا دل بجھتا جا رہا تھا۔ شاید یہ گھر سے بچھڑنے کی وجہ تھا یا پھر...... معاذ اتنا سنجیدہ کیوں تھا؟ میرے اندر سوالوں کے بھنور اٹھ رہے تھے۔

جس طرح عالین اس کی بیتابیوں کا ذکر کرتی تھی اس کے بعد تو میں اس کے شوخ جملوں کی توقع کر رہی تھی لیکن......

"شاید وہاں وہ چھوٹے بھائی اور اپنے دوست کی وجہ سے خاموش تھا اور ضبط کر رہا تھا" میں نے خود کو تسلی دی تھی لیکن میرا دل پریشان ہو گیا تھا۔ پھر میں نے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

کچھ دیر بعد چھوٹے بھائی مجھے ہال میں لے گئے تھے۔ ڈریسنگ روم میں مجھے بٹھا کر بھائی چلے گئے تھے۔ میرے پاس میری دو کزنز بھی تھیں۔ میرا دل بار بار ڈوب رہا تھا۔ اس وقت پھر میں نے خدیجہ کو یاد کیا تھا وہ ہوتی میرے پاس تو میں اپنے دل کے وسوسے اس سے کہہ سکتی تھی۔

جلد ہی بارات آنے کا شور مچ گیا۔ بینڈ باجے کی آوازیں اندر کمرے تک آ رہی تھیں۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی۔ پھر بڑے بھائی آئے "دلہن کو لے آؤ" اور میں کزنز کے ساتھ دوپٹے کے سائے تلے اسٹیج تک آئی۔ مووی والا مووی بنا رہا تھا اور فوٹو گرافر تصاویر بنا رہے تھے۔ آج اسٹیج پر میرے چہرے پر گھونگھٹ نہیں تھا۔ میرے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد دولہا کو بھی اسٹیج پر لایا گیا تھا۔ میرے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہوئے اس نے مہندی والے دن کی طرح مجھے نہ تو سلام کیا تھا اور نہ ہی صوفے پر رکھے میرے ہاتھ کو چھوا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر گود میں رکھ لیے تھے۔ وہ بالکل سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔ اس کے دوست کزنز مذاق کر رہے تھے۔ "یار! لوگ تو شادی کے کچھ عرصہ بعد چپ ہوتے ہیں تم آج سے چپ ہو گئے ہو"۔ پھر خدیجہ کو میں نے اپنے قریب بیٹھتے محسوس کیا۔ "خدیجہ۔" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ وہ میرے قریب آئی اور اس نے میرے رخسار پر بوسہ دیا۔ "تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو آبگینے!" وہ سادہ سے لباس میں تھی۔ اس کے چہرے پر تھکن تھی اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ "تم کس کے ساتھ اور کب آئی ہو؟ میں سیدھی ہال میں ہی آ رہی ہوں۔ وقاص کے ساتھ آئی ہوں۔" اسے دیکھ کر میرا دل یکدم خوشی سے بھر گیا تھا۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح اس وقت آ جائے گی۔ میں اس سے اس کی دادی کا افسوس کرنا چاہ رہی تھی لیکن وہ معاذ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "معاذ بھائی! میں خدیجہ ہوں۔" بڑے بھائی اسٹیج پر آ گئے تھے۔ "معاذ! یہ ہے تمہاری اکلوتی سالی جسے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔" خدیجہ، معاذ سے بات کر رہی تھی اور میرا دل خدیجہ کی محبت پر مغرور ہو رہا تھا۔ کل اس کی دادی مری تھیں لیکن آج وہ میرے لیے، صرف میری خوشی کے لیے آ گئی تھی۔ میں نے اس کے تھکے ہوئے چہرے کو دیکھا وہ نہ جانے کس بات پر مسکرا رہی تھی اداس آنکھوں کے ساتھ اس کے اداس چہرے پر یہ

مسکراہٹ بہت بھلی لگی تھی مجھے۔ پھر ایک دم ہی میری ساری کزنز اسٹیج پر چڑھ آئی تھیں۔ شاید کھانا کھایا جا چکا تھا۔ انہوں نے معاذ کو گھیر لیا تھا اور اب ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ معاذ کے کزنز اور دوست بھی باقاعدہ ہر بات کا جواب دے رہے تھے۔ "دولہا پر شاید دلہن کے حسن کا رعب پڑ گیا ہے۔ بالکل ہی ساکت ہو گیا ہے۔" میری کزنز میں سے کسی نے کہا تھا۔ جملے بازی ہو رہی تھی لیکن معاذ خاموش تھا۔ پھر لڑکیاں نیگ مانگنے لگیں۔ "خدیجہ! سب سے زیادہ تو تمہارا حق ہے اور تم خاموش کھڑی ہو۔" یہ بڑے بھائی تھے جو خدیجہ کو اکسا رہے تھے۔ "یار! تمہاری اصل اور حقیقی سالی تو یہ ہے، باقی سب طفیلی ہیں۔" "ہائے بڑے بھائی، سمیر بھائی!" بہت ساری آوازیں میرے کانوں پر پڑ رہی تھیں پھر خدیجہ کی آواز۔ "نہیں، یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" خدیجہ کی آواز بہت خوبصورت تھی اور میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ "بیوقوف' جو مل گیا ہے اسے کیوں واپس کر رہی ہو۔" یہ بڑے بھائی تھے اور اس وقت وہاں بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر میں نے محسوس کیا تھا کہ بڑے بھائی ہمیشہ خدیجہ کی سپورٹ کو موجود ہوتے ہیں اور کیا بڑے بھائی...... یہ خیال بہت خوش کن تھا لیکن امی...... میں سمجھتی تھی کہ شاید امی کبھی نہ مانیں لیکن یہ گزرے دنوں میں مجھے احساس ہوا تھا کہ امی کا دل بہت کشادہ ہے اور وہ ہم سب سے بہت محبت کرتی ہیں اور اگر بڑے بھائی نے کبھی ایسی خواہش ظاہر کی تو وہ اپنی خواہش پر بڑے بھائی کی خوشی کو ترجیح دیں گی۔ اس وقت میں اپنے اور معاذ کے متعلق سوچنے کے بجائے خدیجہ اور بڑے بھائی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

"یار! اس میں ہم سب کا بھی حصہ ہے۔ تم کیوں واپس کرنے پر تلی ہو۔ جب یہ رقم تقسیم ہو گی تو یہ ذرا ذرا سی ہمارے حصے میں آئے گی۔" کوئی کزن، خدیجہ سے کہہ رہی تھی۔ پھر یکدم عالین کی آواز آئی۔ "پلیز بہت دیر ہو گئی ہے جلدی کریں۔ ماذی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے"

"اچھا۔" کسی نے قہقہہ لگایا تھا۔

"یہ طبیعت پہلے سے خراب تھی یا اب دلہن کو دیکھ کر خراب ہوئی ہے۔"

"اتنی حسین دلہن دیکھ کر تو خراب طبیعت بھی صحیح ہو جاتی ہے۔" جواب آیا تھا۔

عالین کے جلدی جلدی کرنے کے باوجود بھی تصاویر اور مووی بنتے بنتے گھنٹہ بھر مزید لگ گیا تھا اور گھر پہنچتے پہنچتے صبح کے تین بج گئے تھے۔ گھر میں بھی کچھ رسوم وغیرہ ہوئی اور جب میں اپنے کمرے میں آئی تو وال کلاک نے چار بجائے تھے۔ عالین میرے ساتھ تھی۔ "ماشاء اللہ خدا نظر بد سے بچائے اور تم دونوں کو زندگی کی ہر خوشی دے۔" انھوں نے میری پیشانی چوم کر مجھے دعا دی تھی اور پھر ایک شرارت بھری نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے باہر چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر

بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی اور میرا دل میرے جسم کے ہر حصے میں دھڑک اٹھا تھا۔ دھک دھک...... میں دل کی دھڑکن صاف سن رہی تھی۔

"السلام علیکم......" معاذ نے آہستہ سے کہا تھا اور پھر کچھ دیر بیڈ کے پاس کھڑا رہا تھا۔

"آبگینے! آپ بہت تھک گئی ہوں گی۔ میں بھی بہت تھک گیا ہوں آپ پلیز چینج کر کے آرام کریں۔" بے اختیار میں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں بے حد سپاٹ تھیں۔ ان میں کوئی تاثر نہ تھا۔ اور وہ جو عالین نے کہا تھا۔ "معاذ تو آج پاگل ہو جائے گا۔" میرے دل میں جیسے کسی نے چٹکی بھری۔

وہ بے چینیاں، وہ بیتابیاں جن کا ذکر عالین کرتی تھی۔ "سوری آبگینے!" اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "مجھے آپ کو رونمائی کا گفٹ بھی دینا تھا۔ آج کل تو رونمائی پہلے ہی ہو جاتی ہے۔ نہ وہ لمبا سا گھونگھٹ اور نہ......" مجھے لگا جیسے وہ زبردستی بات کر رہا ہو۔

پھر اس نے بیڈ سائیڈ کی دراز سے ایک مخملیں ڈبیا نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں نے اسے تھامنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مجھے معاذ کا رویہ حیران کر رہا تھا "اوہ سوری۔" اس نے پھر معذرت کی اور اسے کھول کر ایک خوب صورت بریسلیٹ نکالا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی پسند کی داد دی اور ہاتھ آگے کیا۔ ایک لمحہ وہ بریسلیٹ ہاتھ میں لیے کچھ سوچتا رہا پھر میری کلائی تھام کر اس نے بریسلیٹ مجھے پہنا دیا لیکن میں نے محسوس کیا میری کلائی پر دھری اس کی انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

اس کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ عالین نے صحیح کہا تھا۔ میں نے "تھینک یو" کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

"آبگینے! میں چاہتا ہوں کہ آج رات آپ آرام کریں۔ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا نا؟" وہ یونہی نظریں جھکائے بول رہا تھا۔

"میں بالکل بھی اچھا فیل نہیں کر رہا۔ ایک رات کی مہلت دیں گی آپ مجھے؟" دھیما دھیما دل میں اترنے والا لہجہ...... میں مسحور سی ہو گئی۔

"جی، آپ آرام کریں۔ میں چینج کر لیتی ہوں۔"

عالین نے مجھے بتایا تھا کہ واش روم میں میرا نائٹ ڈریس لٹکا ہوا ہے۔ وہ پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے لگا تھا کہ میری طرف اٹھتی اس کی نظروں میں میرے لیے ستائش تھی۔ لیکن یہ بس ایک لمحے کے لیے تھا اور پھر اس کی آنکھیں پہلے جیسی ہی ہو گئی تھیں۔

"آبگینے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکی۔ "تم سوئی نہیں ابھی تک؟" اس کے لہجے میں نرماہٹ تھی، ہمیشہ جیسی۔ میں یونہی کروٹ کے بل لیٹی رہی۔ "تم رو رہی ہو؟" اس نے تھوڑا سا جھک کر میرا چہرہ دیکھا۔

"کیا طبیعت خراب ہے، کیا خواب دیکھا تھا؟"

میں نے جواب نہیں دیا۔ میں کیا بتاتی اسے کہ میری آنکھوں میں آنسو کیوں آئے آج تین سال بعد بھی اپنی سہاگ رات کے متعلق سوچتے ہوئے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں چیخیں مار مار کر روؤں۔ شاید میں اس رات کی ناقدری کا دکھ بھول جاتی اگر معاذ نے بعد میں مجھے اپنی محبتوں کا یقین دلایا ہوتا۔ لیکن ان تین سالوں میں ایک بار بھی اس نے مجھے یہ نہیں کہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے یا یہ کہ وہ کسی فنکشن میں مجھے دیکھ کر دل ہار بیٹھا تھا۔ ہاں اس نے میرے سارے حقوق ادا کیے ہیں۔ میرا خیال رکھا ہے۔ مجھے کبھی کسی بات سے نہیں روکا۔ میری طبیعت خراب ہو تو پریشان ہو جاتا ہے۔ میں سوچوں بھی تو ڈھونڈنے سے بھی مجھے کوئی ایسی بات نہیں ملے گی کہ میں معاذ کی شکایت کر سکوں لیکن اس نے مجھ سے محبت نہیں کی۔ کبھی بھی نہیں۔

یہ آج پورے تین سال بعد میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں۔

جو کچھ عالین نے مجھے بتایا تھا وہ سب غلط تھا یا پھر عالین کو ہی کوئی غلط فہمی تھی۔

معاذ نے محبت ضروری کی تھی لیکن مجھ سے نہیں، اتنا تو میں نے جان لیا ہے۔ حالانکہ میں خدیجہ جتنی عقل مند نہیں۔ دنیا والوں کی نظر میں میری زندگی میں کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میرے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ میرے دل کی بستی خالی اور ویران ہے اس میں دھول اڑتی ہے لیکن دل کی ویرانی کس نے دیکھی ہے۔ خدیجہ بھی آج تک نہیں جان سکی حالانکہ اسے مجھے جاننے کا دعویٰ ہے۔

خدیجہ میری بارات پر آئی تھی تو پھر واپس نہیں گئی تھی۔ چند دنوں بعد مینا پھپھو بھی آگئی تھیں اور آج بھی بڑے بھائی، خدیجہ سے چائے کی فرمائش کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"بھئی خدیجہ چائے بناتی ہے تو حلق تک سے خوشبو آتی ہے۔" میرے میکے گھر کی رونقیں اسی طرح قائم ہیں۔

اور اب شاید ان میں اضافہ ہو جائے کیونکہ چھوٹے بھائی نے امی سے کہا ہے وہ فائزہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ فائزہ میرے ماموں کی وہ ڈاکٹر بیٹی ہے جسے امی اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔

اور "عمیر" امی کو...... حیرت ہوئی تھی۔

"بڑے بھائی فائزہ کو پسند نہیں کرتے۔" چھوٹے بھائی کو صاف بات کرنے کی عادت تھی اور امی کو کیا فرق پڑتا ہے عمیر ہو یا سمیر۔ انہیں تو فائزہ کو بہو بنانا ہے اور میں سوچتی ہوں کسی روز امی سے کہوں بڑے بھائی کی شادی خدیجہ سے کر دیں تا کہ ہمیشہ چائے پیتے ہوئے ان کے حلق تک خوشبو آتی رہے۔

"آبگینے!" وہ بیڈ پر میرے پاس بیٹھ گیا اور اپنی انگلیوں سے میرے آنسو پونچھے۔

"آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں، کیا ہوا ہے؟"

"بس یونہی دل گھبرا رہا ہے۔" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں کتنے دنوں سے کہہ رہا ہوں کہ آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں۔ خیر کل میں خود آپ کو لے کر جاؤں گا۔" اس نے دایاں بازو اٹھا کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور میں نے اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اس کی رفاقت میں کتنا سکون تھا لیکن خالی دل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہاں ویسا ہی سناٹا تھا اور ویرانی۔

☆☆☆

آبگینے میرے بازو کے حصار میں میرے سینے سے سر لگائے سو گئی ہے۔ میں نے آہستہ سے اس کا سر تکیے پر رکھا ہے اور کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا ہوں۔ اس کی آنکھیں متورم ہیں اور چہرے پر زردی ہے سوتے میں بھی اس کی پلکیں بھگی بھگی ہیں۔ میں کتنے دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اسکا گلابی رنگ زرد پڑتا جا رہا ہے۔ جب وہ دلہن بنی یہاں اس کمرے میں کھڑی تھی تو ایک لمحہ کو تو میں مبہوت ہو گیا تھا۔ اتنا حسن۔

اللہ نے اسے حسن کی دولت فراخدلی سے عطا کی ہے مگر اب اس کا سرخ و سپید رنگ کتنا ماند پڑ گیا ہے۔ میں صبح ضرور اسے لیکر ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا پتا نہیں اسے کیا تکلیف ہے۔ خود سے تو یہ کبھی نہیں بتائے گی۔ میں دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے پھر صوفے پر آ بیٹھا ہوں۔

"کیا تم نہیں جانتے اسے کیا تکلیف ہے؟"

دل کے اس سوال پر میں نادم سا ہو گیا ہوں۔ میں اس کے سامنے دولت کے ڈھیر لگا سکتا ہوں، اس کی ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں لیکن......

ہاں میں اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ میرے دل میں اس کے لیے رتی بھر بھی محبت نہیں ہے۔ حالانکہ اپنی شادی شدہ زندگی کے ان تین سالوں میں بہت کوشش کی ہے میں نے کہ اس

سے محبت کر سکوں لیکن میرے دل میں جو محبت پہلے سے موجود تھی اس محبت نے دل کا ہر کونا یوں بھر رکھا ہے کہ کہیں بھی کسی اور محبت کی گنجائش نہیں ہے۔ حالانکہ میں ہر طرح سے اس کا خیال رکھتا ہوں۔ جانتا ہوں وہ میری بیوی ہے اور میری ذمہ داری ہے۔

اور میں کوشش بھی کرتا ہوں کہ اس کے حقوق پورے کر سکوں لیکن بس یہ ایک محبت...... میں چاہنے کے باوجود اس سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ مجھ سے منافقت نہیں ہوتی، نہ میں جھوٹ بول سکتا ہوں میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جسے میں نے چاہا اور پانے کی تمنا کی۔ اس لیے کہ آبگینے وہ لڑکی نہیں ہے...... وہ لڑکی...... اسے میں نے پہلی بار رقیب کی بہن کی شادی میں دیکھا تھا۔ بلکہ دیکھنے سے پہلے میں نے اسے سنا تھا۔ وہ میرے آگے کھڑی میری طرف پیٹھ کیے کسی سے زور و شور سے بحث کر رہی تھی۔ میری نظریں پہلے اس کے لانبے بالوں سے الجھی تھیں اور میں نے دل میں کہا تھا۔ اس لڑکی کے بال خوبصورت ہیں اور پھر جب میں نے اس کی آواز سنی تو سوچا۔

اس کا لہجہ اور آواز بھی خوبصورت ہے۔

"لعنت ہے ایسی شہریت پر جس میں آزادی، ایمان اور وطن سب کچھ گنوا دیا جائے۔ سور کا گوشت کھا کر سڑکوں پر ننگے پھرنے والے مسلمانوں کو شہریت کے نام پر برباد کر رہے ہیں اور مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ عورت اور شراب کی بوتل کی تصویر دیکھ کر ہی اس کی جانب دوڑتے ہیں اور تمہارا وہ انجینئر کزن پلس منگیتر کینیڈین شہریت کے شوق میں وہاں اب برتن مانجھ رہا ہے کسی ہوٹل میں۔ حالانکہ یہاں اس کی ایک باعزت جاب تھی نینی یہ لوگ یہ پاکستانی کیوں نہیں سمجھتے کہ یورپ کی معیشت پاکستان سے زیادہ خراب ہے، لوگ بھوکے مر رہے ہیں تم نے اسے روکا کیوں نہیں نینی!"

یکا یک اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی اور اس میں ایک درد سا رچ گیا تھا۔

"غیر ممالک میں انسان مشین بن جاتا ہے، کام کرنے والی مشین۔ بس ان مشینوں کی آنکھیں انسانوں کی سی ہوتی ہیں کیونکہ ان آنکھوں میں انتظار ہوتا ہے بہت سارا۔ اپنے پیاروں سے ملنے کا۔ اچھے دنوں کا اور سال کے طویل اور پر تکان دنوں کے گزر جانے کا۔"

مجھے لگا جیسے اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی ہے۔ بے اختیار میرا دل اس دردمند لڑکی کو دیکھنے کو چاہا۔ لڑکیاں تو اتنی دردمند نہیں ہوتیں۔ وہ تو خود اپنے خاوندوں، بیٹوں، بھائیوں کو باہر کے ممالک میں بھیجتی ہیں تا کہ وہ وہاں سے ریال، پونڈ اور ڈالر کما کر بھیجیں اور ان ڈالروں

سے یہ اپنی خواہشات پوری کر سکیں اور یہ لڑکی بڑی دردمندی سے بھیگی آواز میں اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی۔

"نینی! تم جنید کو واپس بلا لو۔ اپنی محبت کا واسطہ دے کر۔ اس سے پہلے کہ وہ مشین بن جائے۔"

اور میں اسے دیکھنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہو کر ایک پاس سے گزرتے بیرے سے کوک کا گلاس لینے لگا۔ پھر میں نے بظاہر ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال تھی۔

گندمی رنگت، دلکش نقوش اور بے حد خوبصورت آنکھیں جو روشنیوں میں سنہری سنہری سی لگ رہی تھی۔ اس کی پلکوں کی تتلیاں اس کے گالوں پر لرز رہی تھیں اور سوچ کے سائے اس کی پیشانی چوم رہے تھے اب اس کی آواز مجھے سنائی نہ دے رہی تھی کیونکہ ڈیک پر فل آواز میں گانا بجنے لگا تھا حالانکہ اس کے مزید خیالات جاننے کی ہوس دل نے کی تھی۔ میری نظروں نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ وہ اسٹریپ والے فلیٹ سنڈل پہنے ہوئے تھی۔ گویا اس کی قامت بھی غضب کی تھی۔ آسمانی رنگ کا سادا سوٹ اور بڑے سے دوپٹے پر منقش کا کام دمک رہا تھا اور اس سادگی میں بھی وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔

ایک سے ایک بنی سنوری لڑکی تھی وہاں لیکن میری نگاہوں نے صرف اسے ہی حصار میں لیا تھا۔ اس میں کچھ خاص تھا۔ کچھ بہت ہی خاص وہ سب سے منفرد اور مختلف لگی تھی مجھے۔

اور پھر کئی بار میری نظروں نے اسے کھوجا۔ کبھی وہ دوستوں کے جھرمٹ میں کھڑی نظر آتی۔ کبھی پلیٹ ہاتھ میں لیے بڑے سلیقے سے کھاتے ہوئے کبھی خاموش بیٹھی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتی میری نظریں اسے تلاش لیتیں۔

میں اس طرح کا لڑکا نہیں تھا۔ میں نے کبھی کس لڑکی کو نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ میری اپنی ایک دنیا تھی۔ اب تو میں بہت معروف بندہ تھا مگر طالبعلمی کے دور میں بھی اس طرح کی فضولیات میں کبھی نہیں پڑا تھا۔ حالانکہ میرے کئی کلاس فیلوز بہت بے باکی سے دوسری لڑکیوں پر تبصرہ کرتے تھے۔ ان کی پسند ناپسند بدلتی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ محبت کا دعویٰ کرنے والے بھی کچھ عرصہ بعد پہلی محبت بھول کر کسی اور محبت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے ہوتے۔

"یار! یہ محبت بڑی ظالم شے ہوتی ہے۔" میرے ٹوکنے پر وہ کہتے۔

لیکن میں ایسی محبت کو نہ مانتا تھا جو محض چند دنوں کی مہمان ہوتی تھی اور پھر پہلی نظر کی محبت کا تو میں قائل ہی نہیں تھا۔

"پہلی نظر صرف ظاہر کو جانچتی اور دیکھتی ہے۔ اس میں گہرائی نہیں ہوتی وہ جتنی جلدی ہوتی ہے اتنی ہی جلدی ختم بھی ہو جاتی ہے۔" یہ میرا نظریہ تھا۔ لیکن اس رات جب میں تقریب سے واپس آ کر بیڈ پر لیٹا اور آنکھیں بند کیں تو اس کا سراپا روپ بدل بدل کر میری آنکھوں میں آنے لگا۔ میں بہت جھنجھلایا۔

میں...... معاذ منیر کیا ایک لڑکی سے اتنا متاثر ہو گیا ہوں کہ اس کا سراپا میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے؟ میں نے خود کو سختی سے جھٹلا دیا۔ لیکن کئی دنوں تک اس کا ٹھہرا ٹھہرا خوب صورت لہجہ جیسے کوئی ندی ہولے ہولے بہہ رہی ہو مجھے ڈسٹرب کرتا رہا اور اس کا دلکش سراپا مجھے پریشان کرتا رہا اور ایسا میرے ساتھ پہلی بار ہوا تھا۔

دوسری بار میں نے اسے پبلک لائبریری میں میز پر کتاب کھولے بڑے انہماک سے پڑھتے اور نوٹس بناتے دیکھا۔

وہ سادا سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس تھی اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود مجھے اس کے سوٹ کا رنگ یاد ہے۔ اس کے لمبے سے دوپٹے کا ایک پلو زمین کو چھو رہا تھا۔ وہ اردگرد سے بے خبر سی تھی۔ مجھے ایک کتاب کی تلاش تھی۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اس کتاب کی ایک کاپی یہاں اس لائبریری میں موجود ہے وہ اس کتاب کو ایشو تو نہیں کرتے لیکن میں چاہوں تو اس کتاب کو پڑھ سکتا ہوں وہیں بیٹھ کر۔

اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میرا جی چاہا زمین کو چھوتے اس کے دوپٹے کا پلو زمین سے اٹھا لوں یا اسی بہانے اسے مخاطب کروں اور اس سے کہوں "مس یہ آپ کا دوپٹا زمین سے لگ رہا ہے" لیکن میں اس کے پاس سے گزر کر لائبریرین کی طرف چلا گیا۔

"یہ میری ذاتی کتاب ہے۔" لائبریرین نے مجھے بتایا۔ "آئی نو میں نے شکریہ ادا کر کے کتاب لے لی۔ اور غیر ارادی طور پر ٹیبل کی دوسری سمت ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر کتاب کھول لی۔

مگر مجھے احساس ہوا کہ میں پڑھنے کی بجائے مستقل اسے گھور رہا ہوں۔ یہ انتہائی معیوب حرکت تھی۔ میں نے فوراً نظریں جھکالیں اور کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیکن میں کتاب پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم فائل بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

"چلو حنا! بہت دیر ہو گئی ہے۔" دوسری لڑکی نے بھی میز پر پڑا بیگ اٹھایا سانولے

رنگ کی یہ لڑکی جس کی آنکھوں پر موٹے عدسوں کا چشمہ لگا تھا دیکھنے میں بڑی پڑھاکو لگ رہی تھی۔

''سنیے۔'' اس نے مجھے اچانک پکارا۔

''یہ کتاب؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''لائبریرین صاحب کی ذاتی کتاب ہے۔'' میں بات تو اس سے کر رہا تھا لیکن میری نگاہیں اس پر نہیں تھیں اور جس پر تھیں اس کی پیشانی پر ناگواری شکنیں تھیں۔

''اوہ تھینکس پھر تو پڑھنے کے لیے مل ہی جائے گی۔'' پھر وہ دونوں چلی گئیں اور مجھے لگا جیسے یکدم روشنیاں بجھ گئی ہوں۔ ایک وہ چلی گئی تھی تو لائبریری جیسے خالی ہو گئی تھی۔ ایک اس کے وہاں بیٹھنے سے جیسے ایک انجمن آباد تھی۔ میں بھی کچھ دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے سوچا پھر کسی روز آ کر کتاب پڑھ لوں گا میں اپنی کیفیت پر حیران تھا۔

''کیا یہ محبت ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

کیا میں اس لڑکی کو بس ایک نظر دیکھ کر اس سے محبت کرنے لگا ہوں؟ پھر محض اس کی ذہانت سے متاثر ہوں؟

شکل تو ثانوی چیز ہے لیکن وہ شکل بھی بہت جاذب نظر تھی۔ اگلے کئی روز تک میں مسلسل نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سوچتا رہا۔

رات بھر جاگ کر کسی کو سوچنا...... کسی کا تصور کرتے کرتے صبح کر دینا یہ کیا ہے؟ اس دوسری ملاقات کے دو ہفتے بعد میں خود سے اعتراف کر رہا تھا کہ ''ہاں یہ محبت ہے۔''

یہ کیسی آگ تھی جو میرے سیدھے سادے خالی دل میں اچانک بھڑک اٹھی تھی مگر اسے جلا کر بھسم کرنے کے بجائے دل کو ایک نئی اور انوکھی لذت سے ہمکنار کر رہی تھی۔ اس کی تپش کتنی خوشنما اور پراسراری تھی۔ جو دل و جان کو مہکا رہی تھی۔ اور اگلے چند دنوں میں میں نے لائبریری کے کتنے ہی چکر لگا ڈالے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا، بات کرنا چاہتا تھا لیکن جب تیسری بار میں نے اسے دیکھا تو وہ اپنی اسی سانولی گول مٹول چہرے والی دوست کے ساتھ کے ایف سی میں کھڑکی کے پاس والی ٹیبل پر بیٹھی تھی لیکن اس سانولی لڑکی کے علاوہ بھی چار لڑکیاں اور اس کے ساتھ تھیں شاید ان میں سے کوئی ٹریٹ دے رہا تھا۔

سفید لباس میں اس سے وہ مجھے اتنی پیاری اور محبوب لگی کہ میرا دل میرے ہاتھوں سے نکل نکل کر اس کی جانب لپکنے لگا لیکن میں نے خود کو سمجھایا۔

''یہاں وہ اپنی یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ آئی ہے اور یہ کتنا نامناسب ہوگا کہ میں اس کی

ٹیبل پر جا کر کہوں۔

''مس! میں معاذ منیر ہوں۔''

میں اس کی دلنشین گفتگو سننا چاہتا تھا لیکن اس کے آس پاس کی ٹیبلز خالی نہ تھیں اور جو جگہ مجھے ملی تھی وہاں سے صرف اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ سب اٹھ کر چلی گئیں۔ میرا اندازہ صحیح تھا جب وہ میری ٹیبل کے پاس سے گزریں تو میں نے سنا وہ سانولی لڑکی دوسری لڑکی سے کہہ رہی تھی۔ ''میری منگنی کی ٹریٹ تو تم نے لے لی ہے، اب تم کب دو گی اور کہاں؟'' میں ان کے پیچھے ہی باہر نکلا تھا۔ وہ سب ایک وائٹ آلٹو میں بیٹھ گئیں۔ میں کسی فلمی ہیرو کی طرح ان کے پیچھے جا رہا تھا۔ سب سے پہلے ایک براؤن گیٹ کے سامنے وہ ہی اتری تھی۔ اس نے گیٹ کی بیل پر ہاتھ رکھا تو غیر ارادی طور پر میرا پاؤں بریک پر پڑا ٹائر یکدم چرچرائے تھے کہ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور پھر گیٹ کھلنے پر اندر چلی گئی۔ میں نے نیم پلیٹ دیکھی۔

''ملک ممتاز چودھری۔'' اور گھر کا نمبر ذہن نشین کر لیا۔

میں نے یہ سب کیوں کیا؟ واپس آتے ہوئے مجھے بہت ہنسی آئی۔ یہ کیا ٹین ایجر لڑکوں کی طرح میں اس لڑکی کا تعاقب کرتا اس کے گھر تک پہنچا تھا جسے میں نے صرف تین بار دیکھا تھا۔

''یہ حماقت ہے معاذ منیر!'' رات کو میں اپنے بیڈ پر لیٹا تو خود کو سرزنش کی۔

''محبت جرم نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ بندے کے اختیار میں ہے۔'' میں نے خود کو کہتے سنا اور ہنس دیا۔

مان لو معاذ منیر کہ تم اس کی محبت میں مبتلا ہو چکے ہو اور بری طرح ہو چکے ہو۔

اگلے دو ہفتوں میں، میں نے اس کوٹھی کے کئی چکر لگائے اور کئی بار میں اسے اس گھر میں جاتے دیکھا۔ وہ اس گھر میں رہتی ہے۔ اس کا تو مجھے یقین ہو گیا تھا۔ لیکن اس تک رسائی کیسے ہو؟ میں کیسے اس سے بات کروں۔ میں ٹین ایجر لڑکوں کی طرح اس کے پاس جا کر محبت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا نہ فون کر سکتا تھا اور نہ ہی خط لکھ سکتا تھا۔

ہر بات مجھے اپنے اور اس کے وقار کے منافی نظر آتی تھی۔ سوچا منیب سے جا کر کہوں مگر وہاں نہ جانے کتنی لڑکیاں تھیں اب وہ آسمانی رنگ کے کپڑوں والی کون تھی۔ بارات کے ساتھ آئی تھی یا ان کی طرف سے تھی۔ تب میں نے عالین سے مدد لینے کا سوچا۔ ''مجھے محبت ہو گئی ہے عالین!'' ایک روز میں نے اسے فون کیا۔

"ہیں" کیا واقعی...... وہ پرجوش ہوئی۔ "کون ہے، کہاں رہتی ہے، نام کیا ہے؟"

"اسلام آباد میں۔ نام مجھے معلوم نہیں اور کسی ملک ممتاز کی بیٹی ہے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو معاذ!"

"نہیں لیکن شاید ہو جاؤں گا۔ عالین پلیز تم آ جاؤ" پھر میں نے اسے ساری تفصیل سنا دی۔

"یہ تو بالکل فلمی سی سچوایشن ہے۔ ہے نا ماذی!"

"سچوایشن کچھ بھی ہو عالین! لیکن مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔"

"کم از کم اس کا نام تو پوچھ لیتے۔"

"تم آ کر پوچھ لینا۔" عالین سے بات کر کے میرے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا تھا۔

اور میں گاڑی لے کر لائبریری کی طرف نکل گیا۔ مجھے اس کتاب کا خیال آ گیا تھا جو اس روز پڑھے بنا آ گیا تھا۔ میں نے جب لائبریری میں قدم رکھا تو وہ ہال سے نکل رہی تھی۔ اس کی وہی سانولی سی دوست اس کے ساتھ تھی۔ جو کہہ رہی تھی۔ "یار! اب تم بھی منگنی کروا ہی لو۔ ہمارا گروپ منگنی شدہ ہو چکا ہے۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو کبھی کبھی۔ کیا یہ میرے اختیار میں ہے اور پھر ابھی مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے۔"

میرا جی چاہا میں خوشی سے ناچنے لگوں۔ اس روز اس نے وائٹ شلوار پر پرپل ہی دوپٹا پہنا ہوا تھا۔ اس پر ہر رنگ اچھا لگتا تھا شاید سارے رنگ اسی کے لیے تخلیق کیے گئے تھے۔

اور پھر میں نے اسے ایک بار اور بک سنٹر پر دیکھا۔ وہ کتابیں خرید رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے ساتھ موجود اپنی سہیلی سے تبصرہ بھی کرتی جا رہی تھی۔ شاید وہ دونوں بہت گہری سہیلیاں تھیں۔

"یہ کہانی، یہ دیکھ رہی ہو۔ اسے ایک بڑے رائٹر نے ترجمہ کیا ہے کسی ترکی کے ادیب کی کہانی ہے جو اس نے 1908 میں لکھی تھی میں نے یہی کہانی اردو میں پڑھی ہے اور لکھنے والے نے اسے لکھتے ہوئے کچھ تبدیل نہیں کیا لیکن تھیم، موضوع، آغاز انجام سب کچھ وہی ہے۔ لیکن کہیں بھی یہ نہیں بتایا کہ یہ ترجمہ کی گئی ہے یا ماخوذ ہے۔ ہمارے ہاں کے اردو رائٹرز میں یہ خامی ہے کہ وہ غیر ملکی ادب کو اردو میں منتقل کرتے ہیں تو حوالہ نہیں دیتے کہ یہ ترجمہ ہے یا فلاں کہانی سے ماخوذ ہے۔ اردو میں اکثر بڑے بڑے ادیبوں نے خیالات اور آئیڈیاز انگریزی ادب سے لیے ہیں کوئی سارتر کی فلاسفی سے متاثرہ ہے اور کسی نے البرٹ کامیو کو لفظ لفظ ترجمہ کیا ہے۔"

"یہ لڑکی اپنی ہر سوچ اور خیال میں منفرد ہے۔"

کاونٹر پر کتابیں دیکھتے ہوئے میرے کان اسی کی طرف لگے ہوئے تھے۔ یہ لڑکی ایسی ہے کہ اس کی ہم سفری میں زندگی کا سفر بہت خوبصورت ہو۔"

میں نے عالین کو اتنے فون کیے کہ وہ آ گئی اور آتے ہی ڈیڈی سے کہا۔

"یہ آپ کے بیٹے صاحب محبت بھی کر بیٹھے اور انہیں نام تک نہیں معلوم۔" ڈیڈی پہلے تو بہت ہنسے اور پھر میرا دفاع کیا۔

"شریف بچہ ہے۔ سیدھے سادھے طریقے سے اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔"

"لیکن انکل! اگر ملک صاحب کی دو بیٹیاں ہوئیں تو ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ کسے پروپوز کرنا ہے؟" عالین نے شرارت سے مجھے دیکھا۔

"پھر میں آپ کو دکھا دوں گا۔ مجھے علم ہے کہ وہ کتنے بجے یونیورسٹی سے گھر آتی ہے۔"

"واؤ۔ ڈیڈی نے مصنوعی حیرت سے عالین کی طرف دیکھا۔ لگتا ہے صاحبزادے ان دنوں یہی کام کرتے رہے ہیں۔" میں جھینپ گیا میں ڈیڈی سے بے تکلف ضرور تھا لیکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اس سے محبت میں بے اختیار ہو گیا ہوں اور وہ میرے حواس پر چھا گئی ہے مجھے لگتا ہے یہ وہی لڑکی ہے جسے میرا ہونا تھا جس کا مجھے انتظار تھا پھر عالین آ گئی اور پھر میں نے اسے ملک ممتاز کا گھر دکھا دیا تھا اور ایک روز اپنی مما کے ساتھ وہاں چلی گئی۔

"آپ کی بیٹی کو کسی فنکشن میں دیکھا تھا، پوچھ کر چلے آئے۔" عالین اور آنٹی نے یہی کہا تھا"

ملک ممتاز کی ایک ہی بیٹی ہے۔ دو بڑے بھائی ہیں اور وہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔"

عالین نے آ کر مجھے بتایا تھا۔

تمہاری نظر کی داد نہ دینا زیادتی ہے۔ ماذی! وہ ایسی لڑکی ہے کہ تمہارے ساتھ ہی جچتی ہے۔ اتنی خوبصورت کہ ایک لمحے کو تو بندہ مبہوت ہو جائے۔"

عالین کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تعریف کر رہی تھی۔ شاید اس نے میری آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ جاذب نظر ضرور تھی لیکن مبہوت کر دینے والا حسن نہیں تھا۔ مگر جب وہ بات کرتی تھی تو روح میں اترتی تھی کسی ہولے ہولے بہتے چشمے کی طرح نکھری ہوئی سوچ تھی اس کی۔

"آبگینہ نام ہے اس کا۔ آبگینہ ممتاز لیکن سب اسے آبگینے کہہ کر بلاتے ہیں۔" عالین نے بتایا۔ اور میں نے دل ہی دل میں کتنی بار اس نام کو دہرایا۔

میرے مقدر کے ستارے عروج پر تھے کہ میرا نام اس کے ساتھ منسوب ہو گیا۔ اس روز مجھے لگا یا تھا جیسے میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں اور میری مٹھی میں آسمان کے ستارے ہیں۔

منگنی کے بعد وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی حالانکہ میں نے لائبریری کے کئی چکر لگائے تھے۔ بک سنٹر پر بھی گیا کئی بار اس ٹائم پر اس کے گھر کے پاس سے بھی گزرا۔ میں تو اسے دیکھنا چاہتا تھا کہ منسوب ہونے کے بعد اب استحقاق کے ساتھ اسے دیکھنا کیسا لگے گا۔ لیکن وہ تو کہیں چھپ کر بیٹھ گئی تھی تب عالین نے میری درخواست پر اس سے میری بات کروادی۔

مجھے اس کی آواز کچھ مختلف سی لگی لیکن شاید فون کی وجہ سے تھا پھر میں نے کون سا اسے زیادہ سنا تھا۔ شادی اس کے فائنل امتحان کے بعد ہونا تھی میں سنگاپور اور ہانگ کانگ کے ٹور پر چلا گیا۔ پھر وہیں سے ہی میں عالین کے پاس گیا۔ جہاں عالین اور اس کے میاں نے میرا بہت ریکارڈ لگایا۔

''یہ تو اٹھارویں صدی کے عاشق جیسی حرکت کی ہے تو نے یار! وہ جو چلمن کے پیچھے کوئی چہرہ دیکھ کر عاشق ہو جایا کرتے تھے اور شادی کا پیام بھجوا دیتے اور شادی کے بعد پتا چلتا جو چہرہ چلمن کے پیچھے تھا وہ تو کسی ملازمہ کا تھا اور......'' انھوں نے قہقہہ لگایا۔

ایک لمحے کو میرا دل کانپ گیا۔ خدا نہ کرے کہ میرے ساتھ ایسا ہو۔ اسی لیے جب میں واپس آیا تو اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بہت بیتاب تھا پھر اس روز جب میں عمیر بھائی کے بلانے پر گیا تو وہ گیٹ کے پاس کھڑی تھی اور اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ ٹی پنک لباس میں وہ بہت فریش اور دل میں اتر جانے کی حد تک دلکش لگ رہی تھی۔

شاپنگ سے واپسی پر عمیر بھائی مجھے گھر لائے تھے اور ڈرائنگ روم سے نکل کر جب ہم لاؤنج میں آئے تو وہ کچن کے دروازے پر کھڑی تھی اس کی پشت میری طرف تھی اور اس کے لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے تھے۔ ہماری آواز پر وہ تیزی سے کچن میں گھس گئی۔

''یہ آبگینے تھی۔'' عمیر بھائی نے بتایا۔

اب تو شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ جو دبئی سے میں دل میں ایک کانٹا سے لیکر آیا تھا، خود بخود نکل گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے گیٹ پر دیکھا تھا انہی کپڑوں میں اور اب گھر میں۔

شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور میں اس کے تصور میں کھویا رہتا۔

مجھے لگتا تھا جیسے دن بڑے اور طویل ہو گئے ہیں۔ مہندی کا فنکشن مشترکہ تھا۔ اسے اسٹیج پر بٹھایا گیا تو میری نظریں بے اختیار اسٹیج کی طرف اٹھی تھیں۔ لیکن اس کا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ پھر جب میں اس کے قریب بیٹھا تو میرا جی چاہ رہا تھا میں اس سے میٹھی میٹھی سرگوشیاں کروں۔ میں نے اس کے ہاتھ کو ذرا سا چھوا تھا۔ مجھے اپنے بے حد شرارتی دوستوں اور کزنز کا بھی خیال تھا جنہیں کبھی میں نے بے حد تنگ کیا تھا اور اب وہ میری تاک میں تھے اور مجھ پر فقرے چست کر رہے تھے۔ میں عجب سرشاری سی کیفیت میں گھرا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے میں نے آبگینہ بنت ملک ممتاز کو قبول کیا تھا۔ دل کی پوری رضامندی اور خوشی کے ساتھ۔ اور وہ جو سر جھکائے لمبا گھونگھٹ لٹکائے میرے برابر بیٹھی تھی، اب میری تھی۔ میں نے پچھلے سات آٹھ ماہ میں اسے اتنا سوچا تھا کہ خود گم ہو گیا تھا۔ اس کی محبت میرے روم روم میں سرایت کر چکی تھی اور اب میرے برابر بیٹھی میرے صبر کو آزما رہی تھی۔ ملکیت کے خوش کن احساس کے ساتھ میں اس کی طرف مڑا تھا۔ مہین دوپٹے میں سے اس کی پیشانی نظر آرہی تھی اور جھکی جھکی آنکھیں۔ ناک سے نیچے تک سیاہ نقاب تھا۔ میں نے اس سے کچھ کہا تھا کہ اس نے بے اختیار نظریں اٹھائی تھیں بس ایک لمحہ کے لیے اور پھر جھکا لی تھیں لیکن میں چونک گیا تھا۔ الجھ گیا تھا۔ یہ آنکھیں اتنی ساحر تو نہ تھی۔ کہیں کچھ مختلف تھا۔

شاید میرا وہم ہے۔ میں نے خود کو بار بار جھٹلایا پھر بھی آنکھوں میں اردگرد کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے اور دل جیسے ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔ دلہنیں جب میک اپ کرتی ہیں تو شکل بھی بدل جاتی ہے۔

ایک بار میرے ایک دوست نے تبصرہ کیا تھا۔

''یار! میں ایک بار اپنی بھابی کو بیوٹی پارلر سے لیکر گیا اور گاڑی میں انتظار کرنے لگا۔ کیا بتاؤں، عام سی شکل وصورت کی لڑکیاں پریاں بن کر باہر آرہی تھیں۔''

اس روز ہم بہت ہنسے تھے لیکن آج اس کی بات یاد کر کے میرے دل کو کچھ تقویت ملی تھی۔ شاید اس کی جو جھلک مجھے اجنبی سی لگی تھی اس میک اپ کی وجہ سے ہو۔

لیکن اس کی گود میں دھرے ہاتھ بالکل سنگ مرمر سے تراشے ہوئے لگ رہے تھے۔

گداز گداز سے موی انگلیوں والے ہاتھ۔ اور اس کے ہاتھ...... میں نے لائبریری جلدی جلدی نوٹس بناتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ لانبی مخروطی انگلیوں والے ہاتھ اتنے سفید تو نہیں تھے۔

میں الجھ رہا تھا اور یہ الجھن صبح بھی میرے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"تم رات کو سوئے نہیں۔" عالین نے ناشتے پر مجھ سے پوچھا تھا۔ "بس یونہی نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"چلو اٹھو اور اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔" چائے پی کر میں لاؤنج میں صوفے پر آ کر بیٹھا تو عالین نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھا دیا۔

"اتنے تھکے تھکے چہرے کے ساتھ دولہا بنتے اچھے لگو گے اور خبردار کسی نے ماذی کو ڈسٹرب کیا تو۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے دوسرا حکم جاری کر دیا۔ اس سے مجھے اس پر بڑا پیار آیا عالین کے ہوتے ہوئے آج تک مجھے بہن کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا لہٰذا تھوڑی دیر میں ہی سو گیا لیکن جب اٹھا تو وہ الجھن اسی طرح تھی۔ وہ کچھ مختلف کیوں لگی تھی۔ کہیں تو کچھ فرق تھا۔

اور پھر سہرا بندی کے بعد جب میں فوٹو سیشن کے لیے گیا اور سمیر بھائی نے مجھے گلے سے لگایا اور میرا ہاتھ پکڑے پکڑے اس کمرے میں آئے جہاں وہ سجی سنوری بیٹھی تھی۔ آج اس کے چہرے پر گھونگھٹ نہیں تھا۔ اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا وہ بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔

میں نے فوراً اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور ادھر ادھر دیکھا دائیں بائیں سارے کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ سوائے ہم دونوں کے۔

یہ کیا ہوا تھا میرے ساتھ؟ کیسا دھوکا ہو گیا تھا؟

یہ وہ لڑکی نہیں تھی جس کے پیچھے میں ایک مہینے تک کسی دیوانے کی طرح بھاگتا رہا تھا۔ میں نے کتنی ہی بار اسے اس گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ مجھے بھائی کا مذاق یاد آیا۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو گیا تھا لیکن وہ کون تھی...... کہاں گئی اور اس روز ٹی پنک کپڑے میں میں نے بہت غور سے میں نے اسے دیکھا تھا۔ جب اس نے مڑ کر گاڑی کی طرف دیکھا تھا پھر اندر کچن میں گو میں نے شکل نہیں دیکھی تھی لیکن وہی کپڑے وہی قامت اور عمیر بھائی نے کہا تھا، یہ آبگینے ہے۔

وہ آبگینے تھی تو پھر یہ کون تھی؟ میں وہیں دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ مجھے وہاں کھڑے کافی دیر ہو گئی ہے۔ مجھے آگے بڑھنا چاہیے، کچھ تو کہنا چاہیے۔

کل رات میں نے اسے بقائمی ہوش وحواس قبول کیا تھا اور آج...... اور آج میں نے بہت ہمت کر کے قدم آگے بڑھایا۔ سمیر جان بوجھ کر مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ گئے تھے اور ابھی فوٹو سیشن ہونا تھا۔ بارات روانہ ہونی تھی۔ اسی لیے وہ جلد ہی آ گئے ان کے ساتھ یونیک کا فوٹو گرافر تھا۔

کچھ پوز کمرے میں لینے کے بعد وہ ہمیں اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ عمیر کمرے میں ہی بیٹھے میرے دوست اور کزن سے باتیں کرتے رہے۔

باہر مختلف قسم کے بیک گراؤنڈ ترتیب دیے گئے تھے کہیں بارہ دری بنی تھی اور کہیں لکڑی کا منقش دروازہ کھڑا تھا۔ تصاویر بن رہی تھیں۔ میں بالکل خاموش تھا۔ میرے اندر یکدم سناٹے اتر آئے تھے۔ ایک دم خالی خالی ہو گیا تھا میرا وجود۔ کتنی ہی بار یونیک کے ظفر محمد نے مجھے مسکرانے کے لیے کہا۔ مسکرانے کی کوشش میں میرے ہونٹ صرف پھیل کر رہ گئے۔ جب ظفر محمد کے کہنے پر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو مجھے لگا وہ بالکل سرد ہو رہا ہے۔ تب چونک کر میں نے اسے دیکھا وہ گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔

مجھے اس سے کچھ کہنا چاہیے۔ کوئی خوبصورت ستائشی جملہ۔ کوئی ایسی بات جو دولہا ان لمحوں میں کہتے ہیں لیکن میرے اندر تو جیسے تمام لفظ گونگے ہو گئے تھے۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا پھر سیشن ختم ہو گیا۔

"میں نے اتنا سنجیدہ دولہا کبھی نہیں دیکھا۔" وہ ہنسا لیکن میں مسکرا بھی نہ سکا۔

ابھی کچھ دیر بعد میری بارات روانہ ہونا تھی۔ ایک ہزار کے قریب مہمان انوائٹڈ تھے۔

اس وقت میں کس قدر بے بس تھا۔ گھر آ کر میں نے عالین کو تلاش کیا لیکن وہ نہ جانے کہاں تھی؟

اور اگر وہ مل جاتی تو میں کیا کہتا۔ "عالین! یہ وہ لڑکی نہیں جسے میں نے چاہا تھا۔"

سات مہینے پندرہ دن کی میری محبت میرے اندر بین کر رہی تھی زندگی میں اتنی بے بسی میں نے کبھی محسوس نہیں کی جتنی اس وقت کر رہا تھا۔ میری حالت اس شخص کی سی ہو رہی تھی جو خواب میں چلتا ہوا دلدل میں پھنس گیا ہو نہ پیچھے جا سکتا ہو اور نہ آگے۔ دونوں طرف موت تھی۔

مجھے علم نہیں کب بارات روانہ ہوئی۔ کس نے کیا کہا، کون میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اور کب ہم وہاں پہنچے۔ میں ایک انسان سے یکایک ایک روبوٹ میں بدل گیا تھا۔

مجھے جو بھی کچھ کہا جا رہا تھا، میں کر رہا تھا۔ اس میں میرا اپنا اختیار اور مرضی شامل نہ تھی۔ تب یکایک میں نے اسے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا اور میرے اردگرد کا سب شور بند ہو گیا۔ میں صرف اسے دیکھ رہا تھا، اسے سن رہا تھا۔ وہ بے حد تھکی تھکی اور افسردہ سی لگ رہی تھی

اس نے کوئی جھلملاتے کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھے۔اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ رو کر آئی ہو، کیا اسے بھی کسی زیاں کا احساس ہے۔کیا وہ بھی......

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچے چلا جا رہا تھا۔وہ آبگینے سے بات کر رہی تھی۔

پھر عمیر اسٹیج پر آئے اور انھوں نے اس کا ہاتھ تھام کر تعارف کروایا۔

"یہ خدیجہ ہے تمہاری"

"خدیجہ......خدیجہ۔"اس نام سے میرے اندر چراغاں ہو گیا۔میں بھول گیا کہ کل میرا نکاح جس لڑکی سے ہوا ہے، وہ میرے پہلو میں بیٹھی ہے۔

اور یہ لڑکی جو اسٹیج پر کھڑی ہے میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں۔میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا جب بہت ساری لڑکیاں اور لڑکے اسٹیج پر رسم کے لیے چڑھ آئے تھے۔

میں کچھ نہیں سن رہا تھا کہ وہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔میری دنیا صرف ایک نقطے میں سمٹ آئی تھی۔وہ میرے سامنے کھڑی تھی لیکن وہ میری نہیں تھی۔

احساس زیاں میرے پورے وجود کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھا اور اندر کوئی بین کر رہا تھا، رو رہا تھا، میری آنکھیں جل رہی تھیں بلکہ پورا وجود جل رہا تھا جب عمیر کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"یار! یہ خدیجہ اصل حقدار ہے۔اس کا سب سے زیادہ حق ہے تم پر۔"

میرا دل چاہا میں کہوں عمیر بھائی! یہ تو مجھ سارے پر اپنا حق رکھتی ہے۔یہ تو مجھ پر حکومت کرتی ہے میں تو پور پور اس کا ہوں لیکن میں نے لب سختی سے بھینچ لیے تھے اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ تھا بغیر گنے اس کے پھیلے ہاتھوں پر رکھ دیا تھا۔

میں نے تو اپنا آپ، اپنا پورا وجود ان پھیلے ہاتھوں میں رکھنے کی چاہ کی تھی لیکن تقدیر نے میرے ساتھ بہت سنگین مذاق کیا تھا۔

میں اس وقت جس امتحان سے گزر رہا تھا۔زندگی میں کبھی [illegible] سخت امتحان سے نہیں گزرا تھا۔میں نے جس ہاتھ کو ہاتھ میں لیکر زندگی کا سفر طے کرنے کی چاہ کی تھی، وہ ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔کاش میں وقت کو پیچھے موڑنے پر قادر ہوتا۔

وہ آنکھوں میں حیرانی بھرے کچھ کہہ رہی تھی۔پتہ نہیں کیا۔میرے اردگرد آواز یکا یک مر گئی تھی۔سب ہنس بول رہے تھے لیکن مجھے صرف ان کے ہلتے لب اور مسکراتے چہرے نظر آ رہے تھے۔"کیا میں بہرا ہو گیا ہوں۔"میں نے بے بسی سے عالین کو ہجوم میں ڈھونڈنے

کوشش کی۔وہ عالین تھی میری بہن میری کیفیت میرے چہرے سے کھوج کر مجھے یہاں سے ضرور اٹھا لے جاتی۔

پھر عالین آ گئی اس نے میرے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر جلدی کا شور مچا دیا لیکن جلدی بھی جیسے صدیوں پر محیط ہو گئی تھی۔گھر میں لاؤنج میں دلہن کو بٹھا کر خدا جانے کیا کیا کروایا جا رہا تھا۔

"خدا کے لیے عالین! یہ سب ختم کرواب۔"میں نے التجا کی۔

"اب ساری زندگی اسے ہی دیکھنا ہے تھوڑا صبر کرلو۔"عالین نے مجھے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا تو میں جھنجلا گیا۔

"عالین! میں تھک گیا ہوں میری طبیعت خراب ہے۔اگر حرج نہ ہو تو میں جا کر ڈیڈی کے کمرے میں سو جاتا ہوں۔آج رات کے لیے مجھے معاف کردو۔جو بھی رسمیں کرنی ہیں کر کے دلہن کو سونے کے لیے بھیج دو اور......""پاگل ہو گئے ہو معاذ! عالین نے مجھے ڈانٹ دیا۔"

پھر میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"او کے، میں آبگینے کو کمرے میں لے چلتی ہوں۔"میرا جی چاہا کہ میں عالین کی منت کروں کہ آج کی رات، صرف آج کی رات مجھے تنہا چھوڑ دو۔مجھے اپنی لاحاصلی کا ماتم کرنے دو۔مگر میں یہ سب نہیں کہہ سکتا تھا۔اس لیے خاموشی سے عالین کے کہنے پر اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

اس لڑکی کا کوئی قصور نہ تھا جو نہ جانے دل میں کیا کیا جذبات لیے اس وقت میری منتظر تھی۔

قصور اس کا نہ تھا قصور تو میری قسمت کا تھا، مجھے اپنی لاحاصلی کی سزا سے نہیں دینا لیکن اس وقت آج رات مجھے کچھ مہلت چاہیے تھی۔کچھ وقت تا کہ میں اپنے منتشر اعصاب کو جوڑ سکوں۔میں نے کچھ کہا تھا اس سے شاید التجا کی تھی۔

اس کی آنکھوں میں حیرت تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔میری التجا قبول کر لی تھی شاید وہ کھڑی ہو گئی تھی بیڈ کے ساتھ کھڑی وہ آسمان سے اتری کوئی مخلوق لگ رہی تھی......اتنا حسن۔ایک لمحہ کو میں مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ ہاتھ پھیلائے حیرانی سے مجھے تکتی ہوئی اور پھر میری نظروں سے دور ہوتی ہوئی۔

کیا اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ ہاں شاید ایک لمحہ کو اس کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ نمودار ہوئے تو تھے اور پہچان بھی کیا...... اس نے شاید دھیان سے مجھے دیکھا بھی تھا یا نہیں، یہ تو میں تھا جو روز اول ہی دل ہار بیٹھا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ تو بیت چکی تھی اور جو چند گھنٹے باقی تھے وہ کیسے گزرے تھے مجھے یاد نہیں۔ میں کھو گیا تھا یا گم ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا میں جو کہہ رہا ہوں جو کر رہا ہوں کسی خواب کی کیفیت میں کہہ رہا ہوں۔ میں اس خوبصورت معصوم لڑکی کے دل کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا لیکن اس سے میں بالکل بے بس تھا، مجبور تھا۔ پھر بھی میں نے کوشش کی تھی کہ اسے کم سے کم تکلیف دوں۔ کم سے کم ہرٹ کروں۔

میں نے رونمائی میں اسے دینے کے لیے بریسلیٹ نکالا تو ایک لمحہ کو کھو گیا۔ میں نے دبئی کی کتنی دکانیں چھان ماری تھیں، تب اسے پسند کیا تھا۔ وہ میری نظروں کے سامنے آ گئی تھی۔ اس کی بڑھی ہوئی کلائی ہاتھ میں لیتے ہوئے جیسے کئی خواب میری آنکھوں میں رو پڑے تھے اور پھر وہ کئی صدیوں میں محیط رات گزر گئی تھی۔

اب مجھے ڈرامہ کرنا تھا۔ میں کسی ڈرامے کا وہ کریکٹر تھا جس کا دل زخمی تھا چور چور تھا جس سے اس کی متاع عزیز چھین لی گئی تھی لیکن اسے خوش ہونے کی ایکٹنگ کرنا تھی۔

ولیمہ والے دن سب بہت ہی خوش تھے۔ ڈیڈی نے انکل نے سب نے ہی مجھے گلے لگا کر دعائیں دی تھیں ایک خوشگوار زندگی کی کہیں کوئی آنسو ڈیڈی کی پلکوں پر چمکا تھا ماما کی یاد کا آج وہ ہوتیں تو......

اور سب نے اس سے جانا کہ میں ماں کی کمی محسوس کر رہا ہوں اس لیے یوں بکھرا بکھرا ہوں۔ کوئی نہ جان سکا کہ میری تو کائنات ہی لٹ گئی ہے۔ سب جیسے میرے اردگرد مجھے خوش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

اور پھر گیٹ پر ڈیڈی اور کزنز کے ساتھ کھڑے مہمانوں کو ریسیو کرتے میں نے اسے دیکھا۔ آج وہ کل کے مقابلے میں زیادہ فریش تھی۔ اس نے لائیٹ پرپل اور پنک کے امتزاج کا خوبصورت بناری سوٹ پہن رکھا تھا۔

اردگرد کھڑی لڑکیوں نے گلاب کی پتیاں ان پر پھینکی تھیں جن میں سے کچھ اس کے بالوں میں اٹکی رہ گئی تھیں اور کیا اس پوری محفل میں کوئی اس جیسا تھا۔ میرے دل نے تڑپ کر کہا۔

''نہیں......''

حتیٰ کہ وہ اسٹیج پر بیٹھی دلہن جو سب کی نظروں کا مرکز تھی اور جس کے حسن و معصومیت اور دلکشی کی تعریفیں سب ہی کر رہے تھے میرے لیے اس کے سامنے کچھ نہ تھی۔

''خدیجہ۔'' میرے لبوں نے بے اختیار اس کے نام کا لمس محسوس کیا تھا۔ وہ چونکی تھی۔

''کیسی ہیں آپ''

''اچھی ہوں۔'' مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور وہ آگے بڑھ گئی۔

میں نے اسے اسٹیج کی طرف جاتے دیکھا وہ بیتابی سے آبگینے کے گلے لگی تھی اور پھر وہ اس کے قریب ہی بیٹھ کر سرگوشیاں کرنے لگی۔ ایک لمحہ کو میرا دل دھڑکا۔

پتا نہیں آبگینے کیا کہہ رہی تھی لیکن میں نے اسے کلائی آگے کر کے بریسلیٹ دکھاتے ہوئے دیکھا۔

خدیجہ کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ شاید اس نے اس کی تعریف کی تھی۔ مجھے لگا جیسے میری محنت وصول ہو گئی ہو۔ تقریب میں سارا وقت میری نظریں اسے اپنے حصار میں لیے رہیں۔ عالین نے اگلے کئی دن مجھے جج کیا تھا۔

''کیا ہوا ماذی!'' ایک روز اس نے مجھے پکڑ لیا۔

''کیا کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے؟'' اس کی نظریں مجھے کھوج رہی تھیں۔

''نہیں تو۔'' میں زبردستی مسکرا دیا۔

''مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا۔'' میں نے اسے ٹال دیا تھا

لیکن خود کو کیسے ٹالتا۔ اس نے مجھے اتنا بے بس کر دیا تھا کہ میرے اندر باہر کسی دوسرے نام کی جگہ نہ بچی تھی۔ میں نے تسلیم کر لیا تھا کہ سب اسی طرح ہونا تھا۔ پہلے دن سے لوح محفوظ پر لکھا جا چکا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے نہ ہو سکیں گے۔ یہ میری کوتاہی یا لاپرواہی نہ تھی۔ مجھے وقت نے بیدردی سے دھکیل دیا تھا اپنے راستے سے۔ میں دن رات اسے سوچتا تھا بہت زیادہ۔ میں ایک ٹرانس میں رہنے لگا تھا اور اس ذہنی موسم میں خود کو اور اسے اکٹھا دیکھتا۔

اس کی شبیہ کو مجسم کر کے دیکھنے میں کئی راتیں جاگتے میں گزار دیتا ان راتوں میں آبگینے کو میں بہت بے چین دیکھتا مجھے اس کا خیال تھا۔ میں کوشش کرتا کہ اسے خوش رکھ سکوں۔ اس کے سامنے خوشبو کے ڈھیر لگا دوں لیکن میرے پاس اس کے لیے خوبصورت جذبوں سے پر لفظ نہیں تھے۔ میں چاہنے کے باوجود ایک بار بھی اسے یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پیاس دیکھی تھی لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

ولیمہ کے بعد جتنی بار بھی اس سے ملا مجھے لگا جیسے میں پروانے کی طرح اس کے گرد چکر لگا رہا ہوں۔

میں کتنی ہی بار آبگینے کے ساتھ اس کے میکے گیا محض اسے دیکھنے اور سننے کی چاہ میں اور ہر بار مجھے لگا جیسے میں پہلے سے زیادہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ وہ بولتی تو میں اسے سنتا رہتا۔

اس کے اور عمیر کے درمیان بڑی علمی و ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ میں اس کی گفتگو کے حسن میں کھو جاتا۔

مجھے اس کی ذہانت متاثر کرتی۔ مجھے اس کا لہجہ مسحور کر دیتا۔ وہ چائے بناتی تو میرا جی چاہتا یہ خوشبو اڑاتی چائے میں اس کے ہاتھ سے پیوں۔

جب بھی ہم جاتے، ہمارے لیے کھانے کا اہتمام کرتے ہوئے وہ خود اپنے ہاتھ سے ایک دو ڈشز ضرور بناتی اور میں صرف وہی ڈشز کھاتا۔

میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں کدھر کو بھاگ رہا تھا۔ میری منزل کہاں تھی؟ کدھر تھی۔ میں خود کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا تھا۔

ایک جنگ میرے اندر مسلسل جاری تھی اور اس گھمسان کی جنگ میں مجھے میری فصیل کمزور ہوتی محسوس ہوتی۔ میں سوچتا اب میں آبگینے کے ساتھ اس کے میکے نہیں جاؤں گا۔ دو تین بار میں خود پہ جبر کر کے خود کو روک لیتا لیکن تیسری بار پھر بے اختیار ہو جاتا۔ وہ اپنے ددھیال سے ہمیشہ کے لیے یہاں آ گئی تھی۔ کاش وہ نہ آتی۔ میں صبر کر لیتا بھول جاتا لیکن وہ میرے سامنے تھی، مجھ پر ستم ڈھاتی۔

''لوگ بہت لالچی اور کمینے ہیں۔'' ایک روز وہ آبگینے سے کہہ رہی تھی۔

''دادی کے مرتے ہی سب ہم سے پوچھنے لگے کہ ہم واپس کب جائیں گے۔ حالانکہ دادی نے کہا تھا کہ ہم اب یہاں ہی رہیں، حق ہے ہمارا۔ لیکن ہمیں کسی حق کی ضرورت نہ تھی۔ ہم تو صرف دادی کی خدمت کر رہے تھے کہ ان مشکل لمحوں میں سب نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔''

''نہیں۔'' ''اپنا حق نہیں چھوڑنا چاہیے خدیجہ!'' سمیر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم کہو تو ایک وکیل دوست سے بات کروں۔''

''نہیں اس نے منع کر دیا۔''

وہ خالی ہاتھ تھی۔ لیکن اس کا اغناء دیکھنے کے لائق تھا۔

ہماری شادی کو چھ ماہ گزر گئے تھے۔ پتا نہیں کیسے گزرے تھے۔ میں ایک مشین کی سی زندگی گزار رہا تھا میرے صبح و شام، دن اور رات میرے اختیار میں نہیں تھے۔

میرا دل بہت سی باتوں کو چاہتا تھا لیکن ان میں سے ایک بھی میرے بس میں نہیں تھی۔ خدیجہ کی رفاقت کی خواہش دل میں ابھرتی تو میں کسی مجرم کی طرح اسے چھپا لیتا۔

آبگینے بے حد خاموش رہنے لگی تھی۔ مجھے اس پر رحم آتا تھا۔ وہ کسی اور کے گھر ہوتی تو بہت خوش رہتی میں اسے دیکھتا تو احساس جرم کا شکار ہو جاتا۔

زیادہ سے زیادہ اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا لیکن مجھے آبگینے کے چہرے پر وہ خوشی کبھی نظر نہ آئی جو ہونی چاہیے تھی۔ شاید وہ بھی میری طرح مشین کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ بہت سارے جھوٹے لمحات میں سے چھوٹی خوشیاں کشید کرنے کا سوچ کر خود کو دھوکا دے کر اپنا آپ بھی ایک دھوکے کی طرح لگنے لگا تھا۔

ایسے میں خدیجہ مجھ سے کترانے لگی۔ آبگینے اسے بلاتی رہتی مگر وہ پہلے جیسی بے تکلفی سے گھر نہیں آتی تھی۔ شاید اس نے میرے جذبات کو محسوس کر لیا تھا۔ کئی بار میں نے اس کی پیشانی پر ناگواری شکنیں محسوس کی تھیں۔

''نہیں، میں ایسا نہیں ہوں خدیجہ!'' میں تڑپ اٹھا تھا۔ ''تم مجھے غلط مت سمجھو۔'' مجھے اس کی بدگمانی نے اپ سیٹ کر دیا تھا۔ میری تمام اذیتوں میں سے سب سے بڑی اذیت یہ تھی کہ وہ مجھے غلط سمجھ رہی تھی۔

کاش میں اس سے نہ ملا ہوتا۔ کاش میں اسے دل و دماغ سے نکال کر دوبارہ اپنی تاریخ مرتب کر سکتا۔ کاش میں نے کبھی اس سے اظہار کر دیا ہوتا وہ مجھے دھتکار دیتی میں اپنی نارسائی کو قبول کر لیتا لیکن اس لاحاصلی نے آبگینے کو بھی لاحاصل کر رکھا تھا۔ یہ عجیب و غریب خواب نما سی زندگی تھی جو میں گزار رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کسی روز سب ختم ہو جائے گا میں جس State of thought میں Exit کر رہا تھا وہ بہت اذیت ناک تھی۔

میں خود لڑتے لڑتے تھک چکا تھا کہ ایک روز اس سے وہ سب کچھ کہہ بیٹھا جو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ اس روز آبگینے سے ملنے آئی تھی لیکن آبگینے پڑوس میں کسی شادی کی تقریب میں آنٹی کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔ وہ واپس جانا چاہتی تھی کہ بے اختیار میں نے اسے پکار لیا۔

''خدیجہ......! خدا کے لیے مجھے ان بدگمان نظروں سے مت دیکھو۔'' اور میں نے روز اول سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔

اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی تھی۔ اسے لائبریری کی ملاقات اور کے ایف سی میں میری موجودگی سب یاد تھی۔ میں خوش ہوا کہ اس نے میری بات کا اعتبار کیا تھا۔

”آبگینے مجھے بے حد عزیز ہے اور شاید یہ اسی طرح ہونا لکھا تھا اور آپ کو بھی اسے قبول کر لینا چاہیے۔ وہ بے حد پیاری، مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی ہے آپ اسے محبت دیں گے، اسے دل سے قبول کر لیں گے تو محبت خود ہی ہو جائے گی۔“

اس نے بہت نرم لہجے میں بہت اعتماد کے ساتھ کہا تھا۔

”میں بہت کوشش کرتا ہوں خدیجہ! لیکن کبھی کبھی تمہاری قربت کی خواہش اتنی شدت سے ابھرتی ہے کہ ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا۔ میری خواہش میں کوئی غرض، کوئی کھوٹ نہ تھا میں نے تم سے فلرٹ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔“

اس کے چہرے کا رنگ ذرا دیر کو بدلا تھا۔

”خود کو سمجھائیں معاذ صاحب! اسی میں آپ کی بہتری ہو گی اور اللہ کو یہی منظور تھا۔“

”میں سب کچھ جانتا ہوں خدیجہ! یہ سب کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں کچھ غلط کرنا چاہتا ہوں یا سوچ رہا ہوں۔ میں صرف تمہاری آنکھوں کی بدگمانی سے ٹوٹنے لگا تھا۔ عورت مرد کی نظروں کو پہچان لیتی ہے۔ تمہیں بھی شاید میری آنکھوں میں وہ محبت نظر آ گئی تھی جو چھپانے کے باوجود کبھی کبھی عیاں ہو جاتی تھی۔ میں صرف تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ تم میری زندگی کی پہلی خواہش تھیں۔ آبگینے حادثاتی طور پر میری زندگی میں شامل ہوئی۔ اپنے راستے کی روشنیاں خود ساتھ ساتھ بجھاتے رہنا بہت اذیت ناک عمل ہے۔ بہت تکلیف دہ ایسے میں تمہاری وہ ناگوار نظریں مجھے مار ڈالتی تھیں۔“

اس نے بہت خاموشی سے میری بات سنی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک نارمل سا تاثر تھا۔

”میں آپ کے لیے دعا کروں گی۔ لیکن قوت ارادی مضبوط ہو تو سب ممکن ہے۔“ وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔

شاید دنیا کو اسے کندھوں پر اٹھانا آسان ہو لیکن ایک ضدی دل کو سمجھانا بہت مشکل تھا اور میں اس کوشش میں ہانپ ہانپ گیا مجھے لگتا جیسے میں دو دھاری تلوار پر چل رہا ہوں۔ مجھے آبگینے کو بھی مطمئن رکھنا تھا اور خود کو بھی سنبھالنا تھا۔

اب خدیجہ کی آنکھوں میں بدگمانی کی بجائے ہمیشہ ایک نرم سا تاثر نظر آتا تھا۔ لیکن وہ اب بھی ہمارے ہاں آنے سے کتراتی تھی اور جب میں آبگینے کے ساتھ وہاں جاتا تو وہ ادھر ادھر

ہو جاتی۔

آبگینے اس سے ناراض ہوتی گلہ کرتی تو وہ بس مسکرا دیتی۔ میں خود اس کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ لیکن میں آبگینے کو منع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ میکے نہ جائے اور اگر میں اسے اکیلے جانے کو کہتا تو اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔

احتیاط کے کانٹوں پر چلتے چلتے میرے پاؤں زخمی ہونے لگے تھے۔ میں اپنی شدت طلب سے خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ میں ایک معصوم بے گناہ لڑکی کو اس کے ناکردہ جرم کی سزا نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن میرا تصور اور میرے خواب میری دسترس میں نہیں تھے جو میرے اختیار اور دسترس میں تھا وہ سب میں نے آبگینے کو سونپ دیا تھا۔ میں کسی نازک کانچ کے برتن کی طرح ہی اسے سنبھال کر رکھتا تھا۔

اور خدیجہ کی طرف تو میں نے دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ ایک بار اس نے کہا تھا۔

”مجھے آپ کی نظروں سے خوف آتا ہے معاذ! کہیں میں رسوا ہی نہ ہو جاؤں۔ میں آپ کے لیے ایسا کچھ نہیں سوچتی۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو میں تو کہیں کی نہیں رہوں گی......“ ”تم بے فکر ہو جاؤ خدیجہ!“ ”میں تمہاری طرف کبھی دیکھوں گا بھی نہیں۔“

اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں نے اپنے ہر رگ احساس اور ہر ریشہ بدن کو اس کے چاروں طرف ڈھال بنا کر تان دیا تھا میں نے خود کو چھپانے کی آرزو میں ہر وہ کانٹا اپنے اندر اتار لیا تھا جو میرے حوالے سے اسے پریشان کر سکتا تھا۔

آبگینے کی آنکھوں میں گلہ صاف نظر آتا حالانکہ وہ کہتی کچھ نہیں تھی۔ ہر بار جب میں اس کے ساتھ میکے نہ جانے کا کوئی بہانہ بناتا تو اندر ہی اندر شرمندہ ہو جاتا۔ مجھ میں اس کی شکوہ کرتی نظروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

میں نے خدیجہ کو بھلانے کی ہر وہ کوشش کر ڈالی جو ممکن تھی۔ ایک دو ماہ کے لیے آبگینے کو لیکر فارن ٹور پر بھی چلا گیا لیکن سب بے سود تھا۔ میری محبت کی شدت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

میرا جی چاہتا وہ میرے اتنے قریب ہو کہ اس کی آواز اور سانس میری روح میں گھل جائے اور میں اس کے قرب اور آواز کے سحر سے پتھر کے بت میں تبدیل ہو جاؤں۔ میں اسے یونہی ساری عمر اپنے دل کی کتاب میں لفظ بہ لفظ لکھتا رہوں۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ احساس جرم بڑھتا جا رہا تھا میں آبگینے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔

خدیجہ نے مجھے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس کی طرف جاتے راستے میرے نہیں تھے لیکن ان کے نشانات بہت گہرے تھے۔ کبھی کبھی جب وہ آبگینے کے بہت مجبور کرنے پر گھر آتی تو میں نگاہیں جھکائے اسے سنتا رہتا۔

پتا نہیں اس میں دل کھینچ لینے والی نرمی اور تحمل کہاں سے اترا تھا کہ میں جیسے اس کے آس پاس بیٹھا پتھر ہو جاتا۔

''خدیجہ کیا سوچتی ہوگی، آپ نے اس سے بات تک نہ کی۔'' ایک دو بار آبگینے نے گلہ کیا۔

''میں بھلا کیا بات کرتا اس سے آبگینے! وہ تمہاری بہن ہے میں تو بس تم دونوں کو باتیں کرتا سن رہا تھا۔''

حالانکہ اگر تقدیر اسے میرا بنا دیتی تو میں سارا دن اسے سامنے بٹھائے اس سے باتیں کرتا رہتا اسے دیکھنے کے بعد شادی تک میرے اندر کتنے لفظ تخلیق ہوئے تھے جو مجھے اس سے کہنے تھے لیکن یوں ہی ہونا لکھا تھا ورنہ میرے دل میں تو ہزاروں ان کہے پیمان تھے ارادے تھے، وعدے تھے انتظار تھا کسک تھی تڑپ تھی۔

نارسائی اپنی جگہ لیکن میں نہ خود کیچڑ میں گر سکتا تھا نہ اس کی پاکیزگی کے دامن پر اپنی بے اختیاری سے کوئی داغ لگانا چاہتا تھا۔ اس لیے کچھ دیر بعد اٹھ جاتا۔ آبگینے سمجھتی تھی کہ شاید میں اسے پسند نہیں کرتا۔

''وہ میری سگی بہن نہ سہی لیکن میں نے تو اسے سگی بہنوں سے بڑھ کر چاہا ہے۔'' وہ آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش میں بار بار پلکیں جھپکتی تو میں اس کے ہاتھ تھپتھپا کر اسے تسلی دیتا۔

''ایسا نہیں ہے آبگینے تم سے وابستہ ہر رشتہ میرے لیے محترم ہے۔''

آبگینے کو کیا خبر کہ میں خدیجہ کو پسند کرنے کی حدیں کب کی عبور کر چکا تھا۔ اور وہ تو میری روح میں بستی تھی لیکن مجھے اپنی محبت خود ہی دفن کرنا پڑی بار بار لیکن کچھ دنوں بعد کسی خون آشام کی طرح وہ زمین سے نکل کر پھر میرے سامنے آ کھڑی ہوتی اسے دیکھنے اور پانے کی طلب بس میں نہیں رہی تھی لیکن کیا کرتا کوئی راستہ کوئی روشنی کی کرن کوئی امید کچھ بھی نہیں تھا کہیں بھی نہیں جی چاہتا اسے لیکر اتنی بڑی دنیا میں کہیں گم ہو جاؤں۔

اگر وہ مجھے مل جاتی تو میرے شب و روز کیسے ہوتے بارہا میں نے سوچا تھا۔ کتنی انوکھی بات۔ شاید میں کسی پروانے کی طرح ہر لمحہ اس کے گرد منڈلاتا رہتا۔ بار بار چھو کر اسے دیکھتا۔ اس

کی ہنسی سنتا باتیں سنتا اور گم ہو جاتا۔ لیکن وہ میرے ہاتھوں کی لکیروں میں کہیں رقم نہ تھی۔

☆☆☆

اس روز میں اپنے اندر کی جنگ سے گھبرا کر لائبریری چلا گیا۔ وہ وہاں تھی اس روز پھر اختیار کی لگامیں ہاتھوں سے چھوٹ گئیں۔ بہت باتیں ہوئیں۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی ہاتھوں کے کٹورے میں چہرہ ٹکائے گاہے گاہے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھ لیتی۔

''میں کیا کروں خدیجہ! میں نے خود کو تم سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی ہے۔ لیکن......''

''جن راستوں پر چل کر منزل نہ ملے ان پر چلنا بے سود ہوتا ہے۔ اتنی سی بات آپ کو سمجھ میں نہیں آتی۔''

وہ ان دنوں کسی کالج میں پڑھا رہی تھی۔ اس کا انداز سمجھانے والا تھا۔ اب وہ بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا کچھ دیر بعد وہ اٹھ گئی اور میں بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ ایک بار پھر میں نے اپنی لگامیں کھینچ لی تھیں لیکن میں راتوں کو اکثر بیتاب ہو کر اٹھ بیٹھتا مجھے سگریٹ پینے سے نفرت تھی لیکن میں ساری ساری رات جاگ کر سگریٹ پیتا رہا۔

آبگینے سوئی رہتی۔ کبھی جاگ بھی جاتی تو میں کام کا بہانہ بنا دیتا وہ مطمئن ہوتی یا نہیں لیکن آنکھیں موند لیتی۔ انہیں دنوں اسے خواب میں ڈر لگنے لگا تھا۔

بہت شروع میں جب وہ خواب دیکھ کر جاگی تھی تو اس نے بتایا کہ میں کھو گیا تھا یا میں نے اسے کسی صحرا میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ یہ اس کا احساس تنہائی تھا جو ان خوابوں میں ڈھل گیا تھا۔ میرا احساس جرم اور بڑھ جاتا۔ مجھے اس پر رحم آتا، ترس آتا، لیکن میں خود کو اس سے محبت کرنے پر مجبور نہ کر سکا تھا اور نہ ہی قدرت ہوتے ہوئے بھی ارادتاً خدیجہ کی طرف قدم اٹھا سکتا تھا۔ ان دنوں میں اور ڈیڈی کسی کام سے کراچی جا رہے تھے۔ میں آبگینے کو ملک ہاؤس چھوڑ آیا تھا کہ وہ اکیلی کیسے رہتی میں نے اسے گیٹ پر ہی اتار دیا تھا۔

''آپ اندر نہیں آئیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں مجھے کام ہے۔'' میں نے اس سے نظریں چرا لی تھیں۔

میں خدیجہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ان دنوں یوں لگنے لگا تھا جیسے میں روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہوں۔ کوئی دن آئے گا جب میں خدیجہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاؤں گا اور درخواست کروں گا کہ مجھے اپنا بنا لو میں تھک گیا ہوں خود سے لڑتے لڑتے۔

آ بگینے کی آنکھوں میں خفگی سی نظر آئی۔ لیکن اس نے خفگی کا اظہار نہیں کیا اور اندر چلی گئی۔ اس میں یہ عادت تھی کہ وہ اپنی خفگی کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ پتا نہیں اگر وہ لڑتی جھگڑتی خفا ہوتی تو میں شاید خود کو سنبھال لیتا یا پتا نہیں زیادہ باغی ہو جاتا۔ پتا نہیں کیا کرتا لیکن آ بگینے نے زبان سے کبھی خفگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

چھ دن بعد ہم کراچی سے واپس آئے تو میں نے سوچا اسے فون کر دوں کہ وہ عمیر یا سمیر کے ساتھ آ جائے۔ لیکن پھر مجھے اس کی خفگی کا خیال آ گیا اور میں بے دلی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں ایک ہی صوفے پر ایک ہی جیسے کپڑے پہنے بیٹھی تھیں۔ بریزے کے چکن کے ٹی پنک سوٹ میں۔ آ بگینے کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں وہ دونوں کھا رہی تھیں کچھ۔ شاید فرنچ فرائز تھے۔ اور وہ ٹی پنک سوٹ جس نے مجھے ایک عرصے تک الجھن میں رکھا تھا وہ الجھن حل ہو گئی تھی۔ اس روز بھی شاید دونوں ایک جیسے سوٹ پہنے ہوئے تھیں۔ گیٹ پر میں نے یقیناً خدیجہ کو ہی دیکھا تھا اور اندر گھر میں آ بگینے کو۔ وہ دونوں ہی مجھے دیکھ کر بوکھلا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔۔ ایک ہی جیسے قد اور قامت۔

"آ بگینے! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"آپ اچانک آ گئے۔ بیٹھیں نا۔ میں چینج کر لوں۔"

"چینج کرنے کی کیا ضرورت ہے، اپنے گھر ہی جانا ہے۔" میں نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔

سادہ سے کپڑوں میں بنا کسی میک اپ کے بھی وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ بہت خوبصورت لیکن میں اس دل کا کیا کرتا جو خدیجہ کی طرف ہمک ہمک کر لپکتا تھا۔

کیا اس مسئلے کا کوئی حل نہیں؟

اس روز گھر آ کر میں دیر تک سوچتا رہا۔ لیکن اس مسئلے کا کوئی حل تھا ہی نہیں۔ میں آ بگینے کو چھوڑ کر بھی خدیجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اسی گھر کی ایک لڑکی کو چھوڑ کر دوسری کے لیے میں کیسے دامن دراز کرتا۔ سو مجھے اسی طرح زندگی گزارنا تھی۔

یونہی اسی نارسائی اور لاحاصلی کے کرب کے ساتھ اور میں نے یہ تین سال بڑی عجیب و غریب زندگی گزاری۔ میں آ بگینے کو بھی خوش دیکھنا چاہتا تھا اور مجھے خدیجہ کی طلب بھی بے چین رکھتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ اگر کبھی میں نے اس سے منہ موڑا تو یہ محبت کے ساتھ بہت بڑی بد دیانتی ہو گی۔ مجھے یہ بھی لگتا تھا کہ کہیں انجانے میں آبگینہ کے ساتھ زیادتی نہ کر جاؤں۔

میں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا تھا۔ میرے حالات خود میری عدالت میں ہر روز سنے جاتے اور ہر روز ہی سزا سنائی جاتی۔ لاحاصلی اور نارسائی کی سزا۔

لیکن یہ سزا میں تنہا تو نہیں بھگت رہا اس میں آ بگینے بھی تو شامل ہے۔ وہ بھی شاید کسی کرب سے گزر رہی ہے، وہ بھی کسی خوف میں مبتلا ہے۔

چھن جانے کا، کھو جانے کا خوف میں نے اس کی آنکھوں میں پیاس دیکھی ہے۔ میرے بے حد خیال رکھنے کے باوجود وہ اکثر خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ جیسے اب خواب دیکھ کر جاگ اٹھی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں خوف دیکھا تھا۔ ان میں بے بسی تھی۔

"کیا عورت محبت اور فرض کے فرق کو محسوس کر لیتی ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا وہ میری طرف سے کروٹ لیے سو رہی ہے۔

مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ مجھے خود پر بھی ترس آتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مجھے اچانک ایک خیال آیا۔" آ بگینے اور خدیجہ۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت بھی تو ہے کیوں نہ میں سب کچھ سچ سچ آ بگینے کو بتا دوں اور اس سے درخواست کروں کہ وہ خدیجہ کو قبول کر لے۔ میری خاطر۔ میں جانتا ہوں آ بگینے مجھ سے محبت کرتی ہے میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت دیکھی ہے بہت بار......اور اس سے نظریں چرائی ہیں...... ہاں تو...... ایسا ہو تو سکتا ہے۔"

میرے دل میں کہیں سے روشنی کی کرن پھوٹنے لگی ہے میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں پھینک دیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

ٹہلتے ٹہلتے کبھی کبھی ایک نگاہ سوئی ہوئی آ بگینے پر ڈالتا ہوں اور پھر ٹہلنے لگتا ہوں سوچنے لگتا ہوں۔

اور وہ ننھی سی کرن میرے تاریک دل کو روشن کرتی جا رہی ہے۔

☆☆☆

وہ ایک صحرا تھا۔ دور تک سوائے ریت کے کچھ نہیں تھا اور میں اس صحرا میں اکیلی کھڑی تھی۔ میرے پاؤں تلے تپتی ہوئی ریت تھی۔ پاؤں جل رہے تھے اور سر پر چمکتا سورج تھا۔ تیز دھوپ میرے چہرے کو جلا رہی تھی......اور میرے حلق میں پیاس سے کانٹے پڑے تھے۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل ریت پر بیٹھ گئی اور ہاتھ دعا کے لیے اٹھا لیے۔ میرے آنسو میری ہتھیلیوں پر گر رہے تھے۔ یکا یک مجھے لگا جیسے میرے سر پر تپش کم ہو گئی ہے

میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ آسمان پر یکا یک بادل چھا گئے تھے، پھر تیز ہوائیں چلنے لگیں میں حیران آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیا میری دعائیں سن لی گئیں؟ بارش کے چند قطرے میرے چہرے پر پڑے اور پھر ایک تواتر سے بارش ہونے لگی۔ میں صحرا میں بارش سے بھیگ رہی تھی لیکن یکا یک میرے دل میں خوف پیدا ہو گیا میں وہاں اکیلی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آبگینے۔" میں نے مڑ کر دیکھا۔

"معاذ۔" میرا دل خوشی سے بھر گیا۔

"آؤ آبگینے!" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"آبگینے، آبگینے! اٹھو۔ بڑے بھائی کا فون ہے۔"

معاذ نے اچانک میرا کندھا ہلایا تو میں ہڑبڑا کر جاگ گئی تھی۔ میں تین دن سے پیکنگ کر رہی تھی۔

ایک پورے گھر کو سمیٹنا تھا اور ضرورت کی چیزیں لیکر جانا تھیں آج میرا کام ختم ہوا تھا اور میں تھک کر لیٹی تھی کہ میری آنکھ لگ گئی۔

اور میں نے یہ خواب دیکھا۔ یہ خواب ان سارے خوابوں سے مختلف تھا جو پچھلے تین سالوں سے میں دیکھ رہی تھی۔ معاذ ہاتھ میں کارڈلیس لیے کھڑا تھا۔

"لو بات کر لو۔ میں ڈرائینگ روم میں ہوں، کوئی دوست آیا ہوا ہے۔"

میں نے فون لے لیا۔ بڑے بھائی میری فلائٹ کا پوچھ رہے تھے۔

"کل رات آٹھ بجے کی فلائٹ ہے۔"

"تم میری شادی تک رک جاتیں، آبگینے! اکلوتی بہن اور وہ بھی شادی میں شریک نہ ہو۔"

"میں شادی سے دو تین دن پہلے آ جاؤں گی۔ دبئی کون سا دور ہے۔"

حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کم از کم میں تین چار سال تک واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔

بڑے بھائی سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں نے فون رکھ دیا۔ عالین پچھلے سال پاکستان آئی تو اس نے ڈیڈی سے کہا تھا کہ وہ لوگ بھی وہیں سیٹل ہو جائیں۔ اس نے معاذ کو بہت مجبور کیا تھا۔

"رضا اب اپنا بزنس کرنا چاہتے ہیں الگ۔ تم اپنا کام آکر خود سنبھالو۔"

معاذ جانا نہیں چاہتا تھا، اور جانا تو میں بھی نہیں چاہتی تھی۔ مجھے ان لوگوں پر حیرت ہوتی تھی جو ملک سے باہر جا کر دوسرے ممالک میں پناہ لیتے ہیں۔ مجھے تو اپنے وطن میں ہی رہنا پسند تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں غیر ملک میں جی نہیں سکتی۔ میرے وطن کی ہواؤں کی خوشبو میرے وطن کی مٹی کی باس غیر ملک میں کہاں۔

"اسی میں تمہاری بہتری ہے آبگینے! اور سچ پوچھو تو یہ میں صرف تمہاری خاطر ہی کہہ رہی ہوں۔"

تب عالیں کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن آج میں اس کی بات کا مطلب سمجھ سکتی ہوں۔ شاید عالین جانتی تھی۔ معاذ نے اسے کچھ نہیں بھی بتایا تھا تب بھی وہ جان گئی تھیں۔ وہ سب جو میں تین سالوں میں نہیں جان سکی تھی اور میں شاید اب بھی نہ جانتی اگر خدیجہ...... میری جان سے پیاری خدیجہ مجھے نہ بتاتی۔

میری طبیعت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے ریسٹ کے لیے کہا تھا۔ امی مجھے آکر گھر لے گئی تھیں۔ معاذ کی اپنی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ وہ چند دنوں سے بہت کھویا کھویا اور ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ کئی دفعہ تو مجھے لگا جیسے وہ ابھی ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

وہ ساری ساری رات جاگ کر سگریٹ پیتا تھا اور پتا نہیں کیا سوچتا رہتا تھا۔ میں اس حالت میں اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی لیکن میری اپنی حالت بہت خراب تھی۔ "میں ٹھیک ہوں آبگینے! یوں ہی کچھ بزنس کی ٹینشن ہے تم چلی جاؤ۔ پلیز میں فون کرتا رہوں گا۔"

ڈیڈی نے بھی مجبور کیا۔ وہ بہت خوش تھے تین سال بعد جو خوشخبری ملی تھی اس نے انہیں بیحد خوش کر دیا تھا۔

"تم جاؤ بیٹا! اس نکمے کا خیال میں خود رکھ لوں گا۔"

جب ذرا میری طبیعت سنبھلی تو مجھے خدیجہ کا خیال آیا۔ "امی! یہ خدیجہ کہاں ہے۔ کیوں چھپتی پھر رہی ہے مجھ سے اور آپ نے بڑے بھائی کے لیے مینا پھپھو سے بات کی۔"

"ہاں کی تھی۔" امی نے مجھے بتایا۔ "وہ کہہ رہی تھیں خدیجہ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ میں چاہ رہی ہوں یمیر سے پہلے عمیر کی شادی ہو۔"

"اچھا ذرا بھیجیں اسے۔"

وہ آئی تو میں نے دیکھا، وہ کچھ اپ سیٹ لگ رہی تھی۔

"اچھی بہن ہو۔ میں گھر آئی ہوں اور میری خبر گیری کرنے کے بجائے ادھر ادھر چھپتی

پھر رہی ہو کیا ابھی سے بھابی بن گئی ہو۔" میں ہنسی۔

"نہیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور یہ تم سے کس نے کہا میں بھابی بن گئی ہوں۔ بھئی میں ہمیشہ تمہاری بہن رہوں گی۔ مجھے کوئی نیا رشتہ نہیں بنانا۔

مجھے لگا وہ زبردستی مسکرائی ہو۔

"کیا مطلب......" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا تم......کیا تم بڑے بھائی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتیں؟"

"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں، کیا کمی ہے بڑے بھائی میں؟" میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھیں۔

"کوئی کمی نہیں آ بگینے! وہ بہترین انسان ہیں۔ کوئی بھی لڑکی ان کی ہمراہی میں بہت خوش رہ سکتی ہے۔"

"اور وہ لڑکی تم کیوں نہیں ہو سکتی خدیجہ؟"

"وہ لڑکی میں بھی ہو سکتی تھی آ بگینے!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"لیکن اسی میں بہتری ہے آ بگینے! ہم سب کی۔ میں نے لاہور ٹرانسفر کے لیے درخواست دے دی ہے۔ اور......"

"تم جانتی ہو خدیجہ! بڑے بھائی تمہیں پسند کرتے ہیں، پسند ہی نہیں کرتے بلکہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی ان کی محبت محسوس نہیں کی؟" میرے لہجے میں شکوہ تھا۔

"محبت ایسی شے نہیں ہے جو محسوس نہ کی جا سکے۔ وہ تو اپنا پتا آپ دیتی ہے اس کی مہک چھپائے نہیں چھپتی اور اسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"پھر تم ایسا کیوں کر رہی ہو خدیجہ! یہ ہم سب کی خواہش ہے۔ پتا ہے چھوٹے بھائی نے فائزہ کا نام صرف اس لیے لیا کہ وہ جانتے تھے کہ بڑے بھائی تمہیں چاہتے ہیں ورنہ انہیں فائزہ سے کوئی خاص۔"

"مجھے پتا ہے۔" خدیجہ نے میری بات کاٹ دی۔

"سمیر بھائی بہت گہرے ہیں"۔ "سب جاننے کے باوجود تم ایسا کر رہی ہو خدیجہ! کیا جان سکتی ہو کہ محبت نہ ملے تو زندگی کیسی بنجر اور خالی ہو جاتی ہے" میری اپنی نارسائی کا کرب میرے لہجے میں در آیا" بڑے بھائی تمہارے بغیر.....ایسا مت کرو خدیجہ!"

"تم نہیں سمجھ سکتیں آ بگینے! یہ سب خوشی کر رہی ہوں صرف تمہارے لیے، تمہاری

خاطر، تاکہ تمہاری زندگی میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جس چیز کی کمی ہے وہ تمہیں مل جائے۔"

"کیا مطلب؟ صاف صاف بتاؤ خدیجہ! میں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"کیا بتانا بہت ضروری ہے آ بگینے!" اس کے لہجے میں درد تھا اور آنسو۔

"ہاں تمہیں بتانا ہی ہو گا خدیجہ!"

اور تب خدیجہ نے جو کچھ مجھے بتایا اس نے مجھے زیادہ حیران نہیں کیا۔ میں جانتی تھی کہ کہیں کچھ غلط ہوا ہے۔ میں وہ لڑکی نہیں جسے معاذ نے چاہا تھا لیکن وہ لڑکی خدیجہ ہو گی اس طرف میرا خیال کبھی نہیں گیا تھا۔ بعض اوقات زیادہ قریب کی چیزیں دھندلی ہو جاتی ہیں۔

وہ سانس لینے کو رکی تھی۔

"چند دن قبل معاذ نے مجھے فون کیا کہ وہ مجھے پرپوز کرنا چاہتا ہے، اگر میں اس کا ساتھ دوں تو وہ تم سے بات کرے گا اسے بڑا یقین تھا کہ تم اسے منع نہیں کرو گی۔" میں سانس روکے اس کی بات سن رہی تھی۔

کم از کم معاذ کا مجھ پر یقین سچا تھا۔ جو کچھ خدیجہ نے مجھے بتایا تھا اس میں معاذ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور تو میرا بھی نہیں تھا۔ یہ سب تو تقدیر میں لکھا تھا۔

"میں نے اس سے کہا خدا نے آپ کے لیے جسے منتخب کیا ہے وہ بہترین لڑکی ہے اسے اللہ کا انعام سمجھیں کیونکہ یہ آپ نے نہیں اللہ نے چاہا تھا۔ میں نے اسے انکار تو کر دیا تھا آ بگینے! لیکن میں نے سوچا اگر عمیر سے میری شادی ہو جاتی تو...... آ بگینے! عمیر تمہارے بھائی ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں اس گھر میں نہ آؤ۔ وہ یہاں آئے گا مجھے دیکھے گا اور اسے اپنی نارسائی تڑپاتی رہے گی۔ وہ تقدیر کے اس مذاق کو بھول نہیں سکے گا آ بگینے! وہ تمہاری طرف پلٹ نہیں سکے گا۔ میں سامنے نہیں ہوں گی تو تمہاری طرف پلٹنے میں اسے دقت نہیں ہو گی۔ اس لیے میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے وقاص نے ایک بار مجھے پرپوز کیا تھا اور کہا تھا شاید اس طرح وہ مجھے میرا حق دلوا سکے، میں نے سوچا ہے کہ......" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

کیا کوئی اتنا مخلص ہو سکتا ہے کہ اپنی خواہشات پس پشت رکھ کر دوسروں کے راستے میں دیا جلائے۔ اپنے گھر میں اندھیرا کر کے دوسروں کا گھر روشن کرے اور خدیجہ ایسی ہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بڑے بھائی کے لیے پسندیدگی دیکھی تھی۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔ وہ ان سے بات کرتے ہوئے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتی تھی۔

"خدیجہ......" میں نے اسے بے اختیار گلے لگا لیا۔

میری آواز بھرا گئی تھی۔ وہ واقعی ایسی تھی کہ اسے چاہا جاتا۔ اگر معاذ نے اسے چاہا تھا تو کچھ غلط نہ تھا۔ اگر بڑے بھائی اس سے محبت کرتے تھے وہ اس محبت کو ڈیزرو کرتی تھی۔ وہ بہت منفرد، بہت مختلف تھی۔ میں اس جیسی کبھی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن میں اتنی ظالم بھی نہیں تھی کہ اس کے من میں اندھیرا کر کے اپنے گھر میں چراغ جلاتی اور پھر شاید اس میں میری غرض بھی تھی۔

وہ اس گھر کے لیے لازم تھی اس کے بغیر اس گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ ابا آتے ہی اسے آواز دیتے تھے۔ بڑے بھائی ہر کام کے لیے اسے پکارتے تھے۔ امی نے تو میرے بیاہ کے بعد ہی سارا انتظام اس کے حوالے کر دیا تھا۔ فائزہ ایسی نہیں تھی وہ تو سمیر بھائی کو کپڑے تک استری کر کے نہیں دے سکتی تھی۔ چھوٹے بھائی کے سارے کام بھی خدیجہ ہی کرتی تھی۔ فائزہ میری شادی میں کئی دن پہلے سے ہمارے گھر آ کر رہی تھی۔

پھر بڑے بھائی وہ اتنے چاہنے والے محبت کرنے والے شفیق بھائی جنہیں خدیجہ کے علاوہ کسی کے ہاتھ کی بنی چائے پسند نہیں، جو نہ جانے کب سے اسے اپنے دل میں بسائے بیٹھے ہیں۔ کیا میں ان کا دل ویران کر دوں۔

میری آنکھوں کے سامنے معاذ آ گیا۔ زبردستی ہنستا ہوا، مشین کی طرح سارے حقوق و فرائض پورے کرتا ہوا۔ کیا بڑے بھائی بھی معاذ کی طرح جھوٹی زندگی جئیں گے؟ نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے خدیجہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے اس کو شرارت سے دیکھا تھا۔

''ایسی بھائی اس دنیا میں شاید ہی کسی کی ہو جیسی میری بھائی ہے۔'' اور پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ''تمہیں ٹرانسفر کے لیے درخواست دینے کی ضرورت نہیں خدیجہ!...... ہم لوگ ہمیشہ کے لیے دبئی سیٹل ہو رہے ہیں۔ بہت عرصے سے عالین کہہ رہی تھی۔ تمہیں پتا تو ہے کہ معاذ کا وہاں بھی بزنس ہے جس کی دیکھ بھال رضا بھائی کرتے ہیں۔ اور سنو، میں امی سے اور مینا پھپھو سے کہنے لگی ہوں کہ خدیجہ کو کوئی اعتراض نہیں۔''

اس نے سر جھکا لیا تھا لیکن اس کے لبوں پر ایک شرمگیں سی مسکراہٹ تھی۔ میں بہت عقلمند نہیں ہوں۔ خدیجہ جیسی لیکن میں نے صحیح فیصلہ کر کے دو دلوں کو ویران ہونے سے بچا لیا تھا۔

کچھ دیر بعد میں عالین کو فون کر رہی تھی۔

''عالین! آپ نے ایک بار کہا تھا کہ میرے لیے اسی میں بہتری ہے کہ ہم پاکستان سے دبئی شفٹ ہو جائیں۔ میں آپ کی بات کے معنی اب سمجھی ہوں اور میں نے دبئی شفٹ ہونے

کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اپنے لیے اور اپنے ہونے والے بچے کے لیے اور ہاں خدیجہ کی شادی بڑے بھائی سے ہو رہی ہے۔''

عالین نے میرے فیصلے کو سراہا اور پھر سب کچھ عالین نے کیا۔ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی میں نے کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا اور ڈیڈی نے دبئی جانے کا فیصلہ سنا دیا۔

''میرا بھائی اور عالین اور دوسرے عزیز سب یو اے ای میں ہیں۔ ہم اکیلے یہاں رہ کر کیا کر رہے ہیں؟''

معاذ نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

وہ ان دنوں میرا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگا ہے اس نے ہر چیز کی میرے ساتھ مل کر پیکنگ کی ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ بہت اداس ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کی اداسی چھپا نہیں پاتا مجھ سے۔ نارسائی لاحاصلی کا دکھ اس کے چہرے پر رقم ہے۔ لیکن ایک دن آئے گا ایسا جب یہ نارسائی باقی نہیں رہے گی۔ میں اپنی محبت سے، خدمت سے اس کے دل میں چھپے سارے کانٹے چن لوں گی۔ تب اس کی آنکھوں میں میرے لیے محبت ہو گی۔ ترس اور رحم نہیں۔ مجھے خدیجہ کی اس بات پورا یقین ہے کہ مجھے اس کے لیے اور اسے میرے لیے اللہ نے منتخب کیا ہے اور ایک روز وہ اپنے دل و جان کی پوری رضامندی کے ساتھ تقدیر کے اس فیصلے کو قبول کرے گا اور وہ دن جلد آئے گا۔ ان شاء اللہ

☆☆☆

آج میں نے پورے چھ سال بعد پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ میرے ساتھ میری بیوی آبگینے اور ہمارے تین بچے ہیں۔ دو جڑواں بیٹے اور ایک چھوٹی سی آٹھ ماہ کی بیٹی۔ ان چھ سالوں میں ہم ایک بار بھی پاکستان نہیں آئے۔ حالانکہ اس دوران عمیر بھائی اور سمیر بھائی کی شادیاں بھی ہوئیں لیکن آبگینے نے دونوں بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا۔ لڑکیاں تو میکے جانے کے بہانے ڈھونڈتی ہی پھر آبگینے...... کئی بار مجھے گمان گزرا کہ وہ سب کچھ جان گئی ہے۔ وہ سب جو میں نے چھپا رکھا تھا لیکن اس نے کبھی جتایا نہیں۔ کبھی گلہ نہیں کیا۔ لیکن اس نے غیر محسوس طور پر نہ تو مجھے پاکستان جانے دیا، نہ خود آئی۔ آج سے چھ سال پہلے جب عالین نے ڈیڈی سے بات کی تھی کہ ہم دبئی آ جائیں اور آبگینے نے کہا تھا کہ

''ٹھیک ہے ہم وہاں ضرور شفٹ ہوں گے۔''

تو میں نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا اس لیے کہ خدیجہ نے میری درخواست سن کر کہا تھا۔

"معاذ! میں نے ہر بار آپ کی بات بہت تحمل سے اس لیے سنی کہ میں انسانی کمزوریوں پر یقین رکھتی ہوں انسان سے زیادہ کمزور کوئی اور مخلوق نہیں۔ لیکن آپ نے شاید مجھے غلط سمجھا۔ میں نے آپ کے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ اللہ نے آبگینے کو آپ کے لیے منتخب کیا ہے۔ آپ نے جو چاہا تھا وہ نہیں ہوا۔ تو اللہ کے انتخاب کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرلیں۔"

میری نارسائی طے شدہ تھی پھر پتا نہیں کیوں میں اس کے سامنے جھولی دراز کر بیٹھا تھا، شاید کچھ اور کرب سہنے کو۔ اپنے جذبوں کی بے وقعتی اور ان کے رائیگاں چلے جانے کا احساس میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔ ایسے میں مجھے غنیمت لگا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ وہ نظروں کے سامنے ہوگی تو نارسائی کا کرب بڑھ جائے گا دور رہ کر شاید میں اسے بھول جاؤں۔

اور آج چھ سال بعد میں سوچتا ہوں کہ وہ ایک بروقت فیصلہ تھا ورنہ شاید میرے ساتھ آبگینے بھی نارسائی رہتی۔ میں نے وہاں آبگینے کو ہنستے دیکھا۔ سچی ہنسی۔ وہ ہنسی جو ان تین سالوں میں کبھی اس کے ہونٹوں پر نظر نہ آئی تھی وہ اور عالین نہ جانے کیا کیا باتیں کر کے خوب ہنستیں اور پھر وہاں کسی پروانے کی طرح ہی میرے گرد چکراتی رہتی۔ وہ منتظر رہتی کہ میں اس سے کچھ کہوں۔ وہ چپکے چپکے عالین سے میری پسند و ناپسند پوچھتی رہتی۔ وہ ہولے ہولے میری پسند میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ وہ اکثر چھاپ تلک سب چھین لی موسے نینا ملائی کے، گنگناتی رہتی تھی۔ اس نے میرا ہر کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ مجھے لگتا جیسے وہ مجھ سے محبت کر رہی ہے، کرتی جا رہی ہے اور بدلے میں مجھ سے کچھ نہیں چاہ رہی۔ اس کی اتنی جان لیوا محبت مجھے میرے محور سے ہٹا رہی تھی۔ مجھے لگتا جیسے میں عجیب و غریب موسم سے باہر نکل رہا ہوں، مجھے ہر لمحہ ہر قدم پر مختلف سوچوں اور اپنے جذبات سے جنگ کرنا پڑ رہی تھی۔ میں خدیجہ کو اپنی اولین محبت کو یکسر ذہن سے نکال کر آبگینے کی طرف متوجہ ہونا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اتنا آسان بھی تو نہیں تھا۔ وہ میرے سامنے نہیں تھی پھر بھی ایک روز مجھے لگتا میں اسے دل میں سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا ہوں، اس روز میں آبگینے کو بہت سا وقت دیتا۔ اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا لیکن دوسرے روز میں دیکھتا کہ وہ تو اسی طرح دل میں براجمان مسکرائے جا رہی ہے اور میرے حزن میں اضافہ ہو جاتا۔

وقت گزرتا رہا۔ آبگینے نے مجھے دو پیارے پیارے بیٹوں کا تحفہ دیا۔ میں اکثر ان میں کھو جاتا۔ لیکن پھر کہیں اپنا آنچل لہراتی وہ آ جاتی۔ آنچل ہوا کے دوش پر لہراتا، خوشبو بکھیرتا۔ انگلیاں بالوں میں رینگنے لگتیں اور پھر کہیں سے آبگینے آکر اس تصور کو بکھیر دیتی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ وہ جیسے روز بروز خوب صورت ہوتی جا رہی تھی۔ لوگ رشک سے ہم دونوں کو

دیکھتے۔ آئیڈیل کپل خوبصورت کپل جیسے القاب ملتے رہتے۔ میں نے اس کی رفاقت میں خود کو صرف مطمئن کرنا چاہا تھا اور یہ چاہا تھا کہ آبگینے کے ہونٹوں کی ہنسی میں بناوٹ نہ ہو۔ وہ سچے دل سے ہنسے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ کب میرے جذبوں میں اس کے لیے حدت پیدا ہوگئی۔ کب میری نظریں اس کے لیے محبتیں لٹانے لگیں اور کب اس نے آپ سے تم تک کا سفر طے کیا اس کا احساس تو آٹھ ماہ پہلے اس روز مجھے ہوا جب میری ننھی گڑیا نے دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ ڈاکٹرز نے مجھے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک کی جان بچا سکیں گے یا شاید دونوں کو ہی نہ بچا سکیں۔ اور مجھے لگا تھا جیسے کسی نے میرا دل سینے کی چار دیواری سے نوچ کر باہر پھینک دیا ہو۔ میں نے تڑپ تڑپ کر، رو رو کر خدا سے اس کی زندگی کی دعا کی۔ پوری رات میں جائے نماز پر بیٹھا رہا اور جب صبح کی اذان کے وقت ڈاکٹرز نے مجھے دونوں کی زندگی کی نوید دی تو میں دیوانہ وار اس کی طرف بھاگا۔ اسے کمرے میں شفٹ کیا جا رہا تھا۔

"آئی لو یو...... آئی لو یو آبگینے!" یہ تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی تھیں۔ آبگینے! آئی لو یو سو مچ رئیلی

آبگینے! تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں بھی مر جاتا۔"

اس وقت اسے کمرے میں پہنچایا جا چکا تھا۔ نرس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور باہر چلی گئی۔ آبگینے کی آنکھوں میں مان تھا، چمک تھی اور ایسی روشنی جس میں فخر تھا۔ جیت کا فخر۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے گالوں پر پھسلتے آنسو پونچھے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب آنسو میرے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

"میں بھی"۔ اس کی پلکوں کی تتلیاں اس کے رخساروں پر لرزنے لگی تھیں اور میں دیوانہ وار اسے دیکھے جا رہا تھا۔ کوئی پیاس بجھ جانے کی سی تسکین میرے اندر اتر گئی تھی اور اب جب ہماری بیٹی آٹھ ماہ کی ہوگئی ہے تو ہم نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ آبگینے کی آنکھوں میں خوشیوں کے سارے رنگ ہیں اور میرا دامن بھی خالی نہیں۔

اس میں آبگینے کی محبت ہے۔

میرے بچوں کی چاہتیں ہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں پاکستان میں آتے ہی میرا دل ایک بار زور سے دھڑکا ہے۔ دل کے کسی کونے میں کسی سوئے ہوئے درد نے چٹکی لی ہے۔ کہیں اندر دل کی گہرائیوں میں نارسائی اور لاحاصلی کے کچھ آنسو ٹپکائے ہیں۔ نارسائی بھی میرے ہاتھوں

کی لکیروں میں رقم تھی اور رسائی بھی میرا مقدر بنی۔

میں نے محبت کھوئی بھی۔

میں نے محبت پائی بھی۔

میں اپنی زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔

خوش ہوں۔

مجھے آبگینے سے محبت ہے۔

بہت شدید محبت۔

لیکن دل کے ایک کونے میں کسک سی شاید ہمیشہ رہے گی۔ یہ کرب نارسائی یوں ہی محبت کی نظر بچا کر دل میں کبھی کبھی چٹکی لیتا رہے گا۔ شاید کرب نارسائی کوئی مجسم چیز نہیں ہے یہ تو محض ایک احساس ہے، ایک بے اختیاری ہے، اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا نہیں جا سکتا اور اگر میں کہتا ہوں کہ مجھے آبگینے سے محبت ہے تو کیا یہ سچ نہیں ہے؟